رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۴

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۴ء

تصویر:- تقدیر کا چکر

چندہ سالانہ پانچ روپے ۸ آنے - ششماہی تین روپے ۸ آنے مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

"بزمِ ہمایوں"

ہمیں مسرت ہے کہ بہ "بزمِ ہمایوں" کے احیاء سے ناظرینِ "ہمایوں" میں اپنے رسالے کی اصلاح و ترقی کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ ہر تجویز جو پیش کی جاتی ہے ہم سراپا سپاس ہو کر اسے سنتے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ "ہمایوں" کو روز بروز زیادہ مفید زیادہ دلچسپ اور زیادہ دیدہ افروز بناتے چلے جائیں۔ مضامین کے تنوع کے متعلق جو تجاویز پیش کی جاتی ہیں ان پر "ہمایوں" پہلے سے زیادہ عمل کرنے کو تیار ہے لیکن اس کے لئے اہلِ قلم کی اعانت بھی درکار ہے۔ اس کے علاوہ اگر "ہمایوں" کا ہر خریدار کم از کم ایک خریدار اور پیدا کر دے تو ہم "ہمایوں" پر نئے اور مفید مصارف کا بار ڈالنے کے قابل بھی ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ نہ بھی ہو تو ہم اس رسالے کی ترقی کے لئے جو پنجاب میں اُردو کی ناچیز خدمات انجام دے رہا ہے اپنی سعی کرتے ہی رہیں گے۔

"ہمایوں" کے مضامین کا معیار اور تنوع ماہ بماہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس مہینے سے اس کی کتابت اور کاغذ پر مزید مصارف برداشت کر کے معنوی محاسن کے ساتھ ظاہری محاسن میں بھی اور اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ناظرینِ "ہمایوں" توسیعِ اشاعت کے ذریعے سے ہماری کوششوں کے اعتراف کا ثبوت بہم پہنچائیں گے۔

مسٹر ہارون خاں شروانی ایم اے (آکسن) پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے "ہمایوں" کی ترقی کے متعلق بعض مفید تجاویز پیش کی ہیں ہم انہیں شکریے کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"ابھی اس وقت پیارا "ہمایوں" آیا۔ فوراً ورق گردانی کی اور خصوصیت کے ساتھ بزمِ ہمایوں کو پڑھا جس میں ناظرین سے تعاون چاہا گیا ہے۔ آپ کو خود معلوم ہے کہ میں "ہمایوں" کا خریدار نہیں تو کم سے کم اس کے مستقل پڑھنے والوں میں سے تو ہوں اور فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ جس قدر مکمل جلدیں اس رسالے کی میرے پاس ہیں اس سے زیادہ کسی کے پاس نہیں ہو سکتیں۔ مجھے اس کی تجلید میں جو دقت پیش آتی ہے وہ فہرستِ مضامین کی ہے۔ اگر فہرست کا ورق جداگانہ ہو یعنی اس کی دوسری جانب معرّا ہو تو تجلید کے وقت تمام فہرستیں یکجا کر کے ابتدا میں لگائی جا سکتی ہیں لیکن موجودہ صورت میں یہ ممکن نہیں اور کسی مضمون کو دوبارہ دیکھنے کے لئے ۵۰۰، ۱۰۰۰ صفحے اُلٹنے پڑتے ہیں۔ اگر اس کا انتظام ہو جائے تو ہمایوں کے افادی پہلو میں چار چاند لگ جائیں۔ دوسرے مناسب ہے کہ معارف کی طرح ایک فہرستِ مضامین اور ایک فہرستِ مضامین ادبی سال بسال بقیدِ صفحات نکالا کرے اور سالنامے کے ساتھ

تقسیم کردی جایا کرے تیسرے باوجود دل افروزی "ہمایوں" اکثر حالیات یعنی زمانۂ حال کے کیفیات سے خالی سے معرا ہوتا ہے۔ ادبی اعتبار سے تو یہ یکتا ہے لیکن ضرورت اب اس کی ہے کہ اس کے ایک جزو کو اس نوع کا کر دیا جائے یا جیسا فرانس کا ریویو دو دوند ہے اور اس میں بلند پایہ نقادانہ تحریریں مختلف موضوعات پر درج کی جائیں۔ میں جناب رفیقی ساکن جزائر شرق الہند و لندیزی کی رائے سے ایک حد تک متفق ہوں کہ سیاسیات کو شجرِ ممنوعہ نہ سمجھنا چاہئے لیکن ساتھ ہی "ہمایوں" کو فرقی سیاسیات (Party Politics) سے بے تعلق رہنا چاہئے۔ ورنہ خدانخواستہ اس میں سوقیانہ پن آ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے برعکس اگر سیاست دانوں اور سیاسیوں کے ناقدانہ جذبات کی ترجمانی ہو جیسے "نائنٹینتھ سینچری" میں ہوتی ہے تو یقیناً اس کے افادی پہلو میں اضافہ ہو جائے گا۔" ہارون

ذیل میں ہم "ہمایوں" کے ایک اور کرمفرما حضرت ضیاء مصطفےٰ آبادی کا خط شائع کرتے ہیں۔ ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں اور ان کی تجاویز پر حتے الامکان عمل کرتے ہیں لیکن پورا عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ "ہمایوں" کی اشاعت میں معتدبہ اضافہ ہو جائے۔

"اگر "ہمایوں" کے لئے ہر ماہ ہندوستان کے کسی ایک ادیب شاعر یا رہنما کے خیالات ایک موضوع پر حاصل کرنے کا انتظام ہو جائے تو یہ بہت جاذبِ توجہ ہوگا۔ مثلاً ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو کے خیالات محبت، شاعری اور اسی قسم کے دیگر حسین عنوانات کے متعلق چونکہ ہمایوں کا معیار کافی بلند ہے اور وہ ادب کی خدمت کر رہا ہے نہ کہ بازاری لٹریچر مہیا کرتا ہے اس لئے یہ حضرات جہاں تک میرا خیال ہے بڑی خوشی سے اس التجا کو قبول کر لیں گے۔ اس طرح یہ سلسلۂ رنگیں کئی سال تک باعثِ دلچسپی بنا رہے گا اور ان حضرات کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔ "ہمایوں" کی نظمیں اور بعض مضامین پڑھتے وقت اس قدر متاثر ہو جاتا ہوں کہ شاید اتنا ان کے لکھنے والے بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ آپ نے خود ہی اسے ترقی دینے کے نہ معلوم کتنے منصوبے باندھ رکھے ہیں۔ اس حالت میں ناظرین کی رائے معلوم کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی گنجائش ہی نہیں رہی۔"

"افسانہ نمبر" کے لئے افسانے اس کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر فیصلہ کرنا ایک طویل کام ہے۔ اس لئے ہمارا خیال تھا کہ ستمبر میں "افسانہ نمبر" شائع ہو تا کہ غور کے بعد انعام کا اعلان بھی اسی پرچے میں ہو جائے۔ لیکن چونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے اس لئے ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ آئندہ پرچہ ہی "افسانہ نمبر" ہو۔

جہاں نُما

کیڑے مکوڑے

(از برٹرینڈ رسل)

حشرات الارض کو تعداد کے لحاظ سے انسان پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک اور فوقیت اُنہیں یہ حاصل ہے کہ وہ ہماری خوراک اس سے قبل کہ وہ پک کر ہمارے کھانے کے قابل ہو ہڑپ کر سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جانبین کے سائنسدانوں نے اگر حشرات الارض اور جراثیم سے مدد لی تو بہت ممکن ہے کہ آخر کار واحد فاتح کیڑے مکوڑے اور جراثیم ہی رہ جائیں۔ برٹرینڈ رسل نے "ماڈرن تھنکر" میں حشرات الارض کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے:۔

"جنگ اور جنگ کی افواہوں کے اس دور میں جب تحدید اسلحہ کی انجمنوں کی تند تقریریں نوع انسان کو بیش از بیش تباہیوں کی دھمکیاں دے رہی ہیں ہم ایک اور جنگ کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ میری مراد انسان اور حشرات الارض کی جنگ سے ہے۔

ہم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے کے خوگر ہیں۔ ہم اپنے وحشی آبا و اجداد کی طرح اب جنگلی سؤر، ارنے بھینسے، چیتے یا شیر سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ اپنے ہم جنسوں کے سوا ہم اور ہر طرف سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اگرچہ اب بڑے حیوانوں سے ہمیں خطرہ نہیں رہا تو چھوٹے حیوان ہمارے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن رہے ہیں۔

اس سے قبل بھی اسی زمین پر ایک دفعہ بڑے حیوانوں نے چھوٹے حیوانوں کے لئے جگہ خالی کی تھی۔ ہزارہا سال تک ڈونسر (ایک فیل پیکر حیوان جو اب مفقود ہے) اپنے ہم جنسوں کے سوا ہر خطرے سے آزاد نہایت اطمینان سے دلدل اور جنگل میں راج کرتا رہا لیکن آخر یہ حیوان فنا ہو گیا اور اس کی جگہ چھوٹی چوہیوں جنگلی چوہوں اور بلیاں گھوڑوں وغیرہ نے لے لی جو قد میں چوہے سے کچھ ہی بڑے تھے۔ جب ان جانوروں کو غلبہ حاصل ہوا تو اُنہوں نے تن و توش میں بھی بڑھنا شروع کیا۔ ان حیوانوں میں سب سے بڑا ایمیٹ (اب مفقود ہو چکا ہے) اور باقی میں سے بھی صرف انسان اور اس کے پالتو جانور رہ گئے ہیں۔ انسان نے اپنی عقل سے باوجود بڑے قد و قامت کے اپنی ایک کثیر تعداد کے لئے خوراک بہم پہنچانے کا انتظام کر لیا ہے۔ انسان کیڑوں مکوڑوں اور جرثوموں کے علاوہ اور ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہے۔

تعداد کے لحاظ سے حشرات الارض کو ایک نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ ایک چھوٹے سے جنگل ہی میں اتنی چیونٹیاں موجود ہو سکتی ہیں جتنی دُنیا میں انسانوں کی کل آبادی ہے۔ کیڑوں مکوڑوں کو ایک اور فوقیت یہ حاصل ہے کہ وہ ہماری خوراک اس سے قبل کہ وہ پک کر ہمارے کھانے کے قابل ہو کھا لیتے ہیں۔ کئی موذی کیڑے جو پہلے بعض چھوٹے چھوٹے رقبوں تک محدود تھے انسان نے غیر ارادی طور پر دوسرے علاقوں میں پہنچا دیئے ہیں جہاں اُنہوں نے شدید تباہ کاری کا آغاز کر دیا ہے۔

خوش قسمتی سے سائنس نے اب ایسے طریقے دریافت کر لئے ہیں جن سے کیڑوں کی تباہ کاری کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض ایسے کرم دریافت ہو چکے ہیں جو دوسرے کیڑوں کا خون چُوس کر پلتے ہیں اور اُن کی تعداد کو اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ پھر اُن سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ علم الحشرات کے ماہر اس قسم کے کرموں کی نگہداشت اور پرورش کی کوشش میں مصروف ہیں۔

بدقسمتی سے جب تک نوع انسان میں باہمی جنگ کا سلسلہ جاری ہے ہر علمی انکشاف دو رُخی حیثیت رکھتا ہے۔ آئندہ جنگِ عظیم میں فریقین کے سائنسدان ایک دوسرے کی فصلوں پر تباہ کار کیڑے چھوڑیں گے اور بہت ممکن ہے کہ صلح ہونے تک ان کیڑوں کی تعداد اتنی بڑھ جائے کہ پھر ان کا تباہ کرنا ناممکن ہو جائے۔ ہمارا علم ہمیں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے قابل بنا رہا ہے۔ اگر انسان نے باہمی غیظ و غضب کے اظہار کے لئے کیڑوں مکوڑوں سے مدد لینی شروع کی جیسا کہ آئندہ جنگِ عظیم میں ضرور ہو گا تو گمانِ غالب ہے کہ آخری اور قطعی فتح صرف کیڑوں مکوڑوں کو حاصل ہو گی۔ وسیع کائناتی نقطۂ نظر سے تو شاید یہ معمولی بات ہو لیکن بحیثیت انسان کے میں اپنی جنس کی تباہی پر آہ بھرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مغربی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان

ایک معزز معاصر نے ذیل کے مقالے میں ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ متعلقہ ادارے اس کی آواز پر ضرور متوجہ ہوں گے:۔

"آکسفورڈ، لنڈن اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں اُردو زبان کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے اور بڑے بڑے فاضل پروفیسر مقرر ہیں۔ برلن یونیورسٹی میں بھی اردو زبان نصاب میں داخل ہے لیکن وہاں اردو فارسی کی تعلیم کے لئے ایک ہی پروفیسر مقرر ہے۔ پہلے ایک پارسی پروفیسر مسٹر واچا یا کام کرتے تھے لیکن اب اُن کی جگہ پنڈت تارا چند رائے اُردو فارسی کے پروفیسر مقرر کئے گئے ہیں۔ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والے حضرات کے لئے یہ بات قابلِ غور ہے۔ ہمارے 'ہمیں افسوس سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہاں اب تک "باغ و بہار" پڑھائی جاتی ہے اور نذیر احمد صاحب کی گرامر نصاب میں داخل ہے۔ بہتر ہو کہ انجمن ترقی اردو" اورنگ آباد۔ "دار المصنفین" اعظم گڈھ اور "جامعہ ملیہ" دہلی اپنی کتابوں اور مطبوعات کی ایک ایک جلد

مغربی یونیورسٹیوں کو بھیج دیں۔ "باغ و بہار کی اُردو اب پُرانی ہو چکی ہے۔ متروک محاورات اور الفاظ کی تعلیم سے سلیس زبان حاصل نہیں ہو سکتی۔ توبۃ النصوح، آبِ حیات، نیرنگِ خیال اور مرأۃ العروس شُستہ زبان میں لکھی گئی ہیں ان کو داخلِ نصاب کر کے مغربی یونیورسٹیاں ایک علمی زبان کی ترقی میں مدد دے سکتی ہیں۔"

اگر برلن وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں صرف "باغ و بہار" محض اس قسم کی اور پُرانی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو واقعی معاصر موصوف کی رائے بہت زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ لیکن اگر نئی کتابوں کے ساتھ اس قسم کی پُرانی کتابیں نصاب میں داخل ہیں تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں بلکہ قدیم و جدید زبان و ادب کے مقابلے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ بہر حال ہمیں اُمید ہے کہ متعلقہ ادارے اس طرف متوجہ ہو کر مغربی یونیورسٹیوں کو اُردو کا نصاب تعلیم مقرر کرنے میں ہر طرح کی ضروری امداد بہم پہنچائیں گے۔

سینما کے ایکٹروں کی تنخواہیں

سینما کے پندرہ مشہور ایکٹروں کی تنخواہوں کے متعلق پہلی مرتبہ مسٹر سیموئل گولڈن نے صحیح اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ پڑھ کر تعجب ہو لیکن میں نے اکثر چیکوں پر خود دستخط کئے ہیں۔ ذیل میں ہم چودہ مشہور ایکٹروں کے نام اور ان کی ہفتہ وار تنخواہیں درج کرتے ہیں جو امریکا کے ایک رسالے میں شائع ہوئی ہیں۔ سال چالیس ہفتوں کا شمار کیا جاتا ہے:-

ولیم راجرز	۱۵۰۰ پونڈ	والس بیری	۱۰۰۰ پونڈ
ماریس کیولیر	۱۵۰۰ پونڈ	ولیم پاول	۹۰۰ پونڈ
کانسٹینس بینیٹ	۱۵۰۰ پونڈ	جون کرافرڈ	۸۰۰ پونڈ
جان بیری مور	۱۳۰۰ پونڈ	جینیٹ گینر	۷۵۰ پونڈ
نارما شیرر	۱۲۰۰ پونڈ	ایڈورڈ جی رابنسن	۶۰۰ پونڈ
رچرڈ بارتھلمس	۱۲۰۰ پونڈ	جیمز کیگنی	۵۶۰ پونڈ
این ہارڈنگ	۱۲۰۰ پونڈ	کلارک گیبل	۵۰۰ پونڈ

چہرے کے دو رُخوں میں اختلاف کی وجہ

ڈاکٹر ورنر والف جرمن ماہرِ نفسیات نے انسانی چہرے کے متعلق بعض اہم انکشافات کئے ہیں۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کے لئے ہزارہا تصاویر کا مشاہدہ کیا ہے کہ انسان کے چہرے کے دو رُخ کیوں کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ اُن کا قول ہے کہ چہرے

کا ایک رُخ انسان کی موروثی سیرت کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ اگر انسان کو اس کے حسب مرضی قدرتی نشوونما کا موقع دیا جائے تو اس کا چہرہ بیشتر اسی رُخ کا ہم شکل ہو۔

دوسرا رُخ انسان کی سیرت کے نشوونما پر تعلیم، آداب، کاروبار اور معاشری زندگی کے اثرات دکھاتا ہے۔

ڈاکٹر والف نے انسان کی سیرت کے دونوں حصّوں کے تجزیہ کا ایک آسان طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے چہرے کی پوری جسامت کی تصویر ناک کے وسطی خط سے نیچے کی طرف دو برابر حصّوں میں کاٹ لی جاتی ہے۔ بائیں رُخ کی دوبارہ اُلٹی تصویر لی جاتی ہے اور تصویر کے اصلی بائیں رُخ کے ساتھ ملا کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہ ایک پورے چہرے کی تصویر بن جاتی ہے جو یہ دکھاتی ہے کہ اگر اس چہرے کا دایاں رُخ بھی بائیں کا ہم شکل ہوتا تو چہرے کی صُورت کیا ہوتی۔

اسی طرح دائیں رُخ کی ایک ایسی ہی مرکب تصویر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اگر اس چہرے کا بایاں رُخ دائیں رُخ کا ہم شکل ہوتا تو چہرے کی صُورت کس قدر نمایاں طور پر مختلف ہوتی۔

پی کے گھوش

(بنگال کا مشہور تیراک)

مسٹر پی کے گھوش نے تیراکی کے فن میں عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ حال میں انھوں نے کارنوالس سکیر کے تالاب میں ہتھکڑی کے ساتھ مسلسل ۴۴ گھنٹے تک تیر کر اپنی شہرت میں اضافہ کر لیا ہے۔ جب مسٹر گھوش ۴۴ گھنٹے کے بعد پانی سے باہر نکلے تو وہ بالکل چاق و چوبند معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کمالِ فن نے انہیں اس قدر ہر دلعزیز بنا دیا ہے کہ جب وہ تالاب سے نکلے اس وقت تالاب کے چاروں کناروں کے گرد کم از کم بیس ہزار اشخاص کا ہجوم تھا۔

مسٹر گھوش کے لئے ۴۴ گھنٹہ تک تیرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ اس سے قبل رنگون کی جھیل کے ٹھنڈے پانی میں متواتر اسّی گھنٹے تک تیر چکے ہیں۔ ۴۴ گھنٹے کی میعاد محض تجربے کے طور پر مقرر کی گئی تھی۔ قیاس ہے کہ گھوش صاحب مستقبلِ قریب میں ہتھکڑی لگا کر پچاس گھنٹے یا اس سے زائد مدت کے لئے تیر سکیں گے۔ ذیل میں ہم مختلف موقعوں پر مسٹر گھوش کے کارناموں کا ایک نقشہ درج کرتے ہیں:۔

سنہ ۱۹۲۱	۱۳ میل تیرے	(۲ گھنٹے ۱۰ منٹ)
سنہ ۱۹۲۵	۴۴۰ گز تیرے	(۴ منٹ ۴۹ سیکنڈ)
سنہ ۱۹۲۴	۱۳ میل تیرے	(۲ گھنٹے ۱۹ منٹ)

۱۹۲۴ء	۱۱ گز تیرے ۱ منٹ ۹ سیکنڈ)
۱۹۲۸ء	چٹاگانگ میں ۱۵ میل تیرے۔
۱۹۲۹ء	کلکتہ میں ۲۰ گھنٹے تک مسلسل تیرتے رہے۔
۱۹۳۰ء	کلکتہ میں ۷ گھنٹے ۱۰ منٹ تک مسلسل تیرتے رہے۔
۱۹۳۱ء	۶۶ گھنٹے ۱۸ منٹ
۱۹۳۳ء	۷۲ ، ۱۸ منٹ (کلکتہ)
۱۹۳۳ء	۷۹ ، ۲۴ منٹ (رنگون)

تصویر

تقدیر کا چکر۔ "تقدیر خدا کا قانون ہے اور اس کا نفاذ خدا ہی کی مرضی کے ماتحت ہوتا ہے"

اس گرانمایہ تصویر میں برن جونز نے فلسفۂ عامہ کے ایک قدیم ترین مقولے کو مصوّر کیا ہے۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو ایک پہیئے کی گردش سے تشبیہ دینے کا خیال نامعلوم زمانے سے مقبول چلا آتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے قدیم یونانی فلسفی (Phocylides) (۵۵۰ سنہ قبل مسیح) نے اس تشبیہ کا آغاز اس وقت کیا جب اس نے ذیل کے الفاظ لکھے: "دکھ ہر شخص کیلئے مقدر ہے۔ زندگی ایک چکر ہے اور اچھے دن ہمیشہ قائم نہیں رہتے" اچھے دنوں کے بعد بُرے دن اور بُرے دنوں کے بعد اچھے دن آتے ہیں۔ قسمت کا یہ چکر ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کم از کم ایک آدھ مختصر لمحے کے لئے اپنی زندگی کی معراج پر پہنچاتا ہے۔ تصویر میں تقدیر کی دیوی آہستہ آہستہ چکر گھما رہی ہے اور اس کے بے بس شکار تن بتقدیر پست و بلند دیکھ رہے ہیں۔ غلام اپنی "ساعت زریں" میں تاجدار بادشاہ کو پاؤں تلے روند رہا ہے سب سے نیچے شاعر ہے اس کی آنکھوں میں چمک ہے اور دل میں بہتر زمانے کی اُمید۔ صبح فرد اسکے اس اولوالعزم پیغامبر کی تصویر مصوّر نے ایسی بدحال کیوں بنائی؛ یہ بات قابلِ غور ہے۔ برن جونز کی تصاویر میں تقدیر کا خاموش، اُداس لیکن باوقار پیکر ہمیشہ ہماری توجہ کو جذب کرتا ہے۔ یہی حال موجودہ تصویر کا ہے۔

تقدیر کا چکر

اُردو ڈراما

(۲)

شیکسپیئر کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ وہ آسمانِ ڈرامہ کا آفتاب عالمتاب سمجھا جاتا ہے جس کی ضیاباریوں سے انگریزی ادب وشاعری کی زمین جگمگا اٹھی ہے۔ اس کے روشن کارنامے ادب وشاعری کی دنیا میں بقائے دوام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ہر شخص عزت و احترام کے ساتھ اس کا نام لیتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ اس کی ڈرامائی پیداوار پر اُردو مصنفین کی للچائی نگاہیں نہ پڑتیں۔ چنانچہ شیکسپیئر کے اکثر مشہور و معروف ڈراموں مثلاً رومیو جولیٹ۔ ہملٹ۔ اوتھیلو۔ مرچنٹ آف وینس۔ کیمڈی آف ایررس۔ مڈسمر نائٹ ڈریم۔ ایز یُو لائک اِٹ۔ ونٹرز ٹیل۔ لوز لیبرز لاسٹ اور ٹمپسٹ کو علی الترتیب گلنار فیروز۔ خونِ ناحق۔ جعفر۔ وینس کا سوداگر۔ بھول بھلیاں۔ جامِ اُلفت۔ دلپذیر۔ مریدِ شک۔ یاروں کی محنت برباد۔ اور تیرِ نگاہ کے نام سے اُردو کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اور یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کے یہ ڈرامے شیکسپیئر کے شاہکار کے ترجمے ہیں جس زبان میں شیکسپیئر جیسے باکمال اور یگانۂ روزگار ڈرامہ نویس کے ادبی جواہر پارے اس کثرت سے منتقل ہو چکے ہوں اس کے ڈرامائی لٹریچر کو کون شخص پست و حقیر قرار دے سکتا ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گھٹیا مال کو ترجمہ کہنا لفظ ترجمہ کی توہین ہے۔ پروفیسر آر۔ کے۔ یاجنک کا خیال بہت صحیح ہے کہ اُردو کے کوی (شاعر) انگریزی زبان پر کافی عبور نہیں رکھتے۔ شیکسپیئر کی ادبی خوبیوں اور فنی باریکیوں تک ان کی ذہنی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ شیکسپیئر کے ڈرامائی قصہ کو کسی سے پڑھوا کر سُن لیتے ہیں۔ پھر اشخاصِ قصہ اور مقامات کے نام بدل کر اور واقعات، حادثات، معاملات اور مواقع میں حسب مرضی ردوبدل، ترمیم واضافہ، کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کر کے اسے اپنے پست مذاق کے مطابق بنا لیتے ہیں اور تیسرے درجے کے تماشائیوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی گھٹیا ڈرامائی پیداوار میں جابجا بے معنی گانے داخل کر دیتے ہیں۔ جو بالعموم محض تُک بندی پر مبنی ہوتے ہیں اور فحش کامک (مزاحیہ) کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا اردو ڈرامے اسی قسم کے ناجائز تصرفات کا نتیجہ ہیں۔ ان پر نہ ترجمہ کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ آزادانہ تالیف و تصنیف کا۔ شیکسپیئر سے ان کا تعلق صرف اس قدر ہے کہ ان کے قصے شیکسپیئر کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ ورنہ شیکسپیئر کے ڈراموں میں فطرت بشری کی نباضی و مرقع نگاری کے جو شہ پارے پائے جاتے ہیں۔ ان کا اردو ڈراموں میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ ادبی لطافتوں اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے

انگریزی اور اُردو ڈراموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکسپیئر۔ مارلو۔ بیومونٹ اور فلیچر کے ڈراموں کو دُنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں بی۔ اے اور ایم۔ اے کے نصاب میں شریک کرتی ہیں لیکن اردو ڈراموں کا داخلِ نصاب ہونا تو ایک طرف کوئی سنجیدہ شخص ان کے مطالعہ کی بھی زحمت برداشت نہیں کرتا اور نہ وہ کبھی کتب خانہ کی زینت بنتی ہیں۔

بہرحال تھیئٹریکل کمپنیاں اُردو کے جو نام نہاد ڈرامے تمثیل کرتی ہیں وہ ماہرین فن کے نزدیک نہ ادبی لحاظ سے اور نہ فنی اعتبار سے کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں بے شمار نحوی و عروضی اسقام پائے جاتے ہیں۔ ان کے گانے بالکل مہمل اور تک بندی پر مبنی ہوتے ہیں۔ سُریلی دھنوں پر معنی کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ اُردو کے ڈرامہ نویس بالعموم فنِ ڈراما کے اصول و نکات سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے ان کے ڈراموں میں پلاٹ کی پیچیدگی، اُلجھاؤ اور دلچسپی مفقود ہوتی ہے۔ کردار نگاری کا عنصر معدوم ہوتا ہے۔ مکالمے بالعموم بیت بازی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں ظرافت اور شوخی کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے جا ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے نہ معاملاتِ زندگی نہ مسائلِ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔ کھیل دیکھتے چلے جائیے۔ ایک منظر سے دوسرا منظر دلفریب معلوم ہوگا لیکن آخر میں سوچیے کہ کیا دیکھا تو مقصد کا کچھ پتہ معلوم نہ ہوگا۔ غرضکہ اردو ڈرامے محض تفریح و تفنن کی چیزیں ہیں۔ ان کی گرم بازاری کا مدار زیادہ تر زرق برق لباس، مناظر کی دلکشی، ڈوم ڈھاڑیوں کے ناچ گانے اور مخش و سوقیانہ مذاق پر ہوتا ہے۔ اُردو کا ایک ڈراما بھی ایسا نہ ملے گا جسے ناٹکی دُنیا نے مستند تسلیم کیا ہو۔

اُردو ڈراموں کی یہ درگت دیکھ کر بعض مسلم الثبوت ادیبوں اور اعلےٰ تعلیم یافتہ مصنفوں کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور اُنہوں نے کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد پیشِ نظر رکھکر ناٹک نگاری کی طرف توجہ فرمائی۔ اردو کے مشہور عالموں اور کہنہ مشق ادیبوں کے لکھے ہوئے ڈراموں میں سے حسبِ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

نام تصنیف یا ترجمہ	نام مصنف یا مترجم
۱۔ شہیدِ وفا	مولانا عبدالحلیم صاحب شرر
۲۔ رشید اور مینہ	منشی احمد علی صاحب شوق
۳۔ معشوقۂ فرنگ	منشی جوالا پرشاد صاحب برق بی۔ اے
۴۔ زود پشیماں	مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے
۵۔ ترجمۂ مکرم اردسی	مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے
۶۔ جنگِ روس و جاپان	مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے
۷۔ برہانڈ	جسٹس کنور سین صاحب ایم۔ اے

۸۔ راج دُلاری	پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب
۹۔ ترجمہ جولیس سیزر	منشی تفضل حسین صاحب
۱۰۔ انارکلی	میر امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے
۱۱۔ جانِ ظرافت (ترجمہ مولیئر لینگ)	محمد عمر و نور الٰہی صاحبان
۱۲۔ قزاق (ترجمہ شلر)	
۱۳۔ ظفر کی موت (ترجمہ میٹرلنک)	
۱۴۔ نرگس جمال (ترجمہ میٹرلنک)	مولوی شاہد احمد صاحب بی۔اے

ان تصنیفات و تراجم کی ادبی خوبیوں کے کیا کہنے۔ خلوت میں بیٹھ کر ان کا مطالعہ کیجئے صفحے صفحے پر معجز بیانی کے نمونے اور جملے جملے میں قادر الکلامی کے کرشمے نظر آئیں گے۔ زبان کی صحت و سلاست، روزمرہ کی صفائی، محاورات کی برجستگی، انداز بیان کی دلکشی، مقصد کی بلندی، لب و لہجہ کی متانت، مذاق کی شائستگی قدم قدم پر آپ سے باجِ تحسین وصول کرلے گی۔ شاید ہی کوئی قصّہ، کوئی تاریخ، کوئی افسانہ لطف و دلکشی میں ان تصنیفات کی ہمسری کا دعوےٰ کر سکے۔ غرضکہ ہر تصنیف دستار ادب کا طرہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عروسِ اسٹیج کا گیسو ان شانوں کا منت پذیر ہؤا ہے یا ہو سکتا ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ ان میں سے اکثر ڈرامے تو ایسے ہیں جو اپنی طوالت، نثریت، سکون و جمود اور فلسفیانہ مسائل کی وجہ سے کبھی اسٹیج کے شرمندۂ احسان ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ بعض صرف امچیور (شوقیہ) کلبوں میں تمثیل کئے جا سکتے ہیں لیکن عام تماشاگاہوں میں ان کی نمائش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ آج تک کسی تجارتی کمپنی نے ان کی طرف رُخ نہیں کیا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ادبی پیداوار تنہائی میں خاموش مطالعہ کی چیز ہو اور پبلک میں اداکاری کے ذریعے جس کی تمثیل و نمائش ممکن نہ ہو اسے ڈراما کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ آج کل مغربی ممالک میں یہ ایک متنازع فیہ مسئلہ بن گیا ہے لیکن دُنیا کی قدیم و جدید تاریخ ادبیات شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں ڈراما اور اسٹیج کے مابین چولی دامن کا ساتھ رہا کیا ہے۔ فنِ ڈراما کے موجدوں نے خواہ ان کا تعلق سنسکرت لٹریچر سے ہو یا یونانی و لاطینی ادبیات سے ناٹک کو اسٹیج پر دکھانے کا یہ مدعا قرار دیا ہے کہ تفریح اور ہنسی کھیل کے پردے میں لوگوں کو تلقین کی جائے اور تماشائیوں کے جذبات کو متاثر کر کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح کا کام لیا جائے۔ غرضکہ ایکٹر، اسٹیج اور تماشائی کا تصور ڈراما کے تصور کا جزو لاینفک ہے جو ادبی پیداوار مثل تماشاگاہ اور عوام سے بے نیاز ہو کر محض خاموش خلوتی مطالعہ کی متقاضی ہو اس کا شمار ڈرامے میں نہیں بلکہ ناول، تاریخ، افسانہ یا کسی اور ادبی صنف میں ہونا چاہئے۔ ناول کا طرزِ بیان متکلمانہ بھی ہوتا ہے اور راویانہ بھی۔ لیکن ناٹک کا اندازِ بیان سر بسر مکالمے کے

رنگ میں ہوتا ہے پس جس ناٹکی تصنیف کی اسٹیج پر نمائش نہ ہو سکے وہ ایک قسم کا ناول ہے جسے ہم راویانہ ناول کے بجائے متکلمانہ ناول کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی ماہیت و نوعیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

دُنیا میں جتنے نامور اور باکمال ڈرامہ نویس گذرے ہیں مثلاً کالیداس۔ بھاوبھوتی۔ ایسی کائی لس۔ سوفاکلیز۔ سینیکا ارسطو۔ شکسپیئر۔ ملٹن۔ ریسائن۔ مولیئر سب نے ڈرامے اسی غرض سے لکھے تھے کہ پبلک کے سامنے اسٹیج پر ان کی نمائش کی جائے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کی ڈرامائی تصنیف کا محض ادبی حیثیت سے ناول یا شاعری کی طرح گوشۂ عزلت میں بیٹھکر خاموشی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔ البتہ مغربی ممالک میں آج کل نقادوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جس میں سراندنبرگ، اسٹرنگ میٹرلنک۔ ڈاکٹر اسپنگارن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ ڈراما ادبیات کی ایک اہم شاخ ہے اس لئے کسی ناٹکی تصنیف پر تنقید کرتے وقت ہمیں تماشائیوں کے ہجوم، تھیئٹر کی عالیشان عمارت، مناظر کی دلفریبی، پردوں کی رنگینی، ایکٹروں کی اداکاری، سنگت کی سامعہ نوازی، رقص و سرود کی اثر آفرینی اور دوسرے تمام خارجی امور سے بے تعلق ہو کر محض ادبی اصول پر اس کے معائب و محاسن جانچنے چاہئیں۔ اسٹیج کا مقصد نظر فریبی (الیوژن) پیدا کرنا ہے تاکہ نقل پر اصل کا گمان ہو۔ قدیم زمانہ میں یہ کام تماشائیوں کا تخیل انجام دیتا تھا۔ سنسکرت کے ناٹک ایک معمولی تمبو تان کر دکھائے جاتے تھے۔ گھنے جنگل کے تصویر کے لئے اسٹیج پر چند سبز ٹہنیاں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ جب تخیل کی مدد سے چند سادہ وسائل کے ذریعے مقصد پورا ہو جائے تو بیش بہا اور بھاری بھرکم ساز و سامان کی کیا ضرورت ہے۔ ڈرامے بغیر تھیئٹر کی تعمیر کے کھلے میدان میں کیوں نہ دکھائے جائیں؛ یا تماشاگاہ کو تمام تکلفات و تصنعات سے کیوں نہ آزاد کر دیا جائے؛ لیکن مخالف جماعت کا قول ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کا اقتضا ہے کہ ہم دورِ حاضرہ کی ایجادات و اختراعات سے استفادہ کریں۔ تن پوشی کے لئے کمل۔ شدائد موسمی سے محفوظ رہنے کے لئے جھونپڑا۔ پیٹ بھرنے کے لئے کند مُول اور سواری کے لئے بیل گاڑی کافی ہے تو کیا ہمیں نفیس کپڑے پہننا، خوشنما بنگلہ میں رہنا۔ لذیذ غذا کھانا اور موٹر پر سوار ہونا ترک کر دینا چاہئے؛ اسٹیج کا مقصد نظر فریبی پیدا کرنا ہے۔ مانا کہ تخیل کی مدد سے بھی یہ مقصد کسی حد تک پورا ہو سکتا ہے لیکن نقل میں اصل کی پوری شان پیدا کرنے اور نظر فریبی کو معراجِ کمال تک پہنچانے کے لئے اگر موجودہ دَور کی ترقی یافتہ صناعی کے بہترین نتائج سے کام لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؛ فرض کرو کہ سین سینری کی حیثیت محض ایک خادم کی سی ہے اور ڈرامہ بمنزلہ آقا کے ہے لیکن کیا خادم سے کام لینا مالک کے اپاہج ہونے کی دلیل ہے؛ ڈراما نہ کبھی اسٹیج سے بے نیاز ہُوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے میں ڈرامے کی خصوصیات اسٹیج کے حالات و ضروریات کی تابع رہا کی ہیں۔ ایتھنیہ کے وسیع تھیئٹر کا یونانی ٹریجیڈی (المیہ) پر اور عہدِ الزبتھ کے اسٹیج کا شکسپیئر کے ڈراموں پر جو اثر پڑا وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

بہرحال بحث صرف اسٹیج کی سادگی یا تکلف کے متعلق ہے۔ کوئی شخص خواہ وہ اسٹیج کا مخالف ہو یا مؤید اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ڈراما عوام یا خواص کی جماعت کے سامنے ایکٹ کرنے کی چیز ہے۔ کوئی ناٹکی تصنیف ادبی نقطۂ نظر سے کتنی ہی گرانمایہ کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ اسٹیج کو پس پشت ڈال کر لکھی گئی ہو اور اس میں پبلک کے سامنے تمثیل کئے جانے کی صلاحیت نہ پائی جائے تو اس کا شمار ڈرامے میں نہیں بلکہ ناول، افسانہ یا کسی دوسری صنفِ ادب میں ہونا چاہئے۔ اسے اردو زبان کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بے شمار ڈرامے جو اسٹیج پر نہایت کامیاب ثابت ہوئے اور جن کے ذریعہ سے تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں نے لاکھوں روپے کمائے وہ ادبی اور فنی لحاظ سے بالکل ناقص ہیں اور ملک کے بہترین ادیبوں نے تالیف و ترجمہ کے ذریعے ڈرامے کے رنگ میں جو کتابیں پیش کی ہیں وہ اپنی ادبی و لسانی خوبیوں کے باوجود عروسِ اسٹیج کی تزئین کا کام نہیں دے سکتیں اس لئے وہ ڈرامے کی فہرست ہی سے خارج کر دیئے جانے کے لائق سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ڈرامے مثلاً روحِ سیاست۔ جانِ ظرافت، قزاق، بگڑے دل، ظفر کی موت وغیرہ اسکولوں، کالجوں اور امیچور (شوقیہ) کلبوں میں ایکٹ کیے جا سکتے ہیں لیکن ملک کے عام وسیع تھیئٹروں میں ان کی تمثیل نگاری کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ غرضکہ اردو میں ایک ڈرامہ بھی ایسا نہیں ہے جو ادبی و فنی خوبیوں کا بھی حامل ہو اور پبلک اسٹیج پر بھی کامیاب ثابت ہوا ہو۔ جسے چوٹی کے ڈراما نے مستند تسلیم کیا ہو اور جسے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں جو باکمال ڈرامانویس گزرے ہیں وہ نامور ایکٹر بھی تھے۔ کون نہیں جانتا کہ شیکسپیئر اگر آسمانِ ڈراما کا آفتاب تھا تو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ایکٹر بھی تھا۔ ممالک متمدنہ میں موسیقی۔ رقص اور اداکاری کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں مہارت پیدا کرنا معیوب نہیں بلکہ موجب فخر خیال کیا جاتا ہے۔ ہندی روایات بھی ان فنون کی قدر دانی کی مؤید ہیں۔ قدیم تاریخ ہند کے مطالعہ سے واضح ہے کہ شاہی خاندان کی لڑکیوں کو بھی رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں اعلیٰ طبقہ کے مرد اور عورت آزادی سے اسٹیج پر آ کر ایکٹ کرتے تھے۔ البتہ اسلامی حکومت کے زمانہ میں جب ہندی ڈرامے پر زوال آ گیا تو شرفا اور علماء نے ناٹکوں میں حصہ لینا ترک کر دیا اور رذیلوں نے ایکٹری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اور گاؤں گاؤں پھر کر یاترا۔ رس دھاری۔ رام لیلا۔ رہس۔ بھان وغیرہ کے معمولی تماشے دکھانے لگے۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی تسلط کے بعد جب انگریز عہدہ داروں۔ تاجروں اور پادریوں نے تفریح طبع کے لئے یورپی وضع کا شوقیہ تھیئٹر قائم کیا اور بنگالی زمینداروں اور امیروں کو شرکت کی دعوت دی تو لوگوں کو کالیداس اور بھاؤ بھوتی کے زمانہ کی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں اور رفتہ رفتہ بنگالی تھیئٹر بھی قائم ہو گئے۔ اسی طرح بمبئی کے انگریزوں کے اثر سے مغربی ہند میں مرہٹی اسٹیج معرض وجود میں آئے۔ بنگال اور مہاراشٹر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات جن میں جج۔ بیرسٹر۔ ڈپٹی کلکٹر۔ پروفیسر شامل تھے۔ بڑے شوق سے تماشوں میں عملی حصہ لینے

لگے۔ بڑے بڑے نامور ادیب اور اہلِ قلم مثلاً دویجندرلال رائے۔ مدھوسودن دت۔ شیشیر بہادر۔ ہرندر چٹوپادھیا نے یورپ کا سفر کر کے فنِ ڈراما کے اصول و نکات۔ اسٹیج کے لوازم۔ اداکاری کے گروں اور سین سینری اور پردہ رنگنے کی باریکیوں سے عملی طور پر واقفیت حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگ فنی تربیت پانے کے بعد ڈرامہ کی جو کتاب لکھیں گے وہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہو گی۔ چنانچہ بنگالی اور مرہٹی زبان میں ایسے ناٹکوں کی کمی نہیں جو بہترین انگریزی ڈراموں کے پہلو بہ پہلو جگہ پا سکیں۔

لیکن ہماری سوسائٹی میں گانا۔ بجانا۔ ناچنا۔ تھرکنا۔ بھاؤ بتانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ چیزیں ڈرامے کے لوازم میں شامل ہیں۔ رقص و سرود کی محفل میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھنا اور پیشہ ور مغنیوں اور رقاصوں کے فنی کمالات سے لطف اندوز ہونا اور بات ہے لیکن کوئی شریف آدمی پبلک کے سامنے ان فنونِ لطیفہ میں خود کوئی عملی حصّہ نہیں لے سکتا۔ ایکٹنگ یا اداکاری بھی مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ ہمارے ہاں کے شرفا خود ایکٹ کرنا تو در کنار تھیٹر میں جانا اور ناٹک کے کھیل دیکھنا بھی اپنی ثقاہت و متانت کے منافی تصوّر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے مصنفین کو اداکاری کے رموز و نکات، اسٹیج کی ضروریات اور ڈرامے کی فنی باریکیوں اور پیچیدگیوں سے کما حقہٗ ذاتی واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ڈراما خاموش مطالعہ کیلئے نہیں بلکہ پبلک کے سامنے تمثیل کرنے کی غرض سے لکھا جاتا ہے۔ ڈرامے کا نام سنتے ہی ایک کثیر مجمع کا تصوّر ذہن میں آجاتا ہے۔ کثیر مجمع کے سننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایکٹر بلند آواز سے بولیں لیکن معمولی نثری گفتگو کے موقع پر چیخ چیخ کر بولنا بالکل غیر فطری اور مضحکہ خیز معلوم ہو گا۔ اسلئے ضروریات اسٹیج کو مدِ نظر رکھکر ہر ملک کے نامور ڈرامہ نویسوں نے اپنی ناٹکی تصنیفات میں جا بجا نظم، اشعار اور گانے کو جگہ دی ہے اور زوردار، فصیح اور مقفّٰی عبارتیں استعمال کی ہیں تاکہ ایکٹروں کو اپنی آواز کھینچنے اور بلند کرنے کا موقع ملے اور وہ بے محل اور مصنوعی بھی معلوم نہ ہو۔ ڈرامے میں اشعار کا ادخال محض لطف و دلچسپی پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ تماشا گاہ کی وسعت اور مجمع کی کثرت کا یہی تقتضا ہے۔ چونکہ مجمع میں خواص کی تعداد قلیل اور عوام کی تعداد کثیر ہوتی ہے اسلیئے ڈرامہ نویس کو فلسفیانہ و حکیمانہ مضامین پر بحث نہیں کرنی نہیں چاہیئے۔ میٹرلنک اور برنارڈ شا کے متعدد ڈرامے اپنے باریک و دقیق نفسیاتی مباحث کی وجہ سے اسٹیج پر بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور کے بعض ناٹک بھی اپنی ادبی خوبیوں کے باوجود اسٹیج ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ لہٰذا ڈراما نویس کو خصوصی مباحث ترک کر کے عوام کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھنا اور انسان کے سادہ و بسیط جذبات کو برانگیختہ کرنا چاہیئے۔ چونکہ ایکٹروں کو ایک تنگ و محدود چبوترہ پر کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں جنگ و جدال۔ فساد و ہنگامہ۔ بلوہ اور گھوڑ دوڑ وغیرہ کی ٹھیک طور پر نمائش نہیں ہو سکتی۔ اسلئے اسٹیج پر ان کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ قدیم ہندی اور یونانی ڈرامہ نویس ان باتوں کو کسی ایکٹر سے زبانی بیان کرا دیتے تھے۔ کبھی کبھی اُردو اسٹیج پر متحاربین کے صرف تین تین یا چار چار آدمی تلوار ہلاتے اور طبلہ کی تھاپ پر تھرکتے اور پینترے بدلتے نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاٹھ کی پتلیاں ہندی گتوں پر ناچ رہی ہیں۔ ان کی ہر

حرکت سے تصنع کا اظہار ہوتا ہے اور اسٹیج کی نظرفریبی (الیوژن) کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے۔ ایکٹروں سے ایسی چیز کی نقل کرانا جس میں اصل کی ذرا سی جھلک بھی نظر نہ آئے فنِ ڈراما کے سخت منافی ہے۔ جب ڈراما اور مجمع لازم و ملزوم ہیں تو ڈراما نویس کو تماشائیوں کی جسمانی سہولتوں کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ تماشا کیسا ہی دلچسپ ہو لیکن انسان بہت دیر تک ایک ہی کل بیٹھے بیٹھے ضرور اکتا جائیگا۔ ناول کی طرح ڈراما کو بہت ضخیم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسکی تمثیل و نمائش دو تین گھنٹے میں ختم ہو جانی چاہیئے۔

افسوس ہے کہ ہمارے باکمال ادیبوں نے اپنے ڈراموں کی تصنیف میں ان اُمور کا لحاظ نہیں کیا ہے بلکہ ضروریاتِ اسٹیج کو پس پشت ڈال کر ڈرامے کے نام سے اپنے ادبی کارنامے پیش کئے ہیں۔ جب انہوں نے پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے ملازم منشیوں کو اردو زبان کے گلے پر کند چھری پھیرتے دیکھا تو ان کی غیرت و حمیت جوش میں آ گئی اور محض ادب و زبان کی اصلاح کیلئے انہوں نے اسٹیج نہ ہونے والے ڈرامے لکھ دیئے۔ لیلائے ادب کا گیسو تو سنور گیا لیکن عروسِ اسٹیج کی زلف بکھری کی بکھری رہ گئی۔ ڈرامے کے لئے اسٹیج ہونے کی اہلیت لازمی شرط ہے۔ بعض امریکی نقاد تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ڈراما ادبیات کی ایک شاخ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف فنون مثلاً موسیقی، رقص، رنگ کاری، نطقیات (ایلوکیوشن)، انتظام لباس و پوشاک (کسٹیومنگ)، اہتمام روشنی وغیرہ کی آمیزش سے ڈراما وجود پذیر ہوتا ہے۔ جبتک کوئی شخص ان فنون میں مہارت حاصل نہ کر لے اس وقت تک وہ کوئی اچھا ڈراما تیار نہیں کر سکتا۔ ان نقادوں نے ڈرامے کی ادبی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا ہے لیکن ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے غلو سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے انہیں چند ڈراموں کو عظمت، شہرت، شاہکارانہ حیثیت اور بقائے دوام حاصل ہے جو اعلےٰ ادبی محاسن کے حامل ہیں۔ تاہم ہمارے باکمال اہل قلم کو جاننا چاہیئے کہ ڈراما نویسی میں محض ادب و شاعری اور فضیلت و تخیل سے کام نہیں چل سکتا۔ فن ڈراما کے خاص اصول و ضوابط ہیں جن پر عبور حاصل کرنے کیلئے بھرت کی نٹ شاستر سے لیکر موجودہ زمانہ کے مغربی ڈرامائی لٹریچر تک کے بالاستیعاب مطالعہ کی ضرورت ہے۔ تخیل سے زیادہ حقیقت پر زور دینا چاہیئے اگر قصہ کے واقعات تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہوں تو ڈرامے میں حقیقت کی پوری شان پیدا ہو سکتی ہے۔ شاعر اور ناول نویس کی طرح ڈرامانگار کا "الہام" (انسپیریشن) بھی انسان کی حقیقی زندگی سے حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص فطرتِ بشری کا نباض و رمز شناس نہ ہو وہ کبھی کامیاب ڈراما نہیں لکھ سکتا۔ علاوہ بریں ڈرامہ نویس کو تجسس، حیرت انگیز انتظار، کشمکش، حرکت و دلچسپی اور انتہائی سنسنی پیدا کرنے کے گُر، اداکاری کے نکات، اسٹیج کی اصطلاحات و ضروریات اور تھیٹر کے دوسرے خارجی لوازم سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔ ہمارے باکمال ادیبوں کے لکھے ہوئے ڈراموں کی ناکامی کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ ایکٹنگ اور اسٹیجنگ سے ناواقف ہیں اور ان کی تصنیفات میں ڈرامائیت کا عنصر مفقود یا پست ہے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ آئندہ اردو ڈرامے کی اصلاح و ترقی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

پارسی تھیٹریکل کمپنیوں اور ان کی اُتش خوار مقامی کمپنیوں کو صرف روپیہ پیدا کرنے کی دھن لگی رہتی ہے۔ وہ صرف ایسے ڈرامے اسٹیج کرتی یا اپنے منشیوں سے لکھواتی ہیں جن میں عوام کے پست اور سوقیانہ مذاق و پسند کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ اگر کوئی صاحب کمال اصول فن اور اعلیٰ مذاق کے مطابق خاص کی چیز تیار بھی کرے تو تجارتی کمپنیوں کو اس کی قدر نہ ہوگی اور خسارہ کے خوف سے وہ اسکو اسٹیج کرنے سے انکار کر دیں گی۔ اصلاحی تدابیر پر غور کرنے سے قبل بلاد مغرب کے تھیٹر پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں مغربی ممالک کے تھیٹر کی حالت بہت گِر گئی تھی۔ تھیٹر کے مالک کاروباری آدمی تھے جن کو صرف مالی منافع کی فکر تھی۔ وہ عوام کے پست مذاق سے واقف تھے اور انہیں کے پسند کے مطابق تماشے دکھاتے تھے۔ پبلک زرق برق لباس۔ نظر فریب مناظر۔ دلکش گانوں۔ بازاری مسخرے پن۔ فحش نقالی۔ ظاہری طمطراق اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کی دلدادہ تھی۔ مالکان تھیٹر انہیں چیزوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور ان کو اچھے ڈراموں کی کوئی قدر نہ تھی۔ حقیقت کی جگہ تصنع اور بسمیا نے لے لی تھی۔ اشخاص ڈراما کو حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا۔ ان کا ہر قول، فعل اور ہنسنا بولنا، رونا دھونا چلنا پھرنا مصنوعی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی اور ہی مخلوق ہیں۔ اور بہت سی بُرائیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں انگلستان میں باکمال ڈراما نویسوں کا کوئی سرپرست یا قدردان نہ تھا۔ اس لئے اچھے ڈراموں کی پیدائش ہی رُک گئی تھی۔ دولتمند تھیٹر کے منیجر بالعموم نیویارک کا سفر اختیار کرتے تھے اور وہاں جن چیزوں کو مقبول اور کامیاب پاتے تھے اُنہیں کی انگلستان واپس آکر اپنے اسٹیج پر نمائش کرتے تھے۔ ان منیجروں کو اچھے اور بُرے ڈراموں میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت نہ تھی۔ جو چیزیں وہ امریکہ سے لاتے تھے وہ ادنیٰ درجہ کے فرانسیسی کھیل کے ترجمے۔ مبتذل مزاحیہ سنسنی پیدا کرنیوالے میلو ڈرامے یا جرائم کے متعلق تفتیشی قصے یا انگوٹھی کا راز یا پوشیدہ خزانہ کی قسم سے ہوتی تھیں۔ بعض نئے ڈرامے لکھے بھی جاتے تھے تو ایکٹر منیجر سسٹم یا اسٹار سسٹم پر یعنی بعض تھیٹر کمپنیوں کے مہتمم ڈرامے میں خاص پارٹ لینے کے شائق تھے۔ بیچارے اُجرت یاب ڈراما نویس کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ وہ مہتمم کے مذاق و دلچسپی کے مطابق ڈرامے میں کوئی خاص کردار پیدا کرے اور اس کے پارٹ کو دوسرے کرداروں کے مقابلہ میں زیادہ زوردار بنائے تاکہ تماشائیوں کی نگاہ میں مہتمم کی شخصیت وقیع و ممتاز ثابت ہو۔ تماشا کیا تھا فٹ بال کا کھیل تھا جس میں ایک بظاہر چست و چالاک سنٹر فارورڈ (مرکزی پیش دوندہ) دوسرے دس کم حیثیت کھلاڑیوں کے ساتھ گیند لئے آگے بڑھ رہا ہو۔ اسٹار سسٹم نے ڈراما نویس کے موقف (اپوزیشن) کو اور بھی حقیر بنا دیا تھا۔ کوئی پیشہ ور حسین و جمیل رقاصہ ایکٹرس کی حیثیت سے اسٹیج پر نمودار ہوتی اور اپنے ناز و غمزہ کے کرشمے سے پبلک کا دل موہ لیتی تھی۔ عوام یہ جاننے کی پروا نہیں کرتے کہ ڈراما کسی باکمال شاعر کا لکھا ہوا ہے یا ادنیٰ درجہ کے منشی کا، جہاں اشتہار نکلا کہ پبلک کی منظور نظر مس گلاب یا مس زہرہ ناچ گانے کا کمال دکھانے والی ہیں، شام ہی سے تماشاگاہ میں خلقت ٹوٹی پڑتی ہے اور ٹکٹ گھر روپیہ کی جھنکار سے گونج اُٹھتا ہے۔ مختلف کمپنیاں

اس ستارہ کو بڑی سے بڑی تنخواہ پر اپنے ہاں بلانے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ پھر مس صاحبہ کی نازک دماغی کے کیا کہنے۔ جو کھیل اُن کو پسند نہیں آتا اس میں حصّہ لینے سے وہ صاف انکار کر دیتی ہیں۔ بیچارے ڈراما نویس کو کوڑ مغز لیکن پبلک کی منظورِ نظر رقاصہ کے رُجحانِ طبیعت کا پاس رکھنا اور اس کی مرضی کے مطابق ڈراما لکھنا پڑتا تھا۔ یہ ہے اُنیسویں صدی کے انگلستان کی ڈرامائی پستی کا دردانگیز نقشہ۔ کیا ٹھیک یہی حالت آج اُردو اسٹیج کی نہیں ہے؛ بلکہ سینما کی ترویج نے تھیئیٹریکل کمپنیوں کو اور قلاش بنا دیا ہے جس کی وجہ سے وہ عوام کی بدمذاقی کی پیروی کرنے پر پہلے سے بھی زیادہ مجبور ہیں۔

بہرحال ایک مدت تک یورپ کے ڈرامائی مطلع پر انحطاط و زوال کی گھٹا چھائی رہی۔ بالآخر ایک غیر معروف اُفق سے آفتابِ اصلاح طلوع ہُوا جس کی ضیا باریوں نے دنیائے ڈراما کو منور کر دیا۔ ناروے کا ملک ادب و شاعری کے لحاظ سے بلادِ مغرب میں صفر کا درجہ رکھتا تھا لیکن وہاں ہنری ابسن نامی ایک زبردست مصلح پیدا ہُوا جس نے اُنیسویں صدی کے اواخر میں دُنیائے ڈراما میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ تمام یورپ نے اس کے کمال کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا۔ سب سے پہلے ابسن نے رسمیات، روایات، تصنعات و تکلفات کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے ڈراموں کیلئے روزمرہ کی معمولی زندگی سے مواد حاصل کرنا شروع کیا۔ وہ اپنے زمانے کے معاشری مسائل میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ قدیم رسم و رواج کی قوتوں کے خلاف افراد کی جدوجہد میں اُس کو طربیہ اور المیہ دونوں کیلئے دلچسپ مضمون ہاتھ آتے تھے۔ وہ اپنے ڈراموں میں اکثر ایسے موضوع پر بحث کرتا تھا جو پہلے نہایت حقیر و پست اور اسٹیج کی شان کے منافی سمجھے جاتے تھے۔ اسکے ڈرامائی کردار اسٹیج پر اسی سادگی اور آزادی سے گفتگو کرتے ہیں جیسے حقیقی انسان گھروں میں بات چیت کرتے ہیں۔ اس نے خود کو خطاب کرنے یا پرے ہٹکر بولنے کے رسمی طریقہ کو جسے اصطلاحاً "سالوکیوئی" اور "ایسائڈ" کہتے ہیں خیرباد کہی۔ وہ دلفریب بصری مناظر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور نہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کی ضرورت تسلیم کرتا ہے۔ وہ سادہ گفتگو کے ذریعے سے ہر قسم کا اثر پیدا کر لیتا ہے۔ وہ ڈرامے میں مافوق البشر مخلوق، خلافِ عادت واقعات، سحر و طلسمی اور غیر فطری عناصر کو جگہ دینا حقیقت اور واقعیت کے منافی خیال کرتا ہے۔ وہ ڈرامے میں فلسفیانہ مسائل اور حکیمانہ نکات بیان کرنے یا اخلاقی درس دینے کا سخت مخالف تھا البتہ زندگی کے معمولی معمولی واقعات پر متانت و سنجیدگی کا رنگ چڑھانے میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ ابتداءً ڈرامے بالکل نظم میں یا بلینک ورس (نثر مرجز) میں یا نظم و نثر کی آمیزش سے لکھے جاتے تھے۔ جتنے نامور ڈراما نویس دُنیا میں گزرے ہیں سب کے سب زبردست شاعر بھی تھے۔ ابسن نے بھی اپنے دو ابتدائی ڈرامے سربسر نظم میں لکھے تھے لیکن پچاس سال کی عمر کے بعد جب اس کے اصلاحی خیالات میں پختگی و استواری پیدا ہوئی تو اس نے کُلّیۃً نثر میں ڈرامہ لکھنے کی بدعت جاری کی جس کی اب ہر ملک میں پیروی ہونے لگی

ہے۔ اُردو میں بھی خشک نثری ڈرامے لکھنے کا عام رواج ہوگیا ہے۔

یوروپی ممالک میں ڈرامہ نویسی پر اِبسن کا جو اثر پڑا ہے اس کو مسٹر ماریٹ مختصر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں: "ہر جگہ تھیئٹر نے قدیم روایات کا طوق اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور مادہ اور اسلوب دونوں میں آزادی کی روش اختیار کی گئی۔ نثر نے نظم کی جگہ لے لی۔ ڈرامانویسوں نے جرأت سے کام لے کر عصری مسائل اور روزمرہ کے معاملات پر بحث شروع کردی۔ حقیقت اور واقعیت نے توہم و تخیل کو اسٹیج سے بیدخل کردیا۔ تھیئٹر پہلے صرف ناسمجھ عوام کی تفریح و دلبستگی کی جگہ تھا لیکن اب سمجھدار اور شائستہ لوگ بھی کھنچ کر آنے لگے۔ نئی وضع کی اداکاری، شُستہ مذاق اور فطرت و حقیقت کی طرف عام رجحان کے مدنظر نئے نمونے کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ پہلے اسٹیج کی حیثیت پلیٹ فارم یا منبر کی سی تھی جس پر ایکٹر خطیبانہ پیرایہ میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ اندازِ تکلم صریحاً تصنع و تکلف کا آئینہ دار تھا۔ لیکن اب اسٹیج بدل کر ایک کمرے کے بن گیا جس کی چوتھی دیوار مفقود ہے اور جہاں لوگ ویسی ہی آزادی اور سادگی سے آپس میں بات چیت کرتے نظر آتے ہیں جیسے اپنے گھروں میں"۔

ڈرامائی دُنیا میں ایسے انقلاب کا پیدا ہونا معمولی بات نہ تھی۔ اِبسن کے اصلاحی خیالات کیا تھے، قیصر روم کے تربیت یافتہ فوجی سپاہی تھے، ان کا لشکر جرار جدھر گیا جس ملک میں داخل ہوا، فتحمند و ظفریاب رہا۔ اقلیم سخن کے فرمانرواؤں نے اس کا لوہا مان لیا اور اس کی سیادت و اطاعت قبول کرلی۔ مسٹر برنارڈ شا کا قول ہے کہ اِبسن کا جو زبردست اثر انگلستان پر پڑا۔ وہ تین عظیم الشان انقلابوں، چھ خطرناک صلیبی جنگوں، دو زبردست بیرونی حملوں اور ایک قیامت خیز بھونچال سے بھی پیدا نہ ہوسکتا تھا۔ ہر ملک کے نامور ڈرامانگار اِبسن کے خیالات کے علمبردار بن گئے۔ انگلستان میں ولیم آرچر، برنارڈ شا، گالزوردی، گرینول بارکر اور سمرسٹ ماگم جیسے یگانۂ روزگار ادیب ڈرامانویسی میں منزکِ اِبسن کا تتبع اپنے لئے باعثِ فخر خیال کرتے ہیں۔

قدیم تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ مالی ایثار و قربانی سے کام لے کر جدید اصلاحی ڈراموں کو ترقی دیں گی اس لئے لوگوں کو طرزِ جدید کا خوگر بنانے کے لئے نئے نئے تھیئٹر قایم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ فرانس میں لبری تھیئٹر (Theatre Libre)، جرمنی میں فری برن تھیئٹر (Freie Bühne) اور انگلستان میں ری پرٹری تھیئٹر اسی مقصد سے کھولے گئے۔ اس کے بعد تو ری پرٹری (Repertory) نے ایک علیحدہ تحریک ہی کی شکل اختیار کرلی اور ملک میں بیسیوں ری پرٹری تھیئٹر قایم ہوگئے۔ قدیم پیشہ ورانہ تھیئٹر اور جدید ری پرٹری تھیئٹر میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر ڈرامے کو صرف حصولِ زر کا آلہ تصور کرتا ہے لیکن ثانی الذکر اچھے ڈراموں کی تصنیف و تدوین کو مقدم سمجھتا ہے اور ضرورت کے وقت مالی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ چنانچہ ری پرٹری تحریک کی بدولت نہ صرف پبلک کے مذاق کی اصلاح ہوئی ہے بلکہ بیسیوں اعلےٰ درجہ کے ڈراموں کی تصنیف سے ادبیات میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ ورنہ پرانی پیشہ ور کمپنیوں کی سردمہری اور بے اعتنائی کی وجہ سے یہ ادبی جواہر پارے

قعر گمنامی میں پڑے رہتے۔ غرض کہ انیسویں صدی میں انگلستان کے تھیٹر کو جو عوارض لاحق تھے ان کے علاج کے لیے ری پرٹری تحریک نہایت کارگر ثابت ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی ڈرامانہ صرف اس مفید علاج سے بھلا چنگا ہو گیا بلکہ اس کی قوت اور اثر میں دس گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اُردو ڈراما اور اسٹیج کا جسم زار بھی انہیں اسقام و عوارض کا شکار ہے جو انگلستان کے تھیٹر کو انیسویں صدی میں لاحق تھے تو کیا اس کے علاج و تجدید شباب کے لئے بھی ری پرٹری کا مجرب و آزمودہ نسخہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا؛ اس کا جواب غالباً نفی میں ملیگا۔ اگر ایک امیر اور ایک غریب آدمی ایک ہی مرض میں مبتلا ہو تو جس قیمتی دوا سے امیر کو فائدہ ہوگا اس کے خریدنے ہی کی غریب کو استطاعت نہ ہوگی۔ اگر دوا قیمتی اجزا پر مشتمل نہ ہو اور دونوں کو بہ دست ہو جائے تو بھی دونوں آدمیوں کے مزاج و طبیعت اور ماحول و فضا میں اختلاف ہونے کی وجہ سے وہ دونوں کے لئے یکساں مفید ثابت نہ ہوگی۔ انگلستان نہایت دولتمند ملک ہے اور وہاں تعلیم کا بھی اس قدر چرچا ہے کہ جاہل اور ان پڑھ آدمی مشکل سے ملے گا۔ تعلیم سے انسان کی سیرت ضرور متاثر ہوتی ہے۔ ان کے مذاق شستہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ وہاں اعلےٰ درجہ کے ڈراموں کے قدر دانوں کی کمی نہیں اس لئے وہاں ری پرٹری تھیٹروں کو بھی ہمیشہ و بڑی تھیٹریکل کمپنیوں کے مقابلے میں ہیچ ہونے کے باوجود اتنی آمدنی ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مفید وجود کو قائم رکھ سکیں لیکن ہندوستان جیسے قلاش ملک میں بڑی بڑی تجارتی تھیٹریکل کمپنیوں کا شہر بشہر دورہ کرتے رہنے کے باوجود تھوڑے تھوڑے دنوں پر دیوالہ نکلتا رہتا ہے کتنی تھیٹریکل کمپنیاں حشرات الارض کی طرح معرض وجود میں آئیں لیکن زندگی کی دو چار ہی بہاریں دیکھنے کے بعد فنا سے ہم آغوش ہو گئیں۔ آج کل تو سستے سینما کی کثرت اور گرم بازاری نے خاص تجارتی ذہنیت رکھنے والے پارسی سیٹھوں کی بھی کمر ہمت توڑ دی ہے۔ بعض سینماؤں میں آخری درجہ کا ٹکٹ صرف ایک آنہ کو فروخت ہوتا ہے۔ اب کونسا تھیٹر ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں ری پرٹری تھیٹر کا کھلنا اور اپنے بل بوتے پر قائم رہنا محال ہے البتہ والیانِ ریاست کی حمایت و سرپرستی ری پرٹری تھیٹر کیلئے مسیحا نفسی کا کام دے سکتی ہے۔

ہندوستان ہی پر کیا موقوف سارے ایشیا میں علوم و فنون کی ترقی شاہی درباروں کے زیر سایہ ہوا کی ہے۔ اکبر جیسے ان پڑھ بادشاہ کا دربار سینکڑوں علما، فضلا اور ماہرینِ فن کا ماوےٰ و ملجا تھا۔ ایک ایک شعر پر شاعروں کے منہ موتیوں سے بھرے جاتے تھے اور بعض سونے میں تولے جاتے تھے۔ بالکل گئے گذرے زمانے میں بھی شاہانِ اودھ اور والیانِ رامپور کی داد و دہش کے قصے آجتک زبان زد خلائق ہیں۔ آج بھی ملک میں بڑے بڑے اُمرا اور والیانِ ریاست کی کمی نہیں لیکن اس زمانہ میں کمال کی قدر کہاں؛ جن اعلےٰ خدمات کے اعتراف میں پہلے جاگیریں عطا ہوتی تھیں اب انکا صلہ حروف تہجی کے ہیر پھیر سے خالی خولی خطاب کی شکل میں ملتا ہے۔ سر اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے ۔۔۔ ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی ۔۔۔ پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا ۔۔۔ اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

بہر حال اگر اُمرا و رؤسا کی جانب سے یا ملک میں اردو کی اصلاح و ترقی کیلئے جو مالدار انجمنیں قائم ہیں ان کی طرف سے ڈراما نویسی کے لئے بیش قرار انعامات مقرر کئے جائیں تو ممکن ہے کہ مشاہیر اہلِ قلم کو اچھے ڈرامے لکھنے کی ترغیب ہو۔ آج کل ایسی انجمنیں کسی خاص شخص کا انتخاب کر کے اس سے کسی انگریزی ڈرامے کا ترجمہ کراتی ہیں۔ اس سے مقابلہ و مسابقت کی روح مُردہ ہو جاتی ہے اور کسی کو طبعزاد ادبی کارنامہ پیش کرنے کی تحریک نہیں ہوتی لیکن ری پرٹری تھیئٹر کے قیام کے لئے تو والیانِ ریاست کی مربیانہ توجہ ضروری امر ہے۔ جس طرح فرزندانِ قوم کی تعلیم و تربیت کیلئے اسکول اور کالج قائم کئے جاتے ہیں جہاں فیس کی آمدنی کسی شمار میں نہیں ہوتی اسی طرح فنِ ڈراما کی ترقی اور عوام کے مذاق کی اصلاح کیلئے ری پرٹری تھیئٹر کھولنے کی ضرورت ہے۔ جب پبلک میں بااصول و بلند پایہ ڈرامے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو ریپرٹری تھیئٹر خود کفالتی بن جائیں گے۔ اور جب اعلیٰ درجہ کے ڈراموں کی مانگ ہو گی تو رسد کا انتظام بھی ہو جائیگا اور مصنفین بھی پیدا ہونے لگیں گے۔ ریپرٹری تھیئٹروں کی تعداد بڑھنے اور عوام کا مذاق سُدھرنے پر بڑی بڑی تجارتی تھیئٹریکل کمپنیوں کو بھی لامحالہ اپنی روش بدلنی اور اپنا معیار بلند کرنا پڑیگا۔ اور اُن کی موجودہ بدعنوانیاں اور بے اعتدالیاں رفتہ رفتہ دُور ہو جائیں گی۔ جب ڈراما ادبیات کی اہم شاخ ہے اور اُردو زبان میں اس کا سرمایہ اس قدر حقیر ہے تو اردو کی اصلاحی انجمنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ری پرٹری تھیئٹر کے قیام اور بلند پایہ ڈرامے کی تصنیف کے لئے والیانِ ریاست سے امداد کی مناسب پیرایہ میں اپیل کریں۔ انفرادی درخواست سے اجتماعی اپیل زیادہ وزن رکھتی ہے۔

لیکن جس کام کے ساتھ روپیہ پیسہ کی حرص وابستہ ہو اس میں وہ جوش وہ گرمی وہ خلوص کہاں جو اس کام میں پایا جاتا ہے جسے انسان بلامعاوضہ محض رضاکارانہ حیثیت سے شوقیہ انجام دے۔ مانا کہ ری پرٹری تھیئٹروں کی توجہ حصولِ زر کی طرف کم اور اصلاح کی جانب زیادہ مبذول ہے تاہم کچھ نہ کچھ حرص و آز تو وہ ضرور رکھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑھ بڑھ کر پیشہ ور بڑی کمپنیوں کے ہم پایہ بن جائیں لیکن امیچور ڈرامائی کلبوں کے قیام کا محرک محض فنِ ڈراما کا پاکیزہ ذوق ہے۔ انگلستان میں امیچور سوسائٹیوں کا ہر طرف جال پھیلا ہوا ہے جس میں بچے اور جوان سب شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ یہ تمام سوسائٹیاں ایک اعلیٰ تنظیم کے تحت کام کر رہی ہیں۔ سب کا تعلق ایک مرکزی ڈراما لیگ سے ہے۔ اور اس مرکزی لیگ کے تحت مقامی انجمنیں قائم ہیں جو اپنی ملحقہ امیچور کلبوں کو ہدایت و مشورہ دیتی اور مقابلہ کیلئے سالانہ انعامات عطا کرتی ہیں۔ دیہاتوں میں بھی شوقیہ ڈرامائی سوسائٹیاں نہایت مفید کام انجام دے رہی ہیں سنہ ۱۹۳۰ء میں سات ہزار مواضع کے امیچور کلبوں نے اپنے اپنے ضلع کی انجمنوں سے

لباس، پردہ اور ڈراما کی کتابوں کی فراہمی کے لئے درخواستیں پیش کی تھیں۔ اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو فن ڈراما سے کتنا شوق ہے۔ وہاں کے بورڈ آف ایجوکیشن (مجلس تعلیمات) نے امیچیور ڈرامائی کلبوں کو تعلیم بالغان کا اہم ذریعہ تسلیم کیا ہے۔ جو ڈرامے امیچیور کلبوں میں ایکٹ کئے جاتے ہیں وہ تجارتی تھیئٹروں کے ڈراموں سے کہیں اعلیٰ، پاکیزہ اور سبق آموز ہوتے ہیں ممکن ہے کہ امیچیور کلب کے نوعمر ممبروں کو پیشہ ور ایکٹروں کا سا تجربہ اور فنی مہارت حاصل نہ ہو لیکن اس کمی کی تلافی ان کے سچے شوق اور خلوص سے ہو جاتی ہے۔ نقادانِ فن کی رائے ہے کہ انگلستان میں ڈرامے کی نجات کا باعث نوجوانوں کے شوقیہ کلب ہیں۔

اُردو ڈراما کی اصلاح و ترقی بھی نوجوانوں ہی کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ ریپرٹری تھیئٹر قائم بھی ہو تو اسے امراء و رؤسا کا دست نگر ہونا پڑے گا لیکن پرجوش نوجوانوں کی غیرت کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی۔ ان کو صرف اپنی ہمت اور ذوقِ عمل پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ انگلستان کی طرح ہندوستان کے قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں تو امیچیور سوسائٹیوں کا قائم ہونا مشکل ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں میں ڈرامے کا صحیح مذاق پیدا ہونے لگا ہے۔ مدرسے میں مختلف جلسوں کے موقعوں پر لڑکے ڈرامے کی نمائش کرتے ہیں اور بعض کالجوں میں تو مستقل طور پر ڈرامائی کلب قائم ہو چکے ہیں۔ بعض مشاہیر اہلِ قلم نے طالب علموں کے مذاق و دلچسپی کے مطابق چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی تصنیف کئے ہیں۔ جن سے اُردو ادبیات میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے لیکن اسکولوں اور کالجوں کے ڈرامائی کلب سے کہیں زیادہ اہم اور ٹھوس کام وہ امیچیور ڈرامائی سوسائٹیاں انجام دے رہی ہیں جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، لاہور، حیدرآباد وغیرہ میں قائم ہو گئی ہیں اور جن میں کالج کے طلبہ کے علاوہ نوجوان پرجوش گریجویٹ، پروفیسر، ایڈیٹر، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ بھی بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں۔

ان اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی حمایت ڈرامے کیلئے آیۂ رحمت ہے۔ ہمارے ثقاہت پسند اصحاب جو ایکٹنگ کو ڈوم ڈھاڑیوں سے منسوب کر کے ڈرامے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اب اُن کی ذہنیت بدل گئی ہے۔ اداکاری اور ڈرامہ ایسی دو لطیف فنون لطیفہ میں شامل ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ملک کے موقر رسائل و جرائد بھی جو پہلے ڈرامے کے متعلق مضمون شائع کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اب صفحے کے صفحے ناٹکی مسائل پر بحث کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ بعض تو خاص ڈراما نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سب باتیں ڈرامے کی آئندہ ترقی کیلئے نیک فال ہیں۔ لیکن ابھی امیچیور (شوقیہ) ڈرامائی سوسائٹیوں کی تعداد اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ شہر اور قصبہ میں امیچیور کلب قائم کئے جائیں۔ ان کی وسیع پیمانہ پر تنظیم ہو اور وہ کسی مرکزی ڈرامائی لیگ سے ملحق یا منسلک کر دیئے جائیں جہاں سے عام ہدایتیں اور مشورے حاصل کئے جا سکیں۔ اب تک جو امیچیور ڈرامائی سوسائٹیاں معرضِ وجود میں آئی ہیں وہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ پر مشتمل ہیں اسلئے ان کو صرف خاصہ کی چیزیں مرغوب ہیں۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ انگلستان کے دیہات میں بھی بیشمار شوقیہ ڈرامائی سوسائٹیاں قائم ہو چکی ہیں جن میں عوام کے سادہ جذبات اور معصومانہ دلچسپیوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے

ہمارے ہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو بھی اپنی اشرافیہ (ارسٹوکریٹک) تحریک کو عمومیہ (ڈیموکریٹک) تحریک میں تبدیل کرنا چاہئے اور ایسی روش اختیار کرنی چاہئے کہ ڈرامے کے ذریعے پبلک کی تلقین و تبلیغ اور ان کے مذاق و اخلاق کی اصلاح کا مقصد فوت نہ ہونے پائے۔

ہمارے ہاں کی امیچیور ڈرامائی سوسائٹیوں کے قیام سے فن ڈراما اور اداکاری کی قدر و منزلت تو ضرور بڑھی لیکن اُردو میں کسی بلند پایہ ناٹکی تصنیف کا اضافہ نہیں ہُوا، جو کلاسیکل ڈراموں کی ٹکر کی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ امیچیور ڈرامائی کلبوں یا سوسائٹیوں کے گریجوئیٹ اور پوسٹ گریجوئیٹ (طیلسانی و مافوق طیلسانی) اراکین کے سر میں یورپ کی کورانہ تقلید کا سودا سمایا ہُوا ہے۔ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی دو قسم کے امیچیور کلب ہیں۔ ایک وہ جن کا مقصد محض تفریح و تفنن کا سامان پیدا کرنا ہے۔ یہ مقصد تو انگریزی زبان کے ڈراموں کی تمثیل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعض اسکولوں، کالجوں اور امیچیور کلبوں میں صرف انگریزی ڈرامے یا اُنکے بعض سین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ اِن سے کوئی ادبی مقصد پُورا نہیں ہو سکتا۔ دوسری قسم کے وہ امیچیور کلب ہیں جو اصلاحی مقصد پیش نظر رکھتے ہیں اور بلند پایہ تصانیف و تراجم کے ذریعے اُردو ادبیات کا دامن وسیع کرنا چاہتے ہیں لیکن اب تک اِن کلبوں کے مشاہیر اہل قلم نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے چند مشہور مغربی ڈراموں کے لفظی ترجمے پیش کیے ہیں یا جن تصنیفات کو طبعزاد بتایا جاتا ہے اِن میں اِبسن اور اس کے نامور پیروؤں کے ڈراموں کا چربہ اُتارا گیا ہے لیکن خشک نثری ترجموں یا چربوں سے اُردو ڈرامے کی اصلاح و ترقی کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ نظمی ڈراما یا نثری ڈراما زیادہ مؤثر و کامیاب ہو سکتا ہے۔ دُنیا کے وہ تمام ڈرامے جن کا شمار کلاسکس (ادب العالیہ) میں ہوتا ہے اور جن کو گرم و سرد زمانہ دیکھنے کے بعد اب تک شہرت و مقبولیت حاصل ہے وہ یا تو سر بسر نظم میں لکھے گئے ہیں یا اِن میں نظم و نثر کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ بالکل نثری ڈرامائی پیداوار ہنرک اِبسن اور اس کے پیرؤوں کی بدعت اور قدیم روایات سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ علاوہ بریں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز بلادِ مغرب میں کامیاب ہو اسے ہندوستان کی فضا بھی راس آئے۔

مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق۔ مذہبی خیالات، سیاسی واقعات، معاشرتی رسوم، مجلسی آداب، اقتصادی حالات، قومی روایات کے لحاظ سے مغرب اور مشرق کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ یورپی ڈراموں کا ہو بہو ترجمہ یا ان کا چربہ صرف انہیں چند اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے جنہوں نے اپنے مشرقی شعار ترک کر کے بالکل مغربی وضع کی پابندی اختیار کر لی ہے۔ ورنہ ایک ملک کا ادبی شاہکار بغیر مناسب ترمیم و تصرف کے اجنبی ملک میں جاذب توجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب لندن کے لیرک تھیئٹر میں سنسکرت کے مشہور ناٹک مرچھ کٹک کا ترجمہ اسٹیج کیا گیا تو وہ بالکل ناکام اور بے لطف ثابت ہُوا۔ اسی طرح ہندوستانی اسٹیج پر ہنرک اِبسن یا برنارڈ شا، میٹرلنک یا گالزوردی کے ترجموں کی نمائش یقیناً بالکل بے لطف اور بے مزہ معلوم ہو گی۔ آغا حشر، مرزا نظیر بیگ اور احسن وغیرہ نے مشرقی حالات اور مذاق کو پیش نظر رکھ کر شیکسپیئر کے ڈراموں میں جو رد و بدل، ترمیم و تبدیلی، کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت سے کام لیا ہے وہ بالکل درست عمل ہے۔ اِن پر اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کیوں تصرفات سے کام لیا بلکہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان میں اتنی قابلیت اور اہلیت تھی کہ وہ شیکسپیئر کی ادبی

خوبیوں، فنی باریکیوں، خیالات کی نزاکتوں، جذبات کی لطافتوں، فلسفۂ حیات کے رموز، معاملاتِ زندگی کے نکات اور کردار نگاری کے کمالات کو اُردو میں نبا سکتے۔ علاوہ بریں انھوں نے عوام کے پست مذاق کی رعایت سے اپنی تالیفات میں ایسی مبتذل اور سوقیانہ مسخرگی کو راہ دی جس کے ڈانڈے عریانی اور فحاشی سے جا ملے اور جس نے شکسپیر کے ڈرامے کی وقعت کھو دی۔ ہمارے اعلیٰ تعلیمیافتہ حامیانِ ڈراما کو چاہئے کہ وہ یورپ کے باکمال ادیبوں کے اصلاحی خیالات سے استفادہ ضرور کریں لیکن ان کے ڈراموں کا خشک نثری ترجمہ پیش کرنے یا ان کا چربہ اُتارنے کے بجائے مشرقی خیالات و رجحانات کے تحت ان میں مناسب ترمیم و اضافہ کریں، حسب موقع تصرفات سے کام لیں اور ان کو ایسا اپنائیں کہ مغائرت و اجنبیت کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔

بعض حضرات ڈرامے میں اشعار، نظم، گانے، زوردار مقفیٰ عبارت اور مبالغہ کے استعمال کو غیر فطری اور خلاف حقیقت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی ملک کے لوگ نظم یا مقفیٰ عبارت میں گفتگو نہیں کرتے۔ ڈراما مکالمہ پر مبنی ہوتا ہے اور مکالمہ کا فطری ذریعہ نثر ہے۔ اس لئے ڈرامے نثر میں لکھے جانے چاہئیں۔ یہ محض صدائے بازگشت ہے ابسن کے قول کی جو حقیقت و واقعیت کا حامی اور نثری ڈرامے کا موجد تھا۔ آج تمام مغربی ممالک میں ابسن کی پیروی کی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں کے بعض اہلِ قلم بھی اپنے ملکی حالات اور قومی خصائص کو پس پشت ڈال کر یورپ کی کورانہ تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جس پر تفصیلی بحث ایک علیحدہ بسیط مضمون کی متقاضی ہے انشاءاللہ کسی دوسری صحبت میں اس پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف چند باتیں مختصراً بیان کر دی جاتی ہیں۔

ڈراما آرٹ ہے لیکن محض قدرتی اشیاء کی نقالی یا عکسی تصویر کا نام آرٹ نہیں ہے۔ خود محسوس کرنا اور بات ہے اور دوسروں کو محسوس کرانا اور بات۔ نجی معاملات میں ہم خوشی کے موقع پر ہنستے اور غم کے موقع پر روتے ہیں۔ اس وقت یہ خیال نہیں آتا کہ ہمیں اس سے زیادہ ہنسنا یا رونا چاہئے تھا۔ لیکن جب دوسروں کو اپنا سُکھ یا دُکھ دکھانا اور اس میں ان کو بھی شریک کرنا مقصود ہو تو جذبات کے معمولی طرزِ اظہار سے کام نہیں چل سکتا اور مبالغہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو چیز دُور سے دکھائی ہو اسے بڑا کر کے دکھانا پڑتا ہے۔ اسکو سچائی ہی کی وجہ سے بڑا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ جس پیمانہ پر جو چیز چھوٹی نظر آتی ہے اسی قدر وہ اصلیت اور واقعیت سے دُور ہو جاتی ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان صرف فاصلہ کی دوری نہیں بلکہ معنوی دُوری بھی ہوتی ہے۔ ایک شخص کا دُکھ سُکھ اس کے لئے بے پردہ ہے لیکن اوروں کے لئے نہیں۔ دوسرے اس سے معذور ہیں۔ اس دُوری کے تناسب سے اپنے خیالات و جذبات کو دوسروں کے آگے بڑھا کر بیان کرنا پڑتا ہے۔ یہ بناوٹ نہیں بلکہ تکمیلِ حقیقت کا تقاضا ہے۔ خانگی معاملات پر گفتگو کرتے وقت نہ چیخنے چلّانے کی اور نہ بھاؤ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسٹیج پر ایکٹر وہی بولی اسی انداز سے بولیں جیسے گھر پر بولتے ہیں تو ساری ڈرامائیت خاک میں مل جائے گی۔ مجمع کو متاثر کرنے کیلئے ڈراما نویس کو نہ صرف مبالغہ سے کام لینا پڑتا ہے بلکہ موزوں و مقفیٰ زبان کی مختلف نزاکتوں اور ہم آہنگیوں کا بھی سہارا لینے کی ضرورت عاید ہوتی ہے۔ علاوہ بریں نظم میں نثر سے کہیں زیادہ لطف و دلکشی پائی جاتی ہے۔ ایکٹروں کو اپنا پارٹ

یاد کرنے میں سہولت ہوتی ہے اور اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ اگرچہ معمولی خیالات نثر میں عمدگی کے ساتھ ظاہر کئے جا سکتے ہیں لیکن عمیق الطیف و شدید جذبات کی ترجمانی کا بہترین ذریعہ نظم ہے۔ "نٹ شاستر" کے مصنف بھرت منی نے ناٹک کو شاعری و موسیقی کی اہم صنف قرار دیا ہے۔ شاعری کی دو قسمیں ہیں درشیا سنگیت یعنی بصری نغمہ اور سرویا سنگیت یعنی سمعی نغمہ۔ چونکہ ڈرامے کا کھیل یا نمائش آنکھ سے دیکھنے کی چیز ہے اسلئے اس فن کا شمار درشیا سنگیت یعنی بصری شاعری میں ہوتا ہے۔ غرضکہ ڈرامے کا تعلق نثر سے نہیں بلکہ نظم یا شاعری سے ہے۔ نثری ڈرامہ بیسویں صدی کی بدعت ہے۔ جب لذائذ و نعائم کی کثرت سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو سادہ غذا مرغوب خاطر ہوتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُبالی کھچڑی کو پلاؤ قلیہ پر تفوق حاصل ہے۔ یورپ جدت اور تنوع کا دلدادہ ہے۔ وہاں قدیم روایات و رسمیات سے بغاوت کی ہوا چلی ہوئی ہے۔ اسی مخالفت کے جذبہ کے تحت وہاں خشک نثری ڈراموں کی آؤ بھگت ہوئی لیکن اہل ہند کی قدامت پسندی لوروا کا بر پرستی ادبی بغاوت کی اجازت نہیں دیتی۔ اردو میں کلاسیکل (معیاری) ڈرامے ہیں کہاں کہ کلاسیت اور قدامت کے خلاف یہاں بھی رومانیت، فطرت اور واقعیت کی تحریکیں رائج کی جائیں۔

ممکن ہے کہ یورپ میں مادی انہماک اور کاروباری ممارست کی وجہ سے نغمہ کا ذوق کم ہو گیا ہو لیکن ہندی ذہنیت شاعری و موسیقی کی اس قدر دلدادہ ہے کہ وہ کبھی خشک نثری ڈرامے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ پروفیسر ای۔ جے ڈنٹ اپنی عالمانہ کتاب "فاؤنڈیشن آف انگلش اوپیرا" (انگریزی اوپیرا کی بنیاد) میں شکسپیر کے گیتوں پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ کسی غیر ملک کے ڈرامے کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت اپنے قومی خصائص کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اسٹیج پر کسی بدیسی ڈرامے کا محض ترجمہ خواہ وہ کیسا ہی سلیس اور با محاورہ کیوں نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ عوام کے فطری رجحانات اور ذہنی خصوصیات کے مطابق اس میں تصرف کیا جائے۔ گیتوں کی مثال لے لو۔ ہر قوم کو نغمہ و موسیقی سے لطف حاصل ہوتا ہے اسلئے شکسپیر نے تماشائیوں کی دلچسپی کیلئے اپنے ڈراموں میں جا بجا گیت استعمال کئے ہیں۔ لیکن ڈرامے کے ممتاز اشخاص گیت نہیں گا سکتے۔ اہل انگلستان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ کوئی متین اور سنجیدہ شخص گا گا کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شریف آدمی برثبات ہوش اسٹیج پر گانے لگے تو یہ منظر بالکل غیر فطری اور مضحکہ خیز معلوم ہوگا لیکن پبلک کو محظوظ کرنے کے لئے گانے کے مواقع پیدا کرنا ڈرامہ نویس کے فرائض میں داخل تھا۔ لہذا شکسپیر کو محض عوام کے لطف و دلچسپی کی خاطر عجیب و غریب کردار پیدا کرنے پڑے۔ کوئی کردار دیوانگی کی حالت میں، کوئی نشہ کے عالم میں، کوئی مسخرگی سے گانے گاتا ہوا پایا جاتا ہے۔ کبھی کوئی پری گانے کے لئے اسٹیج پر نمودار ہوتی ہے اور کبھی ایریل (Ariel) جیسی مافوق البشر مخلوق سے گانے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب بکھیڑا گ صرف اسلئے ہے کہ کسی ثقہ آدمی کا اسٹیج پر گانا انگریزی ذہنیت کے منافی ہے۔

لیکن نغمہ و موسیقی کے متعلق ہندی ذہنیت ٹھیک اسکے برعکس ہے۔ ہندوستانی اسٹیج پر اگر کوئی متین و شریف کردار مکالمہ کے ضمن میں یکایک گانے لگے تو اہل ہند کے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ ہندی ذہنیت اطالوی ذہنیت سے ملتی جلتی ہے۔ اہل ہند کی طرح اطالیہ کے لوگ بھی نغمہ و موسیقی کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ دونوں

زمین نظم یا شاعری کو صرف اظہارِ خیال کا ایک اثر آفرینی کا فطری ذریعہ تصور کرتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نغمہ سے جذبات میں تیزی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک مجمع کو محظوظ و متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ نظم یا گانا ہے۔ الغرض مسٹر ڈونٹ کی رائے صحیح ہے کہ ہندوستانی اسٹیج پر گانے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو ڈراما نظم سے معرا ہو وہ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

محض ہنرک ابسن اور اس کے پیروؤں کی کورانہ تقلید میں اپنے قومی شعائر، ملکی روایات اور معاشری رجحانات کو پس پشت ڈال کر وزن اور قافیہ کو بیکار سمجھنا، نظم اور گانے کو خیرباد کہنا اور روکھی پھیکی نثر میں ڈرامے لکھنا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے۔ مسٹر ای۔ جے ڈونٹ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ نفسِ واقعہ یہ ہے کہ انگلستان میں مکالمی ڈراما اس قدر ترقی کر چکا تھا اور وہاں کے لوگ ڈرامائی کرداروں کو نثر میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھنے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ وہ نغمہ و موسیقی کو اظہارِ خیال اور اشتعالِ جذبات کا ضروری آلہ تسلیم نہیں کر سکتے تھے لیکن قدیم سنسکرت ڈراموں میں نازک و لطیف جذبات کی ترجمانی ہمیشہ اشعار کے ذریعے کی جاتی تھی۔ جو لَے کے ساتھ گائے جاتے تھے۔ موسیقی کی یہ رسم قرونِ وسطیٰ میں بھی قائم رہی۔ مغل دربار نے بھی نغمہ و شاعری کی خوب قدر دانی کی۔ غرضکہ شاعری اور نغمہ کا ذوق اہلِ ہند کو ہزاروں سال سے نسلاً بعد نسل وراثتاً منتقل ہوتا رہا ہے۔ یہ لَے اب ان کے کانوں کو ایسی رچ گئی ہے کہ نثری ڈراما ہی جسے مغربی تحریک کی تقلید میں حقیقت و اصلیت پر مبنی تصور کیا جاتا ہے ان کو اجنبی، ناما‌نوس، غیر فطری اور غیر حقیقی معلوم ہوگا۔ اسلئے ضرورت ہے کہ موجودہ امیچیور سوسائٹیاں جو ڈرامے تیار کرائیں ان میں اپنے قومی خصائص، ملکی روایات اور معاشری میلانات کا لحاظ رکھیں۔ ڈراما نویس کو فنی اصول و ضوابط اور اداکاری کے نکات اور اسٹیج کی اصلاحات و ضروریات سے واقف ہونے کے علاوہ ایک زبردست شاعر بھی ہونا چاہئے۔ دنیا کے تمام نامور ڈراما نویس اعلےٰ درجے کے شاعر بھی ہوئے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پورا ڈراما ازابتدائے بسم اللہ تا تمام تحت نظم میں ہو۔ معمولی خیالات کا اظہار نثر ہی میں ہونا چاہئے۔ نوکروں اور ماتحتوں کو حکم دینا ہو تو سادہ نثر ہی میں بولنا چاہئے۔ مکالمہ کو البتہ زوردار، فصیح اور متوازن ہونا چاہئے۔ اگر قافیہ پر بھی قربان نہ ہو تو مقفیٰ عبارت کا استعمال زیادہ پُر لطف، شاندار اور مؤثر ثابت ہوگا۔ گہرے، شدید یا نازک و لطیف جذبات کے اظہار کا تو بہترین ذریعہ نظم ہی ہے۔ اگر کہیں کہیں ہندی دھنوں کے گانوں کو بھی جگہ دی جائے تو یہ مزید لطف و دلچسپی کا باعث ہوگا اور اردو شاعری کے دامن میں وسعت و کشادگی پیدا ہوگی۔ انگریزی کے بہتیرے ڈرامے بلینک ورس میں لکھے گئے ہیں۔ اردو میں تقلیداً نظم معرا کا استعمال کبھی مفید و مؤثر ثابت نہ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے باکمال شعراء ڈراما نویسی کی طرف متوجہ ہوں۔ ادب و زبان کی یہ بہترین خدمت ہوگی۔ ہماری زبان کے مشاہیر نثر نگار اس میدان میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں لیکن اردو ڈراما ان سے زیادہ اساتذۂ سخن کی کرم فرمائیوں کا محتاج ہے۔

محمد حسین ادیب

(۱)

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ — مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

ہر ایک سانس ہے گو صد ہزار خنجر بدوش — مگر پیامِ ثبات و قرار ہیں ہم لوگ

جلال چھو نہیں سکتا ہے باد و باراں کا — وہ دستِ غیب کے نقش و نگار ہیں ہم لوگ

زمیں سے کرتے ہیں ناز اور آسماں سے غرور — وہ کبرِ دوست کے آئینہ دار ہیں ہم لوگ

عیاں ہیں جن پہ تہی دستیاں سلاطیں کی — لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ

جہاں میں ہیں مگر اہلِ جہاں سے کام نہیں — وطن میں رہ کے غریب الدیار ہیں ہم لوگ

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار ہمیں — مثالِ جوئے رواں بیقرار ہیں ہم لوگ

جوانیوں کو ملی ہے ہمیں سے نعمتِ ناز — وہ رازِ طرۂ زلفِ نگار ہیں ہم لوگ

(۲)

فسردۂ غمِ ہستی سے کھینچتے ہیں شراب — بساطِ عیش پہ وہ بادہ خوار ہیں ہم لوگ

چمن میں سنتے ہیں ہر صبح نغمۂ الہام
امینِ زمزمۂ شاخسار ہیں ہم لوگ

جگر ہے وقت کا اپنی جناب میں صد چاک
وہ فاتحِ غمِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

حیات و موت کی پست و بلند راہوں میں
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار ہیں ہم لوگ

نفس میں سنتے ہیں آہٹ کسی کے قدموں کی
نہ پوچھ کیوں ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ

وہ جبرِ دوست جسے اختیار کہتے ہیں
اس اختیار سے بے اختیار ہیں ہم لوگ

محیطِ سکۂ مقلوب کے تلاطم میں
سفینۂ زرِ کامل عیار ہیں ہم لوگ

حیات کی ابدی رات کے اندھیرے میں
چراغِ عابدِ شب زندہ دار ہیں ہم لوگ

بجھے پڑے ہیں زمانے کے ہات سے ہر چند
مگر پیمبرِ برق و شرار ہیں ہم لوگ

ادب سے آؤ ہمارے حضور، اہلِ نظر
جہانِ حسن کے پروردگار ہیں ہم لوگ

نگاہ روبرو اے روحِ نعمتِ دارین
بہوش باش، کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

بس اس خطا پہ کہ ہیں محرمِ رموزِ حیات
شکارِ کشمکشِ روزگار ہیں ہم لوگ

خزاں کی سرخ شعاعوں کے نیل پر اے جوش
نگاہِ خالقِ ابرِ بہار ہیں ہم لوگ

(جوش ملیح آبادی)

رشتہ دار

حاجی صاحب کی باتیں سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ مگر آج کل مجھ سے وہ کچھ ناراض ہیں کسی کمبخت نے انہیں بہکا دیا ہے کہ میں اخباروں میں مضمون لکھتا ہوں۔ قسمیں کھائیں کہ جو کبھی کسی اخبار میں کوئی بات لکھی ہو تو مُنہ کالا ہو مگر حاجی صاحب کو یقین نہیں آتا۔ ڈرتے ڈرتے میری زبان سے یہ نکلا کہ حاجی صاحب کبھی کبھی کسی رسالے میں ایک آدھ چیز میری شائع ہو جاتی ہے لیکن وہ بھی مہینوں ایڈیٹر صاحب کی منّت خوشامد کرنے کے بعد۔ مگر حاجی صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ فرمانے لگے "اخبار اور رسالے میں کیا فرق ہے؟ اخبار روز کا روز جھوٹ بولتا ہے اور رسالہ مہینے بھر کا جھوٹ ایک ہی دفعہ لکھ ڈالتا ہے۔ اَلعنت اللہ علی الکاذبین۔"

"لعنۃ اللہ" حاجی صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ ہاں مگر پہلے یہ تو بتا دوں کہ حاجی صاحب ہیں کون؟ ہماری گلی میں حاجی جی کی مسجد مشہور ہے اور حاجی صاحب کا گھر اسی مسجد کے پہلو میں ہے۔ سینکڑوں سال کی پرانی چھوٹی سی مسجد ہے اور اب حاجی صاحب ہی اس مسجد اور مکان کے مالک ہیں۔ نہایت باوضع ایماندار بزرگ ہیں۔ اہلِ محلہ کو مسئلے مسائل نہایت شوق سے سکھاتے ہیں۔ مجھ سے ایک گونہ انس بھی ہے کیونکہ میری بسم اللہ انہیں نے کرائی اور والد مرحوم کی خاطر وہ اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کہتے کہ "انگریزی پڑھ کر کافر ہو گئے ہو"۔ غالباً حاجی صاحب کے والد بزرگوار حاجی تھے مگر اہلِ محلہ جس طرح نواب کے بیٹے کو بھی نواب کہتے ہیں اسی طرح تبرکاً حاجی صاحب کے والد کا اعزاز ان کی طرف شروع سے منسوب ہے۔ ایک دن شرارت سے میں نے پوچھا کہ حاجی صاحب کیا یہ بزرگوں کا قول ہے یا یونہی غلط العام ہے۔ فرمانے لگے کونسی بات؟ میں نے عرض کیا

فاعتبروا یا اولی الاشکام

پہلے تو کچھ چکرائے پھر سمجھ گئے اور فرمانے لگے "مردود! تو مسخرے سے باز نہیں آتا"۔ اس پر تو مجھے بھی غصّہ آیا۔

میں ۔ حاجی صاحب آپ ہی نے پڑھایا تھا کہ صنم کی جمع اصنام ہیں سو نے شکم کی جمع اشکام کر کے فاعتبروا یا اولی الابصار کی جگہ فاعتبروا یا اولی الاشکام کہہ دیا۔ آنکھوں والے کم ہیں موٹے پیٹ والے بہت ہیں۔ کیا بڑی بات ہوئی اگر الغرض خواہ مخواہ معتبر کو اولوالاشکام کہہ دیا۔

حاجی صاحب ۔ چپ رہو مردود۔ حیوان شیطان۔

میں ۔ قبلہ میں تو مسئلہ پوچھنے آیا تھا اب آپ کے ہاں نہیں آؤں گا۔

حاجی صاحب۔ (ذرا معتدل ہوکر) نہیں نہیں تم مسئلہ ضرور پوچھو۔

میں۔ کیا گالی دینے سے زبان پلید ہوتی ہے؟

حاجی صاحب۔ زبان بھی پلید ہوتی ہے دل بھی پلید ہوتا ہے۔ یہ مشہور مسئلہ ہے تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں!

میں۔ اچھا تو مجھے سالے کی عربی بتا دیجئے!

حاجی صاحب۔ کیوں؟

میں۔ حاجی صاحب وہ جو چھجو لو کا بیٹا اب اپنے آپ کو ذوالقدر علی اندرابی کہتا ہے اسے کہنا چاہتا ہوں کہ تو کہاں کا بڑا ارانی خاں کا سالا ہے مگر عربی میں کہنا چاہتا ہوں تاکہ زبان پلید ہو تو عربی میں ہو۔

حاجی صاحب۔ لعنتہ اللہ۔ تم عربی بھی سیکھتے ہو تو گالی دینے کے لئے۔ تم قطعی کافر ہو۔

میں۔ اچھا غلطی ہوئی معاف کیجئے۔ رشتہ داروں کے متعلق شرع شریف کا حکم مجھ پر واضح کر دیجئے۔

اس میری درخواست پر حاجی صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور نہایت وضاحت سے آدھ گھنٹہ اُنھوں نے وصیت اور ہبہ کے متعلق احکام کی تشریح کی۔ پھر جو میں نے عرض کیا کہ حضرت نہ میں مر رہا ہوں نہ جائداد بانٹ رہا ہوں۔ مجھے تو وہ احکام ذہن نشین کرا دیجئے جو روزمرہ کی زندگی میں سُود مند ہوں تو حاجی صاحب بگڑ کر بولے۔

حاجی صاحب۔ "سود مند! سود مند!" تم سے سو دفعہ کہا ہے کہ سود کے لفظ سے بھی اجتناب کرو۔ "مفید" کہو۔

میں۔ بہت اچھا قبلہ مفید ہی سہی مگر۔ . . .

حاجی صاحب۔ اب بیچ میں مت بولو۔ پوری توجہ سے سنو۔

حاجی صاحب نے آدھ گھنٹہ میں اس مشکل مضمون پر وہ وہ روشنی ڈالی کہ میں نے عہد کیا کہ گھر پہنچتے ہی اپنی ڈائری میں اس تقریر کا لب لباب لکھ لونگا۔ چنانچہ جو کچھ اس دن کی ڈائری میں (اس کو عرصہ ہوا) لکھا تھا وہ نقل کرتا ہوں۔

شرع شریف میں رشتہ دار نہیں ہوتے۔ صرف اقربا و یتامےٰ و مساکین ہوتے ہیں۔ اقربا وہ ہوتے ہیں جو دُور رہنے پر، دُور رکھے جانے پر بھی دکھ دیتے ہیں اور توقعات رکھتے ہیں۔ یتامےٰ وہ ہوتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا مگر بعض اقربا بھی یتامےٰ کی مد میں گھس سکتے ہیں۔ مساکین وہ ہوتے ہیں جو چلتے پھرتے ہوں مگر جنہیں کوئی نہ جانے۔ مساکین کو روٹی دینا فرض اولیٰ ہے۔ یتامےٰ کو کپڑا دینا کار ثواب ہے۔ اقربا صرف شادی بیاہ یا دکھ درد کے موقع پر یا کسی مقدمے کے دوران میں حملہ کر سکتے ہیں۔ مساکین و یتامیٰ کا حملہ عام ہے۔ اقربا کو اپنے جنانے کے وقت کی اطلاع دینی چاہئے۔ یتامیٰ و مساکین

کو نذر نیاز کے وقت سے باخبر رکھا جائے۔ زکوٰۃ میں اوّل حق یتامے کا ہے پھر مسجد کا یا مسجد کے مساکین کا۔ اگر اقربا میں سے کوئی یتامے ہو تو اس کا حق ہر یتیم انجمن سے فائق ہے۔ عید قرباں پر اقربا کا حق بقدر یک ثلث سب سے فائق ہے۔ کھال مسجد میں جانی چاہئے انجمنیں سب غاصب ہیں۔ جو انجمن کرائے پر واعظ لا سکتی ہے اور ان کی چرب زبانی سے یا شاعروں کی شعر خوانی سے چندہ جمع کر سکتی ہے وہ انجمن ہرگز یتیم کہلانے کی مستحق نہیں۔ کسی مسلمان کا حق نہیں کہ وہ اپنے بھتیجے یا داماد کو متبنےٰ بنا لے۔ یہ مشرکوں کی رسم ہے۔ اسی طرح کسی انجمن یا یونیورسٹی یا کالج کو متبنےٰ بنانا بھی بدعت ہے۔ جائز وارثوں کے حق کا غصب ہے۔ اقربا میں سے قیامت کے دن کوئی کام نہیں آئے گا۔ قیامت سے پہلے بھی کام نہیں آئے گا البتہ خاندانی قبرستان میں ان کے ساتھ رہنا ہوگا اسلئے مروّت اور خلوص کا سلوک ہونا چاہئے۔

.. ..

حاجی صاحب کی ہزاروں باتیں اور یاد ہیں مگر یہ آخری بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اقربا آگے پیچھے قریب ہوں کہ نہ ہوں قبروں میں بہت قریب ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ مر کر ہی گذارہ ہوتا ہے۔

"فلک پیما"

چار شعر

مری حسرتوں کو نہ پامال کرنا — گلستانِ دل میں گذر کرنے والے

گذرگاہ تیری مری سجدہ گہ ہے — صنم خانۂ دل میں گھر کرنے والے

کرم ہے، کرم ہے، کرم ہے یہ تیرا — ستم مجھ پہ شام و سحر کرنے والے

تری بخششوں پر بھروسا ہے مجھکو

مری لغزشوں پر نظر کرنے والے

اعجاز سکندر تاثیر جاویدی

غزل

یہ مانا، دم بخود ہوں خوفِ جاں سے
مگر واقف ہُوں ہر رازِ نہاں سے

طلب ہر حق، مگر لاؤں کہاں سے
کہ باہر ہو حدِ وہم و گماں سے

بہت جائے اماں ڈھونڈی، نہ پائی
ترے تیرِ نگاہِ بے اماں سے

نہ دُنیا کا مجھے رکھا نہ دیں کا
گِلہ ہے تیرے لُطفِ بیکراں سے

ہماری زندگی رنگیں بنی ہے
تو عشقِ گلعذارانِ جہاں سے

جہانِ پیر ابتک نوجواں ہے
تمہارے فیضِ حُسنِ نوجواں سے

ترا داغ افسردہ دل کو زینت
مرا باغ اور پھُولے گا خزاں سے

ہمیں اب درد پہنچاتا ہے راحت
ہمیں اب نفع ہوتا ہے زیاں سے

اب اے صبر و سکوں لے جانے والے!
بتا صبر و سکوں لاؤں کہاں سے

بجا ہے، کمترینِ بندگاں ہُوں
مگر نسبت ہے کِس کے آستاں سے

تعجب ہے، نشانِ راہِ منزل
ملا بھی تو بچھڑ کر کارواں سے

نہ پوچھو، کیوں وفا سے توبہ کر لی
بتنگ آ کر وفائے دوستاں سے

جو اکسیرِ شباب آور ملے گی،
تو خُدامِ درِ پیرِ مُغاں سے

علاجِ گردشِ قسمت ہے ممکن
تو پیہم گردشِ رطلِ گراں سے

خوشا وہ دِن! کہ آزادؔ آپ چھوٹیں
گرفتِ دامِ افکارِ جہاں سے

(حکیم آزاد انصاری)

لوسی

بیرن دروترولی نے مجھ سے کہا اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم بیرن ویلی کے علاقے میں شکار کو چلیں ہیں تو کہتا ہوں ضرور چلو۔ خوب لطف ہو گا۔

میں نے دریافت کیا۔ کون کون چلے گا۔

بیرن نے کہا بس میں اور تم کیونکہ آج کل میں تنہا ہوں اور وہاں کا مکان بھی پرانی طرز کا ہے۔ تمہارے سوائیں اور کسی کو مدعو نہیں کر سکتا۔

میں نے دعوت قبول کر لی۔

سنیچر کے دن ہم ریل گاڑی سے نارمنڈی روانہ ہو گئے اور جونہی الیرسے کے سٹیشن پر گاڑی سے اُترے میری نظر سامنے کھڑی ہوئی چھکڑے کی وضع کی ایک دیہاتی گاڑی پر پڑی۔ اُس میں ایک بہت تیز۔ اور شریر گھوڑا جوتا ہوا تھا اور ایک دراز قد بوڑھا سائیس اُس کے قریب کھڑا تھا۔ بیرن نے چھکڑے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا " دیکھو یہ اپنی دیہاتی گاڑی ہے"۔ سائیس نے جلدی سے اپنا ہاتھ بیرن کی طرف بڑھایا جس کو اُس نے محبت سے اپنے ہاتھ میں لیکر مصافحہ کیا اور پوچھا " کہو اچھے تو رہے"۔

سائیس نے کہا " سب اچھا ہے سرکار"۔

ہم اُس بڑے پہیوں والی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گھوڑے نے کچھ دیر تو شرارت کی۔ پھر جب سرپٹ بھاگا تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے یہ معلوم ہوتا تھا گویا ہم ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ کنکریلی سڑک پر گاڑی خوب اُچھل رہی تھی تختوں پر اُچھلتے اُچھلتے میں تو پریشان ہو گیا سائیس بار بار گھوڑے کو چمکارتا جاتا تھا لیکن وہ اپنی دُھن میں بھاگا جا رہا تھا۔ ہمارے گُٹنے بھی گاڑی میں پیچھے کھڑے ہوا کو سونگھ سونگھ کر شکار کی لَو لگا رہے تھے۔

بیرن نارمنڈی کے نشیب و فراز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف درخت ہی درخت نظر آتے تھے کہیں ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے تو کہیں سیب کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اپنی آڑ میں مکانات کو چھپائے ہوئے تھے۔ جدھر نظر اُٹھ جاتی تھی ایک سُہانا منظر نظر آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بیرن یکبارگی بول اُٹھا " مجھے یہ منظر بہت ہی دلکش معلوم ہوتا ہے"۔

اُس کی رگوں میں نارمن خون بہہ رہا تھا۔ یہ کشیدہ قامت اور تندرست جوان اُس خاندان سے تھا جس کے اکثر کوہی سمندر
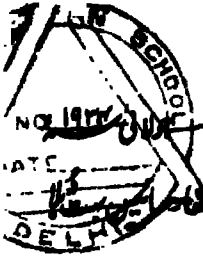
پارسلطنت قائم کرنے جایا کرتے تھے۔ اس کی عمر پچاس سال تھی اور وہ اس دیہاتی سائیس سے تقریباً دس برس چھوٹا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھا اس قدر دُبلا کہ اس کی ہڈی ہڈی نظر آتی تھی عموماً دیہاتی دُبلے پتلے ہی ہوا کرتے ہیں۔

اس پتھریلی اور ناہموار سڑک پر متواتر دو گھنٹے دوڑتے دوڑتے ہم ایک سبزہ زار کو طے کرکے میر دوتروِلی کے قدیم مکان پر پہنچ گئے۔ وہاں ایک بوڑھی ملازمہ کام کر رہی تھی۔ ایک لڑکے نے دوڑ کر گھوڑے کو تھام لیا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے۔ اُس کا وسیع باورچی خانہ دھوئیں سے بالکل کالا ہو رہا تھا۔ چولہے پر پیتل اور چینی کے برتن چمک رہے تھے۔ ایک بلی کرسی پر سو رہی تھی۔ کتا میز کے نیچے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ چاروں طرف سے دودھ اور سیب کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہیں زمین پر شوربا گرا تھا۔ کسی طرف سے زمین اور دھوئیں کی سوندھی خوشبو چل رہی تھی۔

میں وہاں سے اُٹھ کر کھلیان کی طرف چلا گیا۔ سیب کے گھنے درخت پھلوں سے بالکل لدے ہوئے تھے اور پھول چُپ چاپ گھاس پر گر رہے تھے۔

تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ میں بھی گھر لوٹ آیا۔ بیرن بیٹھا اپنے پاؤں سینک رہا تھا اور بوڑھا سائیس دیہات کی کل کیفیت سُنا رہا تھا کہ کہاں بیاہ ہوا ہے۔ کس کے گھر لڑکا ہوا۔ کون سا گوسنی گائے نے بچہ دیا ہے۔ گیہوں کی قیمت کتنی کم ہو گئی ہے۔ جَو کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ناشپاتی کی فصل خراب ہو گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ دیہاتی کھانا بہت لذیذ تھا۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ کھانا کھاتے کھاتے میری توجہ بیرن اور اُس سائیس کی محبت بھری باتوں کی طرف مبذول ہوئی۔

باہر ہوا کے جھونکوں سے درخت جھوم رہے تھے۔ ہمارے کتوں نے اصطبل میں غل مچا رکھا تھا۔ بوڑھی ملازمہ سو گئی تھی۔ اتنے میں سائیس نے دریافت کیا اگر اجازت ہو تو میں جاکر سو رہوں کیونکہ رات کے وقت میں دیر تک نہیں جاگ سکتا۔ بیرن نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر کہا: "ہاں ضرور سو جاؤ" لیکن بیرن کا اس قدر نرمی سے جواب دینا میرے دل میں کھٹکنے لگا۔ سائیس کے جاتے ہی میں اُس سے بغیر پوچھے نہ رہ سکا کہ اس سائیس کا تم پر کوئی بڑا احسان ہے؟

بیرن نے کہا یار اس سے بھی کہیں زیادہ اُس کا احسان ہے جس کے باعث میں اُس کی طرف کھنچا جاتا ہوں۔ اگرچہ بات معمولی ہے لیکن رنجیدہ بہت ہے۔ تم تو جانتے ہو والد سیٹنا میں کرنل تھے۔ یہ اس زمانے میں اُن کا اردلی تھا جب وہ ملازمت سے دستکش ہو گئے تو اس کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئے۔ اُس کی عمر چالیس سال کی تھی اور ہم اُس وقت اپنے دیہات کے بنگلے میں رہتے تھے۔

میری اماں کے پاس لوسی نام کی ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ اتنی خوبصورت لڑکی اب مجھے نظر نہیں آتی جسم ایسا سڈول کہ کیا بیان کیا جائے ویسی لڑکیاں اب کہاں۔ اگر ہوں بھی تو بُری صحبت میں بیٹھ کر جلد خراب ہو جاتی ہیں، اور پھر ریل گاڑیوں کے چل جانے

کی وجہ سے تو اور خرابی ہوگئی ہے کیونکہ اب لڑکیاں خدا سیانی ہوئیں اور شہر کی ہوا کھانے چلی گئیں۔ لہذا اب گھروں کے کام کاج کیلئے وہی بدصورت لڑکیاں رہ گئی ہیں جن کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ درست وہ لڑکی بہت خوبصورت تھی اور مجھے اس سے محبت تھی۔ اگرچہ میں نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا۔

کچھ ایسا ہوا کہ ہمارا یہ نوکر اُس پر بُری طرح لٹو ہوگیا۔ ہم نے بھی دیکھا کہ یہ ہمیشہ کچھ کھویا ہوا سا رہتا ہے اور دل ہی دل میں کچھ سوچتا رہتا ہے۔ والد ہمیشہ اُس سے پوچھا کرتے تھے کیوں زین کیا حال ہے طبیعت تو اچھی ہے؟ یہ کہدیا کرتا تھا سرکار کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔

رفتہ رفتہ وہ کمزور ہوتا گیا بعض دفعہ کھانا کھلاتے وقت اُس کے ہاتھ سے گلاس گر کر چور چور ہو جاتے تھے کبھی طشتریاں پھوٹ جاتی تھیں۔ ہمارا خیال تھا اُس کو کمزوری کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ والد صاحب نے ڈاکٹر کو بتایا۔ اُس نے ریڑھ کی بیماری تشخیص کی۔ والد نے اُس کو شفاخانہ بھیج دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

چنانچہ ایک دن اُس نے کہا۔

حضور!

ہاں زین۔

سرکار میں دوا کھانا نہیں چاہتا۔

ہاں تو پھر؟

میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

والد کو بہت حیرانی ہوئی اور وہ اُس کی طرف پلٹ گئے۔

تم نے کیا کہا؟ کیا؟

مَیں شادی کرنا چاہتا ہوں سرکار۔

شادی! تو تم ــــــــ تم کو کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ کیوں؟

بس سرکار بات تو یہی ہے۔

یہ سنتے ہی والد اس قدر زور سے ہنسنے لگے کہ والدہ بغیر دریافت کئے نہ رہ سکیں کہ اس قدر ہنستے کیوں ہو؟

اُنہوں نے کہا ذرا یہاں آؤ کوکھتران۔ جب وہ اندر آئیں تو اُنہوں نے زین کی محبت کا ذکر کیا۔ والدہ کو ہنسی نہ آئی بلکہ اس سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اُنہوں نے دریافت کیا زین تم کس سے محبت کرتے ہو؟

اُس نے بیدھڑک کہدیا سرکار میں اُسی سے محبت کرتا ہوں۔

والدہ نے کہا تم اطمینان رکھو میں تمہاری شادی کردوں گی۔

اُنہوں نے لُوسی سے دریافت کیا تو اُس نے کہا مجھے زین کی اِس سنک کا پتہ چل چکا ہے اور وہ کئی دفعہ مجھ سے بھی کہہ چکا ہے لیکن کسی وجہ سے میں اُس کو ناپسند کرتی ہوں۔

اِس طرح دو مہینے گذر گئے والد لُوسی پر زور دیتے رہے کہ وہ زین سے شادی کرلے لیکن وہ انکار کرتی رہی۔ اُس نے قسم کھاکر کہا کہ میں کسی سے محبت نہیں کرتی لیکن شادی نہ کرنے کی وجہ میں نہیں بتانا چاہتی ۔ آخر والد کے زیادہ زور دینے سے وہ رضامند ہوگئی اور یہ لوگ اسی مکان میں جہاں ہم بیٹھے ہیں آباد کردیئے گئے۔

کچھ عرصہ بعد یہ میاں بیوی یہاں سے اور کسی جگہ چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ ہُوا یہ کہاں رہے کامل تین سال بعد اطلاع ملی کہ لُوسی قضا کرگئی۔ اس اثنا میں میرے والدین بھی رحلت کرچکے تھے۔ پھر اور دو برس تک میری زین سے ملاقات نہ ہوسکی۔

آخر ایک دن میں نے سوچا کہ اس علاقے میں شکار کھیلنے جانا چاہئے کیونکہ میرے والد کہا کرتے تھے کہ یہاں وافر شکار ہے۔ ایک دن بارش ہورہی تھی کہ میں اسی مکان میں آپہنچا۔ یہاں والد مرحوم کے اس پُرانے اردلی کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب اور رنج ہُوا۔ اُس وقت اُسکی عمر ۵۴ یا ۵۵ سال کی تھی۔

اِس وقت جہاں ہم بیٹھے ہیں میں نے اُسکے ساتھ کھانا کھایا۔ پانی مُوسلا دھار برس رہا تھا چھت دیواروں اور کھڑکیوں پر پڑ رہی تھی۔ اصطبل میں میرا کتا اسی طرح بھونک رہا تھا جیسے اس وقت ہمارے کتوں نے آفت مچا رکھی ہے اور جونہی بوڑھی ملازمہ سونے کے لئے گئی اس نے مجھ سے کہا۔

سرکار

کہو زین

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

کہو ـــــ کہو کیا کہتے ہو؟

کیا کہوں بہت رنج ہوتا ہے۔

آپ کو میری بیوی لُوسی یاد ہے؟

ہاں مجھے یاد ہے۔

اُس نے آپ سے کچھ کہنے کو کہا ہے۔

کیا ـــــ !

آ ـــــ آپ اس کو ایک قسم کا اقبالِ جُرم ہی سمجھئے۔

تو کیا بات ہے؟

میں۔ ــــ میں ــــ تو چاہتا ہوں کہ نہ کہوں لیکن کہنا ہی پڑے گا۔

سرکار وہ کسی بیماری سے نہیں مری بلکہ "ہیرن مرض" نے اُس کو قبر کی آغوش میں سُلا دیا۔ مجھے بھی یہ بعد میں معلوم ہوا۔ وہ جیسے ہی یہاں آئی اُداس رہنے لگی۔ چھ مہینے میں تو یہ حالت ہوگئی کہ بالکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اتنا فرق ہوگیا تھا کہ میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ اس نے دل کی بیماری تشخیص کی۔ سینکڑوں روپے دوا درمن پر صرف کئے لیکن وہ دوا کھاتا ہی نہ چاہتی تھی۔ اُس نے کہا پیارے تم روپیہ فضول خرچ کر رہے ہو۔ اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

میں نے بھی دیکھا کہ ضرور کوئی اندرونی مرض اُس کو گھُن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ وہ اکثر پڑے پڑے رویا کرتی تھی۔ مجھے کچھ سُوجھتا ہی نہ تھا۔ کیا کروں۔ میں نے اُس کے لئے عمدہ عمدہ کپڑے اور سنگار کی اچھی اچھی چیزیں خریدیں کہ کسی طرح تو اس کا دل بہل جائے لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں۔ آخر میں نے سمجھ لیا کہ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتی۔

ایک دن کا ذکر ہے نومبر کی رات تھی اور خوب برفباری ہو رہی تھی۔ تمام دن وہ بستر پر ہی پڑی رہی۔ اُس نے مجھے اپنے قریب بلا کر کہا ایک پادری کو بلا لاؤ۔ میں جا کر بلا لایا۔ جیسے ہی وہ آیا اُس نے کہا "دیکھو زین میں نے تم کو کبھی دھوکا نہیں دیا۔ نہ شادی سے پہلے اور نہ بعد۔ پادری صاحب اس بات سے واقف ہیں اور یہ میرے گواہ ہیں۔ میری موت کی وجہ صرف یہی ہے کہ میں اُس بنگلے سے دُور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ مجھے ہیرن دوترولی سے بہت محبت تھی ــــ بیحد محبت اگرچہ انہیں معلوم نہ تھا ــــ بس یہی مرض مجھے موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔ جب سے میں اُن کے دیدار سے محروم ہوئی اُسی وقت سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب زندگی دشوار ہے۔ اگر اُن کا دیدار ہوتا تو ممکن تھا بچ جاتی۔ بس ایک بار اُن کو نظر بھر کر دیکھنے کی تمنا باقی ہے۔ میرے بعد تم اُن سے کہدینا۔ دیکھو ضرور کہنا۔ میری قسم کھاؤ کہ کہہ دو گے۔ اچھا تو پادری صاحب کے سامنے قسم کھاؤ۔ اگر اُن کو اس کا علم ہو جائے کہ کوئی اُن پر سے قربان ہوگئی تو میری روح مطمئن ہو جائے گی۔ اب قسم کھاؤ۔

پھر تو سرکار میں نے قسم کھالی اور صداقتِ قلب سے یہ بات آپ پر ظاہر کرنے کے لئے ابھی تک اپنے دل میں چھپائے رکھی۔

یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُس شب تاریک میں یہ جگر پاش کہانی سُن کر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ میں دیوانہ وار چیخ اُٹھا "زین زین!" اُس نے دھیمی آواز میں کہا "اب جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہم مجبور ہیں۔ کچھ نہیں کر سکتے۔" اُس کا ہاتھ پکڑ کر میں رونے لگا۔

اُس نے دریافت کیا اُس کی قبر کو دیکھے گا ؟

مَیں نے سر کی جُنبش سے جواب دیا۔ مُنہ سے تو کچھ کہہ ہی نہ سکتا تھا۔

اُس نے اُٹھ کر شمع روشن کی اور اُس خوفناک اندھیری رات میں جب کہ آسمان سے بڑی بڑی بُوندیں گر رہی تھیں ہم اُس ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں چل پڑے۔ اُس نے پھاٹک کھول دیا مجھے سامنے سیاہ لکڑی کی صلیب نظر آئی۔ اُس نے کہا "بس یہی ہے"۔ قبر پر سنگِ مرمر کا کتبہ لگا تھا۔ اُس نے اُس پر قندیل رکھدی تاکہ میں کھُدے ہوئے الفاظ پڑھ سکوں۔

"اُسی ہارٹینشی میریڈینٹ زین فرانسس کی بیوی تھی۔ وہ بہت وفاشعار عورت تھی۔ خدا اُس کی رُوح کو خوش رکھے"

قندیل کے دونوں طرف ہم گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں کھڑے تھے۔ میری آنکھیں سنگِ مرمر کے تعویذ پر بکھرتی ہوئی بوندوں کو دیکھ رہی تھیں اور دل میں مرحومہ کی پاک محبت کا تصور تھا۔

اُسی وقت سے میں یہاں ہر سال آتا ہُوں اور نہ معلوم کیوں اپنے کو بوڑھے سائیس کا احسان مند سمجھتا ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں بھی ہمیشہ آنسو بھرے رہتے ہیں۔

(فرانسیسی)

(تقی علی ہاشمی)

عیادت

بیماری کا حال کیا پُوچھتے ہو۔ تمہارے آنے کی خوشی کی وجہ سے میرے دِل کی تکلیف کم ہوگئی ہے۔ کاش تم مجھے مل جاؤ تو کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ اگر جُدائی رہی تو سمجھ لو کہ دوا بھی فائدہ نہیں کر سکتی۔ پھر وہی بُرا حال ہو جائے گا لیکن میں چاہتی ہوں کہ اب اسی طرح بیمار رہوں۔ یہ نہ پُوچھو کیوں ؟

جمیل

پپیہے سے

جی بیکل، سینے میں دھڑکن، اُلجھے سر کے کیس[1]
پتہ نہیں، شیشے میں دل کے، لگی کدھر سے ٹھیس
سُن رے پپیہے، پریم کے پالک، پریمی کا سندیس

آپ ہی آپ یہ جی گھبراوے، کہیں نہ آنا جانا
اپنے کو بھی بھول گئے ہم جب سے اُنہیں پہچانا
ہاں رے پپیہے، پریم کے پالک، گا دے پریم کا گانا

پھول کھلے، فوارے چھوٹے، رنگ برنگی کیاری
پھرتی ہے آنکھوں میں جیسے کسی کی صورت پیاری
سنبھل پپیہے، پریم کے پالک، اب ہے تیری باری

جب سے دل کی دُنیا سُونی، سُونا سارا دیس
خبر نہیں، کیوں دل نے آخر لیا بروگ کا بھیس
سُن لے پپیہے، پریم کے پالک، پریمی کا سندیس!

(مقبول)

---

[1] کیس یعنی بال

مسولینی کا جانشین

کیا گرانڈی، بالبو، اسٹریلیس، یا ان میں سے کوئی ایک مسولینی کا صحیح جانشین متصور ہو سکتا ہے؟ یہ وہ اہم سوال ہے جس پر دُنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نپولین بُونا پارٹ کی مَوت کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ دُنیا اٹلی کے اس مدبر اعظم کی موت کے بعد کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ فسطائیت کا بانی مستقل مزاج ہے اس کے ارادے کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ اولوالعزمیاں اور کامیابیاں ہر قدم پر اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ اس کی مثال آپ یوں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ فسطائیت کی ہوا ۱۹۱۹ء میں مائلن سے چلی اور ۱۹۲۳ء میں سارے اٹلی پر اس کی کامل فتح تسلیم کر لی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ یورپ کے اکثر شہروں میں فسطائیت کا اثر اور خیر مقدم دیکھا جا سکتا ہے۔

فسطائیت اور مسولینی کی مَوت، یہی وہ دو اُمور ہیں جن پر عوام و خواص غور و خوض کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا خیال ہے کہ مسولینی کی موت کے ساتھ ہی فسطائیت کی بھی مَوت واقع ہو جائیگی کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مسولینی جیسے مصلح قوم کی شخصیت ہی اس پُرجوش و عظیم جذبہ (فسطائیت) کے قیام کی کفیل ہو سکتی ہے۔ انہیں یہاں تک اس خیال کی صحت پر یقین ہے کہ وہ علی الاعلان اپنے مخالفوں کے مُنہ پر کہتے ہیں کہ کون ہے جو مسولینی سے ٹکر کھا سکتا ہے؟ اٹلی بھر میں کون ایسا شخص ہے جو اس کا حقیقی معنوں میں جانشین ثابت ہو سکے گا اور اس کے پھیلائے ہوئے کارخانہ کو سنبھالنے کی اہلیت پیدا کر سکے گا؟ ان کی نظریں مسولینی کے ہم پلہ شخص کی تلاش میں ناکام رہتی ہیں۔

اس کے ساتھ ایک دُوسرا گروہ موجود ہے جس کا خیال ہے کہ فسطائیت کی گرانڈ کونسل اور اٹیلین کیبنٹ ضرور ایسے اشخاص کے انتخاب میں کامیاب ہو سکے گی جو بین الاقوامی شہرت و عزت و اثر کے حامل ہوں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ کوئی شخص فسطائی پارٹی کا صدر بھی بن سکتا ہے اور وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز ہو سکتا ہے اٹلی کا مختارِ مطلق بھی ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں مسولینی کی رُوح کہاں موجود ہو گی؟

برسر اقتدار ہونے کے بعد مسولینی نے پہلا کام یہ کیا کہ ملک کے اعلیٰ خزانوں کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں یعنی نہ صرف وہ وزیر اعظم و مختارِ عام بنا بلکہ اس نے وزارتِ خارجہ اور بری و بحری قوتوں کو بھی اپنے قبضہ میں رکھا۔

کہا جاتا ہے کہ مسولینی حکمتِ عملی اور سیاسی چالوں میں بہت زیادہ طاق نہیں ہے لیکن فوجی اثر و اقتدار امن عامہ اور قوانین کے قائم رکھنے میں اس سے زیادہ موزوں شخصیت دوسری نظر نہیں آتی۔ اُسے اپنے احکام کی تعمیل کرانے میں یدطُولیٰ حاصل ہے۔

گرانڈی یہ تو ظاہر ہو گیا کہ اٹلی کو مسولینی سا شخص مشکل سے میسر ہو گا۔ قرینہ سے یہ پایا جاتا ہے کہ امورِ ملکی مختلف وزارتوں میں منقسم ہو جائینگے اور یہ وُزراء کافی مقتدر اور ہر دلعزیز ہونگے۔ رائے عامہ ان کی تائید میں رہیگی۔ ان سب میں مشہور ڈینو گرانڈی ہے

جو آج کل سفیر اٹلی کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم ہے۔ گرانڈی نے شہرت کے زینے بتدریج طے کئے ہیں۔ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہے۔ وزیر خارجۂ اٹلی ہونے کی حیثیت میں اس نے اپنی سیاسی چالوں سے مختلف کامیابیاں حاصل کیں۔ اب سے دو سال پہلے سولینی نے جب وزارتِ خارجہ کا عہدہ اسکے ہاتھوں سے لے لیا تو عام طور پر یہ خیال کیا گیا کہ اس کا درجہ گھٹا دیا گیا ہے اور وہ معرضِ تنزل میں ہے۔ لیکن فی حقیقت ایسا نہ ہوا بلکہ وہ فسطائی گرانڈ کونسل میں نمایاں اثر رکھتا ہے اور اس وقت جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے سفیر کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم ہے۔ گرانڈی کی شہرت مسلّم تو ہے لیکن یہ شہرت غیر ملکی معاملات میں کامیابیوں کے حصول کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ممالک میں اس کی شخصیت کافی راسخ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نسبتہً وہ اپنے ہم وطنوں میں کم مقبول ہے۔ سیاسی تدبر میں اس کا درجہ بہت بلند ہے لیکن فسطائی سلطنت کے صدر کو سخت گیر اور تسلط پسند شخصیت کا حامل ہونا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنی قوت سے ہمیشہ باخبر رہے اور اپنی طاقت کا اندازہ دوسروں کو بھی کراتا رہے۔ یہ خصوصیات گرانڈی میں مفقود ہیں۔

مارشل اٹالو بالبو عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ بالبو مسولینی کا جانشین ہو سکتا ہے۔ اس کی غیر معمولی شہرت اسکے کمالِ فن کی رہینِ منت ہے۔ دُنیا کا سب سے کسن ہواباز ہونے کے باوجود اس نے غیر معمولی پروازیں کیں اور دُنیا کو اٹلی کی ہوائی قوت سے آگاہ کیا۔ اس سے نہ صرف اٹلی کو شہرت حاصل ہوئی بلکہ بالبو بھی دُنیا کے سامنے آ گیا۔ بالبو ایک فوجی آدمی ہے اور بہترین خوبیوں کا مالک لیکن سیاست داں نہ ہونے کی وجہ سے کیا پبلک اس کی عزت کریگی؟ یہ سوال زیرِ غور ہے۔ بالبو میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو گرانڈی میں مفقود ہیں۔ موجودہ حالت میں اس کا منصب لیبیا کی گورنری ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ وزیرِ افواج ہو جائے۔ لیکن وہ جس قدر فوجی چالوں سے واقف ہے اسی قدر سیاسی چالوں سے ناواقف ہے۔

اسٹریلیس اٹلی کا ایک اور اہم ترین آدمی باقی رہ گیا ہے۔ یہ قومی فسطائی پارٹی کا سکرٹری ہے اور کیبنٹ اور گرینڈ کونسل کا ممبر بھی ہے۔ پارٹی کے احکام جاری کرنا اور پارٹی کے انتظام پر قابو رکھنا بھی اس کے اہم کام ہیں۔

مسولینی کے بعد اس کا جانشین فسطائی گرانڈ کونسل کے ذریعہ سے منتخب ہوگا۔ یہ یقین ہے کہ کونسل ایک تجربہ کار اور قابل آدمی کا انتخاب کرے گی۔ صرف وہی شخص مسولینی کا جانشین ہو سکتا ہے جو نوجوان ہو اور بین الاقوامی شہرت، عزت، اثر اور سیاسی و فوجی اقتدار کا حامل بھی ہو اور اٹلی کی معتدبہ قوت اس کی تائید میں ہو۔ اسٹریلیس یعنی پارٹی کا موجودہ سیکرٹری ان خصوصیات کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ وہ اٹلی کے طول و عرض میں غیر معمولی شہرت کا مالک ہے۔ ملک کے ہر سرد و گرم سے اس کا تعلق ہے۔ تنومند ہونے کے علاوہ ذہین اور زبردست اہلِ قلم بھی ہے۔

شاید یہی شخص مسولینی کا جانشین ہو!

(ترجمہ)

منیر الدین حیدرآبادی

بے وفائی

"بے وفائی" لارڈ بائرن کی مشہور نظم "When we two parted" کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ "Verse Libre" یا آزاد نظم میں ہے جو دورِ جدید کی انگریزی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ اُردو میں ابھی اس کی طرف بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ نظم بحرِ ہزج میں ہے اور ہر مصرعہ کو حسبِ ضرورت مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بعض مصرعے قدرتی طور پر سالم بھی آ گئے ہیں۔ یک آہنگی کو دور کرنے کے لئے ہر بند کے آخر میں مضامین غزل کے وزن پر ایک چھوٹا سا ٹکڑا دانستہ رکھا گیا ہے"۔ (ح - ل)

(۱)

شکستہ دل،
خموش، آنکھوں میں آنسو!
ہوئے اس طرح برسوں کیلئے ہم
جُدا۔
کُملا گئے تھے
فرطِ غم سے
ترے گلہائے عارض
لمس جن کا
رواں کرتا تھا لہرا فسردگی کی
رگ و پے میں۔
کھُلی اب یہ حقیقت،
غمِ انجام کا اِک آئینہ تھا
جُدائی کا وہ لمحہ!

(۲)

سحر کا وقت تھا،
میری جبیں پر
مگر،
پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔
نہ تھی شبنم،
حسیں فطرت
ستمگر!

تری اس بے وفائی پر تھی گریاں
مجھے احساس اب جس کا ہوا ہے۔
ترے وعدے کہاں ہیں؟
تری شہرت
فقط افسانہ بن کر رہ گئی ہے!
کسی سے نام سنتا ہوں جو تیرا
جھکا لیتا ہوں گردن!

(۳)

پیامِ مرگ ہے یہ نام مجھکو!
مرا دل
خوفِ رسوائی سے لرزاں!
تجھے چاہا تھا میں نے اس قدر کیوں؟
وہ تیرے نو گرفتارانِ الفت،
جو کرتے ہیں ترا ذکر آکے مجھ سے
انہیں معلوم ہو یہ راز
اے کاش!
مجھے بھی تجھ سے تھی اک دن محبت!

جفاؤں کو تری کوسوں گا اکثر
زبانِ حال سے میں!

(۴)

ملے تھے
ہم زمانے کی نظر سے
نہاں ہو کر،
یہی حالت ہے اب بھی:
تری بیداد کا کرتا ہوں ماتم
مگر،
چپ چاپ، تنہا!
کیا خبر تھی
فریبِ حُسن کی؛
گر اتفاقاً
مری تقدیر میں ہو تجھ سے ملنا،
پس از مدت جو تجھ کو دیکھ پاؤں،
ملوں اس طرح سے اے بیوفا! میں:
خموش، آنکھوں میں آنسو!

(حفیظ ہوشیارپوری)

تصویر کی چوری

لیڈی ڈین نے کہا "اگر یہ تصویر کوئی دن اور یہاں لٹکی رہی تو مجھے پاگل خانے میں جانا پڑے گا۔"
"میں سچ کہتی ہوں میری بھوک زائل ہوگئی ہے اور دماغ چل گیا ہے اور اس کی وجہ محض یہی تصویر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بڑی رنگین تصویر کی طرف اشارہ کیا جو سنہری چوکھٹے میں لگی ہوئی کھانے کے کمرے میں سامنے کی دیوار پر آویزاں تھی۔

سر جو شافیٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

لیڈی ڈین کے علاوہ قصبے کے سارے باشندے اس تصویر سے سخت متنفر تھے۔ اس پر ایک ہزار پونڈ صرف ہوئے تھے اس کو تیار ہوئے دو سال گذر چکے تھے اور اب بھی بازار میں آٹھ سو سے کچھ زیادہ پونڈ وصول ہو سکتے تھے کیونکہ یہ ملک کے مایہ ناز مصور کریسپ کا مشہور شاہکار تھا۔ یہ سر جو شافیٹ کے اس زمانہ کی یادگار تھی جب وہ شہرت و عزت کے بام رفیع پر متمکن تھے۔ ملک میں اُن جیسی کامیابی کبھی کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ ڈین اینڈ بیورز کمپنی میں جو مٹی کے برتنوں کی ساخت کا سب سے بڑا کارخانہ تھا متعدد حصص کے مالک تھے۔

اوائل عمر میں سر جی کو حصولِ زر کے لئے سخت صبر آزما مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی بڑی کوفت تکلیفیں اُٹھائیں آخر آہستہ آہستہ اُن کی کاوشیں پھل لانے لگیں چنانچہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ ملک کا متمول ترین شخص ان سے لگانہ کھا سکتا تھا۔ قصبے کے باشندے ان کی سادہ لوحی کو ہزار دفعہ کم عقلی سے تعبیر کریں اور اُن کی ہمہ گیر سخاوت و مروت پر لاکھ آوازے کسیں مگر یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہ ملک کے معروف ترین امیر تھے۔ یہ ان کی سادہ لوحی و کشادہ دلی ہی کا فیضان تھا کہ اس وقت دولت اُن کے دروازے پر جھاڑو دیتی تھی اور شہرت قدموں میں لوٹتی تھی۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تین دفعہ وہ کونسل کے اعلےٰ صدر منتخب ہوئے۔ ملک کے سارے یتیم خانے اور سکول ان کی جیب کے مرہونِ منت تھے۔

جب وہ تیسری دفعہ صدرِ اعلےٰ منتخب ہوئے تو عوام نے انہیں اس شاندار کامیابی پر ہدیۂ تہنیت پیش کرنے کا مشورہ کیا۔ اس ہدیے کی نوعیت پر بڑی قیل و قال ہوئی۔ کئی تجاویز پیش کی گئیں مگر ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نقص نکلا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد لوگوں نے سر جی کی ایک شاندار قلمی تصویر بنوانے پر زور دیا۔ یہ سُن کر سر جی نے اپنے آئینے سے مشورہ کیا۔ اس بیچارے نے از راہِ ہمدردی بہت کچھ صدائے احتجاج بلند کی مگر لوگوں کے اصرارِ بلیغ کے سامنے ایک نہ چلی اور سر جی نے با دلِ ناخواستہ سرِ تسلیم خم کر دیا

ایک ہزار پونڈ کے عوض اعجاز نگار مصوّر کریسیج کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ حسن کار رنگوں کے استعمال میں وحید النظیر تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اس کے مُوقلم نے دستِ مسیحائی سے اکتسابِ فیض کیا ہے کیونکہ وہ اپنی تصاویر میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ تصویر کے چہرے پر اندرونی جذبات و احساسات کو نمایاں کر دینا اس کا سب سے بڑا کمال تھا یہی وجہ ہے کہ رائل اکیڈمی میں اس کی تصاویر نے کئی دفعہ اعلےٰ انعامات حاصل کئے تھے۔

کریسیج نے معمولی شرائط پر سرجی کی شبیہ کھینچنا منظور کر لیا۔ شرائط یہ تھیں کہ ایک تو سرجی کو تصویر بنوانے کے لئے کریسیج کے پاس ایک گاؤں میں جانا پڑے گا۔ دوسرے رائل اکیڈمی کی نمائش سے پہلے کوئی شخص تصویر دیکھنے کا مجاز نہ ہوگا۔ سرجی ہر روز بیڈ فورڈشائر جانے لگے اور تھوڑے ہی دِنوں میں تصویر تیار ہو گئی۔ اُنکے احباب کا چشم دید بیان ہے کہ آخری دن جب وہ گاؤں سے آئے تو بہت افسردہ خاطر تھے۔ اسی طرح جب کمیٹی کے ممبر شاداں و فرحاں تصویر دیکھنے گئے تو واپسی پر بہت ملول اور اُداس نظر آتے تھے۔ عوام نے تصویر کے متعلق بہت کچھ استفسار کیا مگر کسی کو شافی و تسلی بخش جواب نہ مِلا۔

آخر نہایت اشتیاق آمیز انتظار کے بعد تصویر رائل اکیڈمی میں پیش ہوئی۔ سرجی لمبا ریشمی لبادہ پہنے تھے سینہ پر متعدد سنہری تمغے بہت خوشنما نظر آتے تھے مگر سب سے زیادہ جاذب نظر طلائی گھڑی کی مرصّع زنجیر تھی۔ حاضرین کا خیال تھا کہ سرجی کی شبیہ عہدِ حاضر کا لاجواب شاہکار ہے اور ارتقائے مصوّری کا بہترین نمونہ۔ سرجی اور نمائندوں کی کمیٹی پر تحسین و توصیف کے پھول نچھاور کئے گئے مگر خدا معلوم تمام اراکین ان طویل و مسجع تعریفی فقروں کو کیوں طفل تسلیوں سے تعبیر کرتے تھے۔ خاصکر سرجی تو اپنے قدردانوں کی مبارکبادوں میں ایک ہلکی سی خلش محسوس کر کے چونک چونک پڑتے اور کبھی سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کرتے۔

ایک ماہرِ فن نقاد نے کہا "اس بار تو کریسیج نے تصویر کو فطرتی رازہائے سربستہ کا آئینہ دار بنا دیا ہے"۔

دوسرے کا خیال تھا "سرجی کے اندرونی جذبات تصویر کے چہرے پر صاف رقص کرتے نظر آتے ہیں"۔

تیسرے نے لکھا "سرجی کی آنکھوں کے ایک ایک ڈورے میں انکی گذشتہ زندگی کے تاثرات منعکس ہو رہے ہیں"۔

جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ کیا کچھ نہ کہا گیا اور کیا کچھ نہ سُنا گیا۔

قصبے کے باشندے بھی تصویر دیکھنے لندن آئے۔ آخر بیچاروں نے چندہ جو دیا تھا۔ وہاں پہنچکر اُنھوں نے دیکھا۔ کہ ایک بڈھا کھوسٹ جھریوں سے بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ داڑھی پائپ کے دھوئیں سے بھوری ہو کر سخت بدنما ہو گئی ہے ہونٹوں کو کچھ اس طرح سے بند کر رکھا ہے جیسے مُنہ میں ایک دانت نہیں۔ رخسار پچکے ہوئے ہیں۔ ایک شریر لڑکے نے تو صاف کہہ دیا "شرط بدتا ہوں گالوں میں پُورے پاؤ بھر چنے سما جائیں"۔ ماتھے پر لاتعداد شکنوں کا بنا ہوا جال لگا رکھا ہے جس میں دیکھنے والے کا طائرِ نظر پھڑپھڑا کر رہ جائے۔ کان دو مُونگے کی سیپیوں کی طرح ہیں اور ناک جُھک کر دہنِ مبارک میں جھانک رہی ہے

اور آنکھوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تنگ و دھنستی چلی گئی ہیں اور اس طرح چمکتی ہیں کہ بے اختیار یاد آتا ہے ؎

جس طرح پانی کنویں کی تہ میں تارا ہو گیا

یہ ہیں وہ آرا، جو آرٹ سے بے بہرہ دیہاتیوں نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق قائم کیں بعض ستم ظریف لڑکے تو مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔ کئی اجڈ گنواروں نے اپنے لٹھوں کے سروں سے تصویر کا منہ چڑانا شروع کیا۔ قریب تھا کہ تصویر نیچے گر پڑے مگر خیریت ہوئی کہ پولیس نے انہیں گیلری کے پیچھے دھکیل دیا۔ یہ دیکھ کر سرجی بہت جھلائے۔ سنجیدہ مزاج بوڑھوں اور فہمیدہ اشخاص نے سرجی کے لئے نہیں بلکہ لیڈی ڈین کے لئے جو اپنی خوش خلقی، غریب پروری و نیک مزاجی کے باعث سرجی سے کہیں زیادہ مقبول تھیں، دل ہی دل میں ہمدردی کا اظہار کیا۔

تصویر جب عوام کی طرف سے سرجی کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کی گئی تو لیڈی ڈین بصد دقت ان کی تالیف قلوب کے لئے چہرے پر مصنوعی تبسم و تشکر کے آثار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں اور طبیعت حاضر کر کے دو تین فقرے بھی فی البدیہہ دُہن کہہ لئے۔ اس طرح پیش کش کی رسم ادا کی گئی۔

اسے سینڈ کاسل میں آویزاں ہوئے سولہ مہینے گزر چکے تھے۔ جب لیڈی ڈین نے کہا کہ تصویر کی بیہودگی سے میں عقل و حواس کھو بیٹھوں گی تو سرجی نے جھلا کر کہا "بیوی! تم تو بیوقوف گنواروں سے بھی گئی گذری ہو۔ کوئی مجھے لاکھ دس گنی قیمت دے جب بھی میں اسے جدا نہیں کرنے کا" مگر یہ سفید براق بگلے کے پر سا۔ دھلا دھلایا استری کیا ہوا جھوٹ تھا۔ سرجی کو درحقیقت تصویر سے خدا واسطے کا بیر تھا مگر وہ اس کا اظہار کس منہ سے کرتے۔ وہ تصویر کو جلانے کی خاطر سارے محل کو آگ لگانے پر آمادہ تھے مگر کل ہی شام کو انہیں ایک کم خرچ و بالا نشین تجویز سوجھی تھی جسے عملی جامہ پہنانے پر وہ تُلے ہوئے تھے۔

لیڈی ڈین نے ایک سرد آہ بھری اور کہا "مگر آج تم خلاف معمول بہت سویرے شہر کو جا رہے ہو۔"

سرجی نے عالم محویت میں جواب دیا "ہاں آج میں کچہری کا اجلاس کروں گا۔"

وہ شہر کی عدالت عالیہ میں چیف جسٹس تھے۔ شہر جاتے ہوئے انہوں نے اپنی تجویز کے ہر پہلو پر خوب غور و خوض کیا۔ وہ انہیں غیر مانوس و وحشیانہ سی معلوم ہوئی مگر اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

آج صبح سرجی نے کرسی عدالت پر رونق افروز ہو کر مجسٹریٹ کے کلرک مسٹر شیرٹ کو بڑا مدمہ پہنچایا اور ساتھ ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ایورن کی امیدوں اور تمناؤں پر بھی پانی پھیر دیا۔

ایک مہینہ سے شہر میں متواتر نقب زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں جن سے تمام شہر میں دہشت اور سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ نقب زنوں
ے ہاتھوں سخت پریشان تھے۔ پولیس بھی باوجود انتہائی کوشش کے اس خطرناک گروہ کا سراغ لگانے میں بُری طرح ناکام رہی محکمہ کے تمام افسر
بلاکے ہدفِ مطاعن بنے ہوئے تھے۔ آخر مسٹر لوبران کے ایک ماتحت نے بڑی جانبازی و دلیری سے ایک نقب زن کو اسیر کیا جو اس گروہ کا سرغنہ
تا۔ اس پر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مسٹر لوبران پر تحسین و آفرین کے موتی نچھاور کئے۔ وفورِ مسرت سے وہ جامے میں پھولا نہ سماتا تھا غرور
سے تن تن کر اپنے قیدی کو ہتھکڑی لگائے وہ شہر کے ہر گلی کوچے سے گزرا۔ ملزم نے اپنا نام ولیم سمتھ بتایا مگر اس کی حرکات و سکنات ایسی پُر اسرار اور
شتبہ تھیں کہ کسی کو اس سے بات تک کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مسٹر لوبران اور مسٹر شیرٹ کو کتنی مایوسی ہوئی ہوگی جب سر جی نے اپنے تمام اختیارا
ت ے کار لا کر ملزم کے خلاف ساری شہادتوں کو لغو و بے بنیاد قرار دے کر اسے صاف بری کر دیا۔ اس پر سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ مگر سر جی کا فیصلہ
ل تھا۔ جب اجلاس برخاست ہوا۔ تو سر جی نے ملزم کو ازراہِ ہمدردی و دلجوئی اپنے پرائیوٹ کمرے میں بُلا بھیجا۔ عوام کا خیال تھا کہ وہ
پنی ناجائز مروت سے اس بدمعاش کو اور زیادہ شہ دے گا۔

ایک سپاہی ولیم سمتھ کو سر جی کے کمرے میں لے آیا۔ جب وہ واپس ہونے لگا تو سمتھ نے اسے ایک فحش گالی دی سپاہی
غیظ و غضب سے تلملا کر رہ گیا مگر چیف جسٹس کی پیشانی پر بل نہ پڑا۔

سر جی نے اپنی کہنی کا سہارا لے کر مرعوب کن آواز میں کہا "مسٹر سمتھ تم جانتے ہو آج کی صبح تمہارے لئے کتنی مبارک تھی" اور
س کی طرف ادائے بے نیازی سے دیکھا۔

سمتھ دروازے کے پاس ہاتھ میں ٹوپی لئے کھڑا تھا۔ قرائن سے اسپر نقب زن کا شبہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ کسی دفتر کا کلرک معلوم ہوتا
تھا جس نے مدت سے اپنا کام چھوڑ رکھا ہو۔ وہ ایک بوسیدہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ کلائی اور گلے پر سے کوٹ پھٹا ہوا تھا۔ ململ کا کالر
یل سے مجبور ہو رہا تھا۔ اسکے بال چکٹے ہوئے تھے اور ہاتھ بہت گندے تھے۔ ابھی وہ بالکل نوخیز تھا مونچھیں بھیگ رہی تھیں۔

اس نے بے پروائی سے کہا "ہاں گورنر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

سر جی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا چیف جسٹس کونسل کا صدرِ اعلیٰ ملک کا معروف ترین شخص اور اس سے یہ طریقۂ تخاطب۔
راب کیا ہو سکتا تھا۔ اس نے خود ہی اس کی بے گناہی کو ثابت کر دیا تھا اب مسٹر سمتھ بالکل آزاد تھا اور اپنی مرضی کے مطابق
لیک سے اپنے پسندیدہ لہجے میں کلام کر سکتا تھا۔ اس کے اندازِ تکلم سے لاابالیانہ پن ٹپکتا تھا مگر سر جی ذرا دب سے گئے
نکہ انہیں اس سے ذاتی غرض تھی۔

سر جی نے کہا "کیا میں تمہاری کسی طرح مدد کر سکتا ہوں؟"

سمتھ نے کہا "تمہارا دام تو ویر یہاں کام نہیں کر سکتا۔ میں کسی قیمت پر بھی اپنا شغل ترک نہیں کرنے کا۔ تمہیں معلوم

ہے کہ تمہارا پیشہ شراب کے نشہ کی طرح ہے۔ ہر قید کا حکم ہمارے لئے جرعۂ دو آتشہ ہوتا ہے۔ میں مالی امداد سے بے نیاز ہوں اور میرے پاس تمہارے ایسے خود نما لوگوں سے زیادہ روپیہ موجود ہے"۔

سرجی نے جرأت کر کے کہا "مجھے یقین ہے کہ نقب زنی کچھ زرخیز پیشہ نہیں ہے"۔

اس پر سمتھ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا "او ہو نہایت زرخیز۔ میں تمہاری طرح روپیہ کندھے پر تھوڑا ہی اٹھائے پھرتا ہوں۔ اِدھر نقدی آئی اُدھر جائداد کی صورت میں تبدیل ہو گئی"۔

سرجی نے کہا "خیر ایسا ہی ہو گا۔ بہر حال یہ ذریعۂ معاش ایک امر معیوب ہے"۔

سمتھ نے چمک کر جواب دیا "کیا یہ سچ ہے؟ لوگ اسے کیا کیا نہیں کہتے۔ مجھے بھی ایک بھلے مانس دوست نے کہا تھا کہ چوری کی عادت ایک ناقابلِ علاج بیماری ہے۔ میں نے اسے بارہا لکھا کہ میرے لئے ایک درجن اعلےٰ شراب کی بوتلیں بھیج دو تاکہ اس کے استعمال سے جراثیم غلبہ نہ کرنے پائیں۔ مگر اس نے بالکل خاموشی اختیار کر لی"۔

"کیا کبھی جیل کی ہوا بھی کھائی؟"

"کبھی نہیں۔ مگر اس دفعہ نصیحت آ گئی ہے۔ جو کہنا ہو جلدی کہہ دو۔ کیونکہ میں لایعنی گفتگو میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر سکتا"۔

"اس کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔

سمتھ سرجی کے بالمقابل ایک کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا اور اپنی کہنیاں بعینہٖ اسی کے مانند میز پر ٹکا دیں۔

سرجی نے کہا "کیا تم ایک چوری کرو گے جو قانون کے سراسر منافی نہیں"۔

سمتھ نے حیرت سے کہا "جنٹلمین ہوش کی باتیں کرو"۔

سرجی نے بے پروائی سے کہا "میرے سیناڈ کاسل کے کھانے کے کمرے میں ایک تصویر لٹکی ہوئی ہے میں چاہتا ہوں وہ چرا لی جائے"!

"چرا لی جائے؟"

"ہاں میں اسے اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتا ہوں مگر برملا ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تمام لوگوں کا ہدیہ ہے میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ وہ سچ مچ چرا لی گئی"۔

"او ہو! یہ تو دغا بازی ہوئی۔ اس طریقے سے عوام کو بہکاؤ گے کیا! اچھا بالفرض میں یہ مان بھی لوں تو میرا معاوضہ کیا ٹھیرا؟"

"اے عقل کے دشمن یہ تصویر نہایت قیمتی ہے۔ ایک ہزار پونڈ کے عوض بنوائی گئی تھی۔ اگر آج تم اسے امریکہ لے جاؤ تو کم از کم آٹھ سو پونڈ وصول کر سکتے ہو۔" اس کے بعد سرجی نے شروع سے اخیر تک تصویر کی رام کہانی کہہ سنائی۔

"مگر تم اسے الگ کیوں کرنا چاہتے ہو؟"

"اس سے تمہارا کیا مطلب؟ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"اچھا اگر میں نے چرا بھی لی تو اُسے بیچوں گا کہاں؟ کیا چھاتی سے لگائے ملکوں ملکوں لئے پھروں گا؟"

"ارے نادان ایک سال اپنے پاس رکھنا۔ بات گئی گذری ہو گئی تو امریکہ جا کر بیچ دینا۔ وہاں آرٹ کے قدردان اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

ولیم سمتھ یہ سن کر کسی گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ یکلخت کسی خیال کے آنے سے اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اندرونی مسرت کو بمشکل ضبط کر کے اس نے سرجی سے کہا۔

"گو میرے لئے یہ نفع بخش چوری نہیں مگر تمہارے احسان کا بدلہ اُتارنے کے خیال سے کر گذروں گا۔"

سرجی نے خوش ہو کر جواب دیا "تم کب تک اس کام کو سرانجام دے سکو گے۔ آج رات نہ آؤ گے؟"

سمتھ نے سوچتے ہوئے کہا "نہیں آج رات مجھے فرصت نہیں اور شاید کل رات بھی نہ ہو۔"

سرجی نے حیران ہو کر پوچھا "تم لوگ بھی اتنے مصروف ہوتے ہو؟"

"تم عجیب خیال کے آدمی ہو۔ کام کئے بغیر بھلا بنتی ہے۔ پرسوں رات تمہارا کام کر دوں گا مگر وہ کرسمس کی رات ہو گی۔"

"کیا ہوا کرسمس کاٹ کھائے گا کیا؟"

"اچھا جس طرح تمہاری مرضی۔"

سرجی نے مطمئن ہو کر کہا "مگر میرے مکان کا نقشہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ مجھ سے آنے جانے کے راستوں کے متعلق بھی استفسار کر سکتے ہو۔"

"تمہیں اس سے کیا غرض؟ میں جانوں اور میرا کام۔ مگر سرجبٹس ایک بات میرے دل میں کھٹکتی ہے بعد میں مجھے الزام دو گے کہ محسن کے گھر نقب لگائی۔"

سرجی ہنس دیئے "بالکل نہیں اس قسم کی چوری تو قانوناً بھی جائز ہے میں اسے تمہارا احسان جانوں گا۔"

۲۴ دسمبر کی شام کو سرجی اپنے کاسل میں واپس آگئے۔ ان کی بیوی لیڈی ڈین سفر کے لئے اسباب وغیرہ بندھوا رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ کرسمس اس دفعہ اپنے بڑے بیٹے جان کے مکان پر جو قصبے کے شمالی حصے میں واقع تھا بسر کریں۔ سرجی نے اپنا راز بیوی سے محفوظ رکھا۔ وہ اس خیال سے اندر ہی اندر مسرور تھے کہ کس طرح لیڈی ڈین تصویر کو کرسے میں نہ پاکر مسرت انگیز تحیر سے اچھل پڑیں گی۔ جب سارا انتظام ہو چکا تو سرجی نے کہا۔

"میں اس شام کو جان کے ہاں نہیں جا سکتا۔ سارا دن کرسیِ عدالت پر بیٹھے بیٹھے طبیعت مضمحل ہو گئی ہے اور تکان سے تمام اعضا شکستہ ہو رہے ہیں۔ مزید براں آج ہی شب چند ضروری فیصلے لکھنے ہیں"۔

لیڈی ڈین نے مایوسی کے انداز سے کہا "مگر کھانا کہاں کھاؤ گے۔ نوکر تو سب چھٹیوں پر گھر چلے گئے ہیں"۔

سرجی نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا "تم اس کا کوئی اندیشہ نہ کرو۔ میں اپنا انتظام کر لوں گا"۔

لیڈی ڈین اسباب اٹھوا بیٹے کے پاس چلی گئیں۔ بوڑھے گاڑیبان کا آیر کے پاس کچھ کھانا تھا وہی سرجی کے کام آیا جب وہ بھی چلا گیا تو تنہائی میں سرجی رہ گئے اور ان کی تصویر۔

وہ خیال کرنے لگے۔

"میں نے تمام معاملہ کس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ گھر میں نوکر بھی موجود نہیں۔ شاید کھٹکے سے ان کی آنکھ کھل جاتی اور وہ سمتھ کے کام میں مزاحم ہوتے۔ مگر گھر کو لٹیروں کے رحم پر چھوڑنا بھی خلافِ مصلحت ہے۔ خیر میں خود جو موجود ہوں۔ سمتھ کی ساری کارروائی کی نگرانی کروں گا کہ کہیں اِدھر اُدھر تو نہیں ہاتھ صاف کر رہا"۔ وہ ان خیالات میں غرق تھے۔ تشویش کے ساتھ ہی دل میں خوشی بھی تھی۔ کبھی سوچتے "مکان کو اس طرح سمتھ پر چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ تجویز یقیناً نہایت کوتاہ اندیشی اور خوفناک عجلت پر مبنی ہے"۔ پھر کہتے "بہر صورت بارہ گھنٹے کے بعد میں اس منحوس تصویر سے تو آزاد ہو جاؤں گا"۔

جب انہیں خیال آیا کہ اس کم بخت تصویر کی وجہ سے انہیں کتنی اہانت اور سُبکی برداشت کرنی پڑی تھی تو اُن کا خون کھول اُٹھا۔ لوگوں نے کس کس طرح میرا خاکا اُڑایا اور کیسے کیسے مضحکہ خیز فقرے چُست کئے۔ سفاسکر جان تو لندن کے رسائل سے مجھ کو ذلیل کرنے کے لئے خاص خاص فقرے ڈھونڈ لایا کرتا تھا۔ کوئی مہمان ایسا نہ تھا جو اپنی خوش طبعی و ظرافت و تہذیب کے پردے میں چھپانے میں کامیاب ہوا ہو۔ آخر اس ملعون تصویر کے دفیعے کی تدبیر ہو ہی گئی۔ اگرچہ یہ کسی قدر وحشیانہ ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اس کے جلانے کے لئے سارے محل کو بھی آگ لگا دیتے تو یقیناً اُن کا کوئی دوست نما دشمن بلا اُٹھتا "ارے سب سے پہلے اس تصویر کو بچانا" اور بے وقوف نالائق ہمسائے اسے ضرور بچا لیتے۔ اس صورت میں

محل سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے اور کام بھی نہ بنتا۔

انہوں نے آخری مرتبہ تصویر کی طرف نظرِ حقارت سے دیکھا اور کہا "اے منحوس شبیہ تو نے مجھے ستالیا۔ لے اب الوداع!"

اس کے بعد انہوں نے حسب وعدہ پائیں باغ کی طرف کی کھڑکی کھول دی اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو کر بجلی بجھادی جس سے چاروں طرف سخت تاریکی محیط ہوگئی۔ سرجی کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ وہ بستر پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے اور سمتھ کی آمد کا بڑی بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ دو بجے کے قریب جس وقت کا سمتھ نے وعدہ کیا تھا وہ گھبرا سے گئے مگر اندر چلنے پھرنے کی آوازیں برابر سنا کئے۔ کبھی آوازیں آنے لگتیں کبھی خاموشی چھا جاتی مگر انہیں کھٹکے کی آواز سننے کا یقین تھا۔

سرجی کا اشتیاق لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتا گیا۔ آخر وہ جذبۂ کامیابی کو ضبط نہ کرسکے اور اٹھ کر کھڑکی تک پہنچے۔ باغ سے ٹھنڈی اور فرحناک ہوا آرہی تھی۔ خوش قسمتی سے اُن کو چند سائے بھی نظر آئے جو جلدی ہی تاریکی میں غائب ہوگئے۔ اب سرجی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور واپس آکر میٹھی نیند سو رہے۔ مگر آنکھ لگنے سے ذرا پہلے وہ ایک بار ہنس لئے کہ اپنے احباب کے سامنے میں اس چوری کے متعلق قطعی لاعلمی کا اظہار کروں گا۔

خلافِ معمول سرجی صبح سویرے ہی اٹھ بیٹھے اور پورا لباس پہنے بغیر ولیم سمتھ کے کارنمایاں کی داد دینے کھانے کے کمرے میں گئے۔

دیکھتے کیا ہیں کہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ اور طلائی چوکھٹا ندارد۔ اس پر چاک سے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"اس بیہودہ چیز کی ہمیں ضرورت نہیں۔"

بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے محل میں جھاڑو پھری ہے۔ چائے کا ایک چمچہ بھی ڈھونڈے سے نہ ملا۔

(ماخوذ) ——— سید علی عباس

بابِ محبّت پر

جمال کو بے نقاب کر دے شباب کو بے حجاب کر دے
قسم ہے معصومیوں کی تجھکو! نظامِ فطرت خراب کر دے

وہ قیس ہی تھا جو جیب و داماں کی دھجیوں سے رہا اُلجھتا
میں اس جنوں کی تلاش میں ہوں جو چاک تیرا نقاب کر دے

بہا دے رنگینیوں کے دریا۔ ڈبو دے رنگینیوں میں مجھ کو
تو ایک سیلِ شراب بن جا، مجھے غریقِ شراب کر دے

ترے محبّت فروز نغموں پہ عشرتِ کائنات قرباں
مری خموشی کو لوٹ بھی لے مرے سکوں کو خراب کر دے

کہاں تک اب ان پہاڑ راتوں کو تیشۂ بیکسی سے کاٹوں
مری محبّت کے خواب آجا! غمِ جُدائی کو خواب کر دے

کہاں وہ سوز و گداز نغموں میں، جو ہے مضمر خموشیوں میں
رباب کو دُور پھینک بھی دے سکوت ہی کو رباب کر دے

روشؔ کی دیوانگی تو دیکھو چلا ہے اس کا کلیم بنکر
اُٹھا کے جو اک حجابِ جلوہ، ہزار پیدا حجاب کر دے

(روشؔ صدیقی)

سوویٹ رُوس میں جہالت کا دِیوالہ

"ماڈرن ریویو میں روس کی تعلیمی ترقی کے متعلق مسٹر جی ایس نیر کا ایک مضمون شائع ہؤا ہے جس کا ترجمہ ناظرینِ ہمایوں کی دلچسپی کیلئے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جدید روس نے اپنی مختصر زندگی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اگر ہمارا موجودہ طریق تعلیم جاری رہا تو ہندوستان کو اس درجے پر پہنچنے کے لئے صدیاں درکار ہونگی۔"

جب میں ماسکو کی انجمن استیصالِ جہالت کے مرکز میں پہنچا تو ڈاکٹروں نے مجھ سے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا۔ ایک دفتر کے گودام کے قریب ایک بوڑھی عورت رہا کرتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس دفتر کے بورڈ کو بارہا دیکھا تھا لیکن اس کی عبارت کو پڑھنے سے قاصر تھی یہ عورت ایک تعلیمی ادارہ میں شریک ہوگئی تین ہفتے بعد ایک روز شام کو جب وہ ادھر سے گذری تو خوشی سے اُس کے آنسو نکل پڑے۔ آج وہ یہ عبارت پڑھ سکتی تھی۔ اور یہ اس کی زندگی میں ایک غیر متوقع واقعہ ہے۔ یہ واقعہ اس تغیر کی ایک نمایاں مثال ہے جو سوویٹ کی آبادی کے بالغ افراد میں پیدا ہو رہا ہے۔

روس نے بیسویں صدی کا حیرتناک انقلاب پیش کیا ہے پندرہ سال کے اندر اس نے اپنی سوسائٹی سے جہالت کے شرمناک داغ کو دُور کر دیا ہے ۱۹۱۷ء میں ملک کی ستر فیصدی آبادی نہ لکھ سکتی تھی نہ پڑھ سکتی تھی۔ پندرہ سال کی سرگرم کوشش سے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے ۱۰ فیصدی تک پہنچ چکی ہے۔ اس تعداد میں زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ اور ملک کے دُور دراز حصوں میں بسنے والے باشندے شامل ہیں لیکن اب مدارس ان کے قرب وجوار میں بھی کھولے جا رہے ہیں تاکہ تعلیم گاہ تک بآسانی ان کی رسائی ہوسکے۔ اگر تم کسی روسی شہر کے بازاروں میں گزرو تو بہت سے جوان آدمیوں کو چھوٹے چھوٹے بستے اپنے ہاتھوں میں لئے جاتے ہوئے دیکھو گے یہ مدرسے جا رہے ہیں۔ اگر تم سڑک کی جانب کھُلے ہوئے روشن دریچوں میں جھانکو تو ہر ایک محلہ میں تم کو ایک یا دو مدرسے دکھائی دیں گے۔ عورتیں اور مرد اپنے لکھنے پڑھنے کے ضروری سامان کے ساتھ ان دریچوں کے سامنے بیٹھے نظر آئیں گے۔ اس قسم کے سینکڑوں شبینہ مدارس تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کارخانوں، حرفوں اور سُرخ فوج میں یا جہاں کہیں بھی تین آدمی بغرضِ تعلیم جمع ہوسکیں اس قسم کے مدارس قائم ہیں۔

آج روسی باشندے تعلیم کے بھوکے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ صدیوں تک زار اور اس کے اربابِ حکومت ان کو جاہل اور ان پڑھ رکھ چکے ہیں۔ اتفاقاً ایک روشن خیال اور حامیِ تعلیم حکمران پیدا ہوا تھا جس نے چند مفت مدارس کو رواج دیا تھا لیکن مجموعی طور پر تعلیم کو مشتبہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حکمران ڈرتے تھے کہ تعلیم رعایا کے پوشیدہ جذبات آزادی کو اُبھاریگی۔ الگزینڈر اوّل کے وزیر تعلیم

شستکو (۱۸۸۰ تا ۱۹۰۵ء) کا یہ کہنا کہ رعایا کے گروہِ کثیر یا اکثریت کو تعلیم دینا منفعت کے بجائے مضرت پیدا کرے گا روسی فرمانرواؤں کے دلی عندیہ کا اظہار تھا پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ روس کا معیارِ تعلیم مغربی اقوام میں سب سے پست تھا۔ ۱۹۱۴ء میں روس کی مدارس میں جانے والی آبادی کا اوسط تین فیصدی تھا اس کے مقابلہ میں ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۲، جرمنی میں ۱۹ اور فرانس و انگلستان میں ۱۶ فیصدی تھا۔ چند مفت مدارس مذہبی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند اور ریاضی کی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن حاضری مطلق لازمی نہ تھی۔ وقت کا بیشتر حصہ دقیانوسی مذہبی تعلیم میں صرف ہوتا تھا۔ ہر مدرس کے زیرِ نگرانی طلبہ کی تعداد پچاس سے نوے تک ہوتی تھی۔ شکی عہدہ داروں کا معائنہ اور گرفت اس قدر سخت تھی کہ اس سے رعایا میں روشن خیالی پیدا ہونے کے تمام امکانات ملیامیٹ ہو گئے تھے۔

علمی تغیرات سیاسی تغیرات کے تابع ہوتے ہیں۔ ممالکِ متحدہ امریکہ نے انگلستان سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد جمہوری تعلیم کا نیا تجربہ شروع کیا۔ جب قیصریت کا خاتمہ ہوا اور جرمنی میں نئے طرز کی حکومت قائم ہوئی تو قدیم نظامِ تعلیم پر بھی نظرِ ثانی کی گئی۔ اب موجودہ قومی اشتراکی حکومت تعلیمی نظامِ عمل میں اہم تبدیلیاں کر رہی ہے۔ یہی حال فسطائی اٹلی میں ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے سیاسی تغیر سے تمام اہم شعبوں میں تغیر پیدا ہوا۔ تعلیم پر بھی اس کا اثر ہوا۔ چنانچہ کسی اور ملک میں تعلیمی تبدیلیاں اس قدر کامل طریقہ پر جاری نہیں ہیں جس قدر سوویٹ روس میں۔

روسی رہنماؤں کو اپنی قوم کے پندرہ کروڑ افراد کی حالت سدھارنے میں جو صدیوں سے ان پڑھ، جاہل اور مفلس رکھے گئے تھے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اگر فطری تعلیمی ارتقا جاری رہتا تو باشندوں کو صرف لکھنا پڑھنا سکھانے کیلئے ایک صدی اور درکار ہوتی مگر سوویٹ میں نظامِ تعلیم اور اس کے متعلقہ شعبوں کی ترقی تاریخِ تمدن میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ روسی تعلیم کو اشتراکی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور سیاسی تغیرات نے نئے اشتراکی نظام کی بنیاد ڈالی ہے۔

زار کے عہد میں مزدوروں اور کسانوں کو تعلیم پانے کے بہت کم مواقع حاصل تھے جب عوام کے رہنماؤں نے اقتدار حاصل کیا تو مزدوروں اور کسانوں کے گروہِ کثیر کیلئے علم کے دروازے کھول دیئے گئے۔ نئی حکومت کے نظام العمل میں سب سے اہم کام ملک سے جہالت دور کرنا ہے۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۱۹ء میں لینن نے اس قانون پر دستخط کئے جس کا مفاد یہ تھا کہ روس کی سرزمین سے جہالت کا کلیتہً استیصال کر دیا جائے۔ روس کی موجودہ تعلیمی جدوجہد جس کا مقصد تیس کروڑ افراد رعایا کی جہالت دور کرنا ہے غائر مطالعہ کے قابل ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تحریک جس کا نام "تحریکِ استیصالِ جہالت" ہے غیر سرکاری انجمنوں کی نگرانی میں جاری ہے۔ اگرچہ ان کو حکومت کی حوصلہ افزائی اور امداد حاصل ہے۔ ان تمام انجمنوں کی صدر ایک مجلس اعلیٰ ہے جو اصول اور ہدایات مرتب کرتی ہے۔ مجلسِ اعلیٰ کے ماتحت صوبہ وار مجالس ہیں جو اس کے نظامِ عمل اور حکمتِ عملی کو بروئے کار لاتی ہیں۔ مجلسِ اعلیٰ پانچ شعبوں میں منقسم ہے (۱) شعبۂ تنظیم مدارس۔ (۲) شعبۂ نصاب و تعلیم (۳) شعبۂ اشاعت برائے تعلیم (۴) شعبۂ مالیہ (۵) شعبۂ وضع تجاویز۔ تمام صوبہ وار مجالس میں اسی قسم کے شعبے ہیں۔ مقامی مجالس اپنے علاقہ کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد معلوم کرنے کے بعد اشاعتِ تعلیم کی تائید میں رائے عامہ حاصل کرتی ہیں۔ خواندہ و ناخواندہ دونوں قسم کے

لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ کارخانوں، دفتروں اور فوج میں یا جہاں کہیں بھی چند خواہشمندانِ تعلیم کا جمع ہونا ممکن ہو انجمن قائم کی جاتی ہے۔ قیامِ انجمن کیلئے کم از کم تین اراکین کا ہونا ضروری ہے۔

یہ پوری تحریک عوام کی امداد پر قائم ہے۔ تمام اراکین باقاعدہ چندوں کی مقررہ رقم ادا کرتے ہیں۔ کارخانے اور منظم جماعتیں محاصل دیتی ہیں اراکین کے عطا کردہ چندے سامان و وسائل تعلیمی اشیاء کے حصول اور مقامی ضروریات کی تکمیل کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ جدوجہد کی تعلیمی قوت ان فوجی اصطلاحات سے ظاہر ہوتی ہے جو اس مہم پر پروپیگنڈے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں مثلاً مجالسِ اضلاع کے شائع کردہ رسالے اور رضاکار اساتذہ علمی فوج کہلاتے ہیں۔

مجھے چند اداروں کے دیکھنے کا موقع ملا جہاں ہر عمر کے مرد و عورت موجود تھے۔ بڑی عمر کے لوگ ہدایات اور تنظیم کا کام انجام دیتے ہیں اور تعلیم کی ذمہ داری کومسولز قبول کر لیتے ہیں۔ یہ (Komsomols) تیرہ سے چوبیس سال کے نوجوانوں کی منظم جماعت ہے۔ یہ نوجوان دن کو مدارس اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں اور رات کا وقت سماجی خدمات میں صرف کرتے ہیں۔ اشاعتِ تعلیم روس میں موجودہ وقت کا سب سے اہم کام ہے۔ گذشتہ اکتوبر میں دن کے وقت میں نے ماسکو کا ایک ثانوی مدرسہ دیکھا لیکن ان نوجوانوں کی سماجی خدمات کا حال معلوم کرنے کے شوق میں رات کو بھی گیا۔ عمارت کو لوگوں سے بھرا پایا۔ ایک جماعت میں چودہ سے اٹھارہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ ایک طالبِ علم صدر تھا اور دوسرے طلبا کچھ بحث کر رہے تھے۔ اُستاد ان سب طلبہ کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ رہبر نے مجھکو جلسہ کی روئداد سنائی۔ یہ طلبہ اپنے اضلاع میں اشاعتِ تعلیم کی کوشش کر رہے تھے لیکن کام کی رفتار اطمینان بخش نہ تھی اسلئے وہ اصول دریافت کرنا چاہتے تھے جو ان کی سماجی ذمہ داری کو بہ احسن الوجوہ پورا کر سکیں۔ یہ وہ لوگ تھے، جو پس ماندہ اور اَن پڑھ گروہ سے جہالت دُور کرنے میں مدد دے رہے تھے۔

تعلیمی اداروں میں خدمات انجام دینے والے رضاکار اساتذہ کے پاس چند ضروری اسناد ہونی چاہئیں۔ بالغ طلبہ کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کیلئے کم از کم چار سال اور ثانوی جماعتوں کیلئے ۵ سال کسی مدرسہ میں تعلیم پانا ضرور ہے ساتھ ہی ساتھ معلمی کے ابتدائی اصول سے واقف ہونا بھی بہتر ہے۔

ان اداروں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد سولہ سے پچاس تک ہوتی ہے۔ تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی اور کتابیں مفت دی جاتی ہیں۔ چونکہ خواتین کی بہت بڑی اکثریت غیر تعلیمیافتہ ہے اسلئے کام بھی اسی طبقہ میں نسبتہً زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ جب مائیں گھروں سے باہر نہیں جا سکتیں تو سماجی خدمات انجام دینے والی معلمات ان کے گھروں میں جا کر ضروری تعلیم دیتی ہیں۔ اگر فی ہفتہ نو سے گیارہ گھنٹہ تک کام کیا جائے تو ایک شخص کو حرف نوشت و خواند سکھانے کی قلیل ترین مدت اٹھارہ ماہ ہے۔ جدید روسی ہفتہ چھ دن کا ہوتا ہے۔

طلبہ کو تعلیمی سند حاصل کرنے کیلئے دو مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے درجہ میں بالغ طلبہ کو بچوں کا دو سالہ نصاب نو ماہ میں ختم کرنا ہوتا ہے اس کے بعد آسان عبارت خوانی اور حساب میں امتحان لیا جاتا ہے۔ دوسرے درجہ میں طالب علم کو مدرسہ تحتانیہ کے چار سال کا نصاب اٹھارہ ماہ میں ختم کرنا ہوتا ہے۔ امتحان میں نیز عبارت خوانی، قواعد، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ سے متعلق سوالات دریافت کئے جاتے ہیں۔ روس میں محض نوشت و خواند اور حساب دانی کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ اسکے ساتھ اشتراکیت کی تعلیم نہ ہو۔ انجمن استیصالِ جہالت کے صدر ایم کالینینکی (M. Kalinini

نے تعلیم بالغاں کی تعریف یوں کی ہے۔

موجودہ حالات میں استیصالِ جہالت کے معنی عوام کو صرف نوشت و خواند سکھانا نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے کہ جو کچھ وہ پڑھیں اچھی طرح اُن کے ذہن نشین کرایا جائے اور ان کو سکھا دیا جائے کہ پڑھی ہوئی چیزوں کو اپنے دماغ میں کلیتہً محفوظ رکھیں۔ سیاسی حیثیت سے تعلیم یافتہ بنانے کے معنی نیا انسان پیدا کرنا ہے۔ نئے انسان پیدا کئے بغیر تعلیم دینا محض فضول ہے۔

اس بیان کی صداقت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم تعلیم بالغاں کا نصاب دیکھتے ہیں جو عمرانی، سیاسی اور اشتراکی مسائل پر مشتمل ہے ترغیبِ تعلیم کو تقویت دینے کیلئے باقاعدہ جماعتوں کے علاوہ مختلف پروگرام بھی ہیں مثلاً مقامی عجائب خانہ کا گشت، متحرک کتب خانے تقاریر اور مشہور دیواری روسی اخبار جو عملاً ہر تعلیم کا خاکہ ہوتا ہے۔

بعض لوگ ایسی تنظیم کی کامیابی میں جو رضاکارانہ جدوجہد پر منحصر ہو شبہ کرسکتے ہیں لیکن پندرہ سال کے مندرجۂ ذیل اعداد و شمار جن میں جہالت کا سریع الزوال اوسط فیصدی دکھایا گیا ہے اِس شبہ کو دُور کردیں گے۔

سال	تعلیم کا اوسط فیصدی	سال	تعلیم کا اوسط فیصدی
۱۸۹۷	۲۰٫۹	۱۹۲۶	۵۲٫۸
۱۹۲۰	۴۴٫۴	۱۹۳۱	۷۳٫۶

استیصالِ جہالت کے خاص مدارس اسقدر سود مند ثابت ہوئے ہیں کہ دس سال میں طلبہ کی تعداد تگنی ہوچکی ہے۔

سال	تعداد طلبہ
۱۹۲۱-۲۲	۴۵۶۰۰۰
" ۱۹۲۶-۲۷	" " ۱۵۵۴۰۰۰
" ۱۹۳۱-۳۲	" " ۱۳۶۲۱۰۰۰

جب کوئی شخص روس میں عوام کی ذہنی بیداری کا ذاتی مشاہدہ کرتا ہے تو تعلیم کے یہ اعداد و شمار کمزور معلوم ہونے لگتے ہیں ماسکو اور لینن گراڈ کے بازاروں میں کتب خانوں کی فراوانی دیکھ کر مجھ کو سخت تعجب ہوا۔ یہاں جوانوں اور بڈھوں کا خاصا مجمع تھا تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے لٹریچر کی اشاعت بھی نہایت تیزی سے جاری ہے۔ ذوقِ تعلیم کو تازہ رکھنے کے لئے مسائل حاضرہ کی خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ روسی دیواری اخبار بھی اشاعت تعلیم میں بہت معاون ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ روس میں تعلیم نہایت سرعت سے پھیل رہی ہے۔ روسی رہنماؤں کو توقع ہے کہ آئندہ چند سال میں ملک سے جہالت قطعاً دُور ہوجائیگی روسی تعلیم کے ایک رہنما ڈاکٹر چلسکی (Dr. Chatskhy) نے اپنے تجربہ کی بنا پر مجھ سے بیان کیا کہ "پانچ سال بعد ہمارا ملک سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملکوں میں شمار ہوگا"

(محمد نسیم)

چرنوں کی داسی

میں چرنوں کی داسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

مَیں چرنوں کی داسی اور تُو
من مندر کا باسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

درشن جل کو رو بیٹھی ہیں
میری انکھیاں پیاسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

تُو آئے تو شاید جائیں
چنتا، سوچ، اُداسی
ساجن! میں چرنوں کی داسی

(امرچند قیس جالندھری)

سلطان محمود غزنوی اور حکیم بوعلی سینا

ایک تاریخی غلط بیانی کا ازالہ

دُنیا کی نامور ہستیوں میں بہت کم ایسی خوش نصیب ہونگی جو مؤرخین کے ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے کم و بیش بدنام نہ ہوئی ہوں۔ اسی طرح نظامی اور محمد خاوند شاہ کی مفروضہ داستان طرازیوں کے طفیل سلطان محمود غزنوی کا نام بھی سیاہ کاران عالم کی فہرست میں شامل ہوگیا اور افسوس کہ زمانۂ مابعد اور دورِ موجودہ کے مورخین نے ان خود غرضانہ داستانوں کو تاریخی کسوٹی پر پرکھے بغیر صحیح تسلیم کرلیا۔ مگر حقیقت بین نظروں سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ ان داستانوں میں انتہائی مبالغے اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ نظر غائر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے مذہبی اختلافات اور ذاتی رنجشوں کی بنا پر سلطان کو متعصب، بے وفا، ظالم، سخت گیر اور غیر مسلموں کا دشمن ثابت کرنے کی بے حد جدوجہد کی ہے اور نہ صرف یہی بلکہ اسی نوع کے بیشمار مہمل افسانوں میں وہ داستانیں سلطان کے حاسدوں اور مخالفین نے اس قدر دُہرائی ہیں کہ اکثر مؤرخین کو دھوکا ہوگیا ہے اور اُنہوں نے حقیقت واقعہ کی تحقیق کئے بغیر ہی ان فرضی داستانوں کو تاریخی واقعات تسلیم کرکے اپنی طرح دُنیا کو بھی غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے جس طرح مذہبی روایات میں اکثر ایسے بھی امور ہوتے ہیں جو کثرتِ استعمال کے سبب سے قابلِ اعتقاد مان لئے گئے ہیں ورنہ ان کو اصلیت سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ اور عوام جن میں قدرتِ کاملہ نے تحقیق و تجسس اور چھان بین کا مادہ ودیعت نہیں کیا۔ ان فرضی داستانوں کو احکام ربانی کی طرح صحیح مان لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی حال ان داستانوں کا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے زمانے کے فتنہ پرداز مؤرخوں نے مذہبی اور سیاسی اختلافات کی بناء پر اس کی شہرت اور نیک نامی کو داغدار کرنے کے لئے تراشی ہیں۔

ان فتنہ پرداز مؤرخین نے سلطان محمود غزنوی کو خود غرض متعصب اور لالچی تاجدار کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ سلطان نے بغیر کسی معقول وجہ کے غیر مسلموں کے ملکوں پر حملہ کیا اور نہ صرف ان کی دولت کو لوٹا اور ملک کو تاخت و تاراج کیا بلکہ ان کے دماغی و ادبی سرمایہ کو بھی برباد کردیا۔ اور وہاں کے ماہرین علم و فن کو غزنین جاکر آباد ہونے پر مجبور کیا۔ اسی قسم کی ایک اور لغو اور مہمل داستان میں سلطان پر یہ تہمت تراشی گئی ہے کہ اس نے ایران کے زندۂ جاوید شاعر فردوسی کے ساتھ بدعہدی اور بدسلوکی کی۔ شاہنامہ کی تکمیل پر موعودہ انعام کے انکار نے فردوسی کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا اور اس نے عالمِ مایوسی میں سلطان کی ہجو کہی اور دربار سے فرار ہوگیا۔ لیکن سلطان کے سپاہیوں نے اسے امن و اطمینان کے

سامنے زندگی بسر کرنے دی۔ ان تمام بدعہدیوں اور بدسلوکیوں کی وجہ صرف یہ بتائی گئی ہے کہ فردوسی کے بدخواہوں نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ وہ شیعی عقائد رکھتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے مشہور ادیب و مؤرخ علامہ محمود شیرانی نے اپنے ایک عالمانہ مضمون میں (جو انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا) اس غلط بیانی کی پرزور دلائل و براہین سے تردید کر دی ہے۔

اسی طرح ایک دوسری داستان سے واضح ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے اپنے زمانہ کے مشہور حکیم بو علی سینا کے ساتھ اس کے شیعی عقائد کی بنا پر بدسلوکی کی۔ اس داستان کو اس شد و مد سے ایک ایسے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھ کر یہ لغو اور مہمل قرار نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ مسلّمہ تاریخی واقعات کی روشنی میں "حقیقتِ واقعہ" معلوم کرنے کی سعی کی جائے۔

اس داستان کے مصنف نظامی اروضی سمرقندی مؤلف "چہار مقالہ" اور محمد خاوند شاہ مؤلف "روضۃ الصفا" ہیں۔ علامہ عبدالوہاب قزوینی ناشر و مرتب "چہار مقالہ" نے اپنے پرمغز دیباچہ میں مفصل بحث کر کے نظامی کی زبردست غلطیوں کا پردہ فاش کر دیا ہے جس کے مطالعہ کے بعد واضح ہو گا کہ نظامی کسی حیثیت سے بھی مؤرخ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ رہا محمد خاوند شاہ اس کی تاریخی تالیفات کے متعلق مشہور جرمن ادیب و مؤرخ ہرمان ایتھے (Hermann Ethé) کی بے لاگ رائے یہ ہے کہ "محمد خاوند شاہ بن محمود (جسے عام طور پر میر خواند کہتے ہیں اور جس نے ۹۰۳ھ میں بمقام ہرات انتقال کیا) کی شہرت کا انحصار اس کی ضخیم تالیف "روضۃ الصفا" پر ہے۔ یہ کتاب سات جلدوں پر منقسم ہے لیکن مشرقی مذاق کے مطابق ہونے کی وجہ سے تنقید و تبصرہ سے خالی ہے۔ گو زبان بامحاورہ ضرور ہے لیکن استعارات اور تشبیہات کے بوجھ نے صلابتِ زبان پر بھی ضرب کاری لگائی ہے۔ لیکن ان تمام عیوب کے باوجود اہلِ مشرق اور خاص کر مسلمان اسے قابلِ قدر صحیفۂ تاریخی مانتے ہیں۔" نظامی نے "چہار مقالہ" محمد خاوند شاہ کی ولادت سے بھی قبل مکمل کر دیا تھا اور اسی لئے اس کے بیان کو محمد خاوند شاہ کے بیان پر فضیلت حاصل ہے۔ نظامی نے جو داستان بیان کی ہے اس کا لب لباب یہ ہے:۔

"ابو العباس مامون خوارزم شاہ کے ایک وزیر کا نام ابو الحسین احمد بن سہیل تھا۔ اُسے علم و ادب اور حکمت سے فطری لگاؤ تھا نہ صرف اس کا مذاق عالمانہ تھا بلکہ وہ سخی اور فیاض بھی تھا۔ خوارزم شاہ بھی علماء و حکماء کا قدر دان تھا۔ اسی سبب سے اس زمانہ کے اکثر نامور عالم و حکیم مثلاً حکیم بو علی سینا۔ ابو سہیل مسیحی۔ ابو الخیر بن الخمار۔ ابو النصر عراقی اور ابو ریحان البیرونی وغیرہ اس کے دربار کے رُکن تھے اور خوارزم شاہ کی قدر دانی کے سبب سے دُنیاوی تفکرات سے آزاد تھے اور ان کے باہمی تعلقات بھی مخلصانہ تھے۔

لیکن فلکِ ستم شعار نے انہیں آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ ان کی فارغ البالی کے ایام ختم ہو گئے۔ ان کی مسرت و شادمانی نصیبِ دشمناں ہو گئی اور وہ دُنیاوی مصائب و آلام میں پھنس گئے۔ سلطان محمود یمین الدولہ کا قاصد خط لے کر آیا جس میں تحریر تھا کہ میں نے سُنا ہے کہ تمہارے (خوارزم شاہ کے) دربار میں کئی مشہور زمانہ علماء و حکماء موجود ہیں۔ اب میری خواہش یہ ہے کہ تم انہیں میرے دربار میں بھیج دو تاکہ میں ان کی صحبت سے متمتع اور ان کے علمی و فنی کمال سے فیضیاب ہو سکوں اور یہ تمہارا مجھ پر ایک بڑا احسان ہو گا۔"

"قاصد کا نام خواجہ حسین بن علی بن مقال تھا۔ جسے خوارزم شاہ نے ایک عالیشان عمارت میں اُتروایا اور اس کی بے انتہا خاطر و تواضع کی لیکن اسے دربار میں طلب کرنے سے قبل خوارزم شاہ نے اپنے درباری علماء و حکما کو بُلا کر سلطان محمود کے خط کے مضمون سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ سلطان محمود کا لشکر جرار اور لاتعداد ہے۔ مجھ میں یہ طاقت کہاں کہ سلطان کی فرمایش پوری کرنے سے انکار کر دوں۔ اب آپ اپنی رائے سے مطلع کریں"۔

"حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی نے جواب دیا کہ ہم ہرگز نہ جائیں گے" لیکن ابوالنصر ابوالخیر اور ابوریحان البیرونی نے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا کیونکہ انھوں نے سلطان یمین الدولہ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ سُنا تھا۔ خوارزم شاہ نے حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی سے کہا کہ چونکہ تم دونوں کو جانا پسند نہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ قبل اس کے کہ میں قاصد کو طلب کروں تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ چنانچہ خوارزم شاہ نے حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی کو ایک معقول رقم بطور زادِ راہ دے کر ایک رہبر کے حوالہ کر دیا اور وہ خطرناک جنگلوں سے ہو کر گرگان چلے گئے"۔

"دوسرے دن خوارزم شاہ نے خواجہ حسین بن مقال کو دربار میں بُلا کر کہا کہ "بوعلی سینا اور ابوسہیل تو میرے شہر سے جا چکے ہیں لیکن ابوالنصر ابوالخیر اور ابوریحان سلطان کے دربار میں حاضر ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کچھ مدّت کے بعد یہ تینوں بلخ پہنچ کر سلطان یمین الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے"۔

لیکن سلطان کی فضل ترین خواہش حکیم بوعلی سینا سے ملنے کی تھی چنانچہ اس نے ابوالنصر (جو ایک نامور مصور تھا) کو حکم دیا کہ حکیم بوعلی سینا کی تصویر تیار کرے جس کی اس نے اپنے مصوروں سے چالیس کاپیاں تیار کرائیں اور انہیں ہر چہار ہمسایہ حکمرانوں کے پاس اس اعلان کے ساتھ بھیج دیا کہ "اس شکل و صورت کے انسان کا نام حکیم بوعلی سینا ہے۔ اسے تلاش کرو اور گرفتار کر کے میرے دربار میں بھیج دو"۔

"بوعلی سینا کا بیان ہے کہ خوارزم شاہ کے دربار سے چلے آنے کے چوتھے دن ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ گرد و غبار نے فضا میں پھیل کر روزِ روشن کو اندھیرے سے تبدیل کر دیا۔ بدیں وجہ وہ راستہ بھول گئے۔ ابوسہیل صحرا کی سخت گرمی پیاس کی شدت اور پانی کی قلت کی تاب نہ لا کر راہیِ ملکِ عدم ہوا"۔ حکیم بوعلی سینا پہلے طُوس گیا اور وہاں سے نیشاپور آیا۔ جہاں اس نے اکثر آدمیوں کو اپنی تلاش میں پایا جس سے وہ بے حد متفکر ہوا اور ایک عزیز آباد جگہ پر ٹھہر گیا۔ جہاں وہ چند روز پوشیدہ رہ کر گرگان چلا گیا۔ (کہتے ہیں کہ گرگان میں حکیم بوعلی سینا نے ایک شخص کی صرف نبض دیکھ کر اس کے بیمارِ محبت ہونے کی تشخیص کر دی اور جب اس کی اطلاع اس ملک کے والی امیر قابوس کو ملی تو اس نے حکیم بوعلی سینا کو اپنے پاس بُلا لیا۔ امیر قابوس کے پاس سلطان یمین الدولہ کی بھیجی ہوئی تصویر موجود تھی اس لئے اس نے بوعلی سینا کو فوراً پہچان لیا اور اسے اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔ امیر قابوس کے اصرار پر بوعلی سینا نے بیان کیا کہ اس نے کس طرح اس پُراسرار بیماری کی تشخیص کی امیر قابوس بوعلی سینا سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا۔ حکیم بوعلی سینا گرگان سے رے گیا اور بالآخر شہنشاہ علاء الدولہ کا وزیر مقرر ہو گیا جیسا کہ بوعلی سینا کی سوانحعمری میں تحریر ہے"۔

یہ ہے وہ داستان جو نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں بیان کی ہے لیکن اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ نظامی نے یہ نہیں بتایا کہ سلطان محمود نے خوارزم شاہ کے دربار سے علماء و حکما کو کیوں طلب کیا تھا اور نہ اس نے سلطان کی کسی بدنیتی کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا تو اشارۃً تک بھی نہیں کیا کہ سلطان بو علی سینا کو اس کے شیعی عقائد کی سزا دینا چاہتا تھا بلکہ اس کے برخلاف سلطان کو اہلِ کمال کا قدر دان، ان کی صحبت سے مستفید ہونے اور اپنے دربار کی رونق بڑھانے کا متمنی دکھایا ہے لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ نظامی کی بیان کردہ داستان درست ہے تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حکیم بو علی سینا اور ابو سہل مسیحی غالباً اس سبب سے فرار ہونے اور چھپ جانے پر مجبور ہوئے کہ انہیں اندیشہ تھا کہ سلطان کے دربار میں ان کی آزادی محدود ہو جائیگی اور انہیں تحریر و تقریر کی عام اجازت نہ ہوگی اور اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو ان جملہ مصائب کی ذمہ داری ان کی کوتاہ بینی ناعاقبت اندیشی اور غیر معاملہ فہمی پر عاید ہوتی ہے نہ کہ سلطان پر۔

محمد خاوند شاہ نے بھی تھوڑی اور معمولی اختلاف کے ساتھ یہی لغو داستان تحریر کی ہے مگر اس نے اس میں اس قدر اضافہ کر دیا ہے کہ سلطان نے حکیم بو علی سینا کو خوارزم شاہ کے دربار سے اس لئے طلب کیا تھا کہ اسے اس کے شیعی عقائد کی سزا دے چنانچہ محمد خاوند شاہ نے لکھا ہے کہ:-

"چوں شیخ بو علی بہ بست و دو سالگی رسید پدرش بہ رحمت ایزدی پیوست۔ وہم دراں اوقات وآں زمان تزلزل و اضطراب بہ بنائے قصر دولت و شوکت آل سامان راہ یافت۔ ابو علی از آنجا بیرون رفتہ روئے توجہ بخوارزم نہاد۔ ودر آں اوان جمع کثیر از فضلاء و حکماء مثل ابو سہل مسیحی۔ ابو ریحان بیرونی ابوالخیر خمار وغیرہم در صحبت و ملازمت خوارزم شاہ علی بن مامون بن محمد بسر میبردند۔ چون ابو علی بدآنجا رسید خوارزم شاہ در تربیت مشار الیہ اقبال تمام نمود۔ ووجہ معیشت بلہ و مقرر فرمود۔ دراثنا این اوقات سلطان محمود سبکتگین بہ ممالک ملوک سامانی استیلا یافت وپیش او مذمت بو علی کردند کہ مذہب او مخالف مذہب اہلسنت وجماعت است وسلطان در دین بغایت صلب بود۔ خواست کہ شیخ را بدست آرد"

لیکن اس داستان کو تاریخی کسوٹی پر پرکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ نظامی اور محمد خاوند شاہ پر یہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد"۔ انہوں نے اس میں ایک دو نہیں بلکہ بیشمار غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ نظامی نے آغاز داستان ہی میں ایک زبردست ٹھوکر کھائی ہے یعنی ابو عباس مامون بن مامون کا نام اس سلسلہ میں لینا حیرت انگیز غلط بیانی ہے کیونکہ حکیم بو علی سینا بخارا سے آکر جب والی خوارزم کے دربار میں حاضر ہوا تو اس وقت ابو العباس مامون بن مامون نہیں بلکہ اس کا بھائی علی بن مامون تخت نشین تھا حکیم بو علی سینا کے اکثر سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ وہ ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا اور جب بائیس برس کا ہوا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب بخارا میں بدامنی اور شورش نے سر اٹھایا تو حکیم بو علی سینا نے وہاں سے کھسک جانا ہی بہتر خیال کیا۔ اس حساب سے وہ ۳۹۴-۹۵ھ میں یا اس کے دو ایک سال بعد خوارزم شاہ کے دربار میں حاضر ہوا لیکن ابو عباس مامون بن مامون اس کے بھی کئی سال بعد بادشاہ ہوا۔ علامہ ابن القفطی نے "تاریخ الحکما" میں جو بیان حکیم بو علی سینا کی خود نوشت سوانحعمری سے نقل کیا ہے اور نیز ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے بھی واضح ہے کہ خوارزم کے جس فرمانروا نے حکیم بو علی سینا کی خاطر تواضع کی اور اس کی گذر اوقات کے لئے ایک معقول رقم بطور مشاہرہ مقرر کر دی اس کا نام علی بن مامون تھا ہمارا یہ بیان

کی طرف اشارہ ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"پھر میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ اور میں نے سلطان کی چند خدمات بجا لانے کی ذمہ داری لی تو میری ضروریات نے مجھے بخارا سے گرگانج چلے جانے پر مجبور کیا۔ وہاں ابوالحسین سہیلی جو ان علوم کو وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا وزیر تھا۔ میں اس کے ذریعہ گرگانج کے والی علی بن مامون کے پاس گیا۔ اس وقت میں فقہا کے لباس میں تھا۔ سر پر تحنہ اور عمامہ تھا جس کے نیچے کا حصہ ٹھوڑی کے نیچے گردن میں لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے میرا مشاہرہ مقرر کر دیا تھا جو میری طرح کے ایک معمولی انسان کے لئے کافی تھا۔ پھر میری ضروریات نے مجھے فسا جانے پر مجبور کیا اور وہاں سے میں جاجرم گیا جو سرحد خراسان پر واقع ہے۔ پھر وہاں سے جرجان پہنچا۔ میرا ارادہ امیر قابوس کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا لیکن اسی اثنا میں اتفاقاً امیر قابوس گرفتار کر کے ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ جہاں اس نے انتقال کیا۔ پھر میں دہستان گیا۔ وہاں پہنچ کر میں ایک سخت مرض میں مبتلا ہو گیا اور جرجان کی طرف آیا۔ ابوعبید جرجانی بھی میرے پاس آ گیا اور اس نے میرے حالات پر ایک قصیدہ لکھا جس میں ذیل کا شعر بھی تھا:۔ جب میں بڑا ہو گیا تو کسی شہر میں میرے لئے وسعت نہ تھی۔ جب میں گراں قیمت ہو گیا تو میرے قدردان ناپید ہو گئے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف عیاں ہے کہ جس حکمران نے خوارزم میں حکیم بوعلی سینا کی خاطر و تواضع کی اور مال و دولت سے مالا مال کر کے اپنے پاس چند روز قیام کرنے کی ترغیب دی وہ نیک دل اور روشن خیال علی بن مامون تھا نہ کہ ابوعباس مامون بن مامون۔ اس سے جہاں نظامی اور محمد خاوند شاہ کے بیانات کی تردید ہوتی ہے وہاں کئی اور امور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حکیم بوعلی سینا نے خوارزم سے رخصت ہو جانے کی وجہ صرف یہ بتائی ہے کہ "ضروریات نے مجھے فسا جانے پر مجبور کیا" اور تقریباً انہیں الفاظ میں اس نے بخارا سے چلے جانے کی وجہ بیان کی ہے جیسا کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ یہ وہی شورش اور بدامنی تھی جو منصور بن نوح کے تخت سے اتارے جانے کے بعد توزن اور فائق کی سرکشی کے سبب ملک میں پھیل گئی تھی۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض ایسی ہی وجوہات ہوں جنہوں نے اس کو خوارزم سے بھی چلے جانے پر مجبور کیا ہو۔ اب اگر تھوڑی دیر کیلئے ہمارا یہ نظریہ صحیح بھی نہ مانا جائے تو بھی اس سے نظامی اور محمد خاوند شاہ کی دروغ گوئی اور داستان طرازی کی حقیقت تو آئینہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح یہ داستان بھی کہ حکیم بوعلی سینا نے شمس المعالی امیر قابوس کے ایک عزیز کی صرف نبض دیکھ کر اس کے بیمارِ محبت ہونے کا راز معلوم کر لیا تھا اور نیز حکیم بوعلی سینا کی امیر قابوس سے ملاقات اور امیر کا حکیم کو پہچان کر اس پر انتہائی عنایتیں اور نوازشیں کرنا صرف نظامی اور محمد خاوند شاہ کی جدت طرازی ہے۔ انہوں نے اس داستان کی بنیاد غالباً حکیم بوعلی سینا کی اس تحریر پر قائم کی ہے جو حکیم نے اس نوع کی بیماریوں کے متعلق اپنی مشہور عالم کتاب "قانون" میں لکھی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ثابت ہے کہ حکیم بوعلی سینا جرجان امیر قابوس سے ملاقات ہی کرنے گیا تھا مگر اس کی یہ آرزو بر نہ آئی کیونکہ اس کے جرجان پہنچنے سے قبل ہی امیر قابوس کو اس کی باغی فوج نے گرفتار کر کے قتل کر دیا تھا۔

گو مجد الدولہ دیلمی کے عم زاد بھائی علاؤ الدولہ دیلمی والیٔ اصفہان نے تاج الدولہ کو متعدد بار زیر کیا تھا حتیٰ کہ ہمدان تک فتح کر لیا تھا مگر باوجود اس کے نظامی کا اسے شہنشاہ کے معزز لقب سے سرفراز کرنا اور حکیم بوعلی سینا کو اس کا وزیر بتانا ایسی ہی غلط بیانی ہے جو کسی حالت میں بھی قابلِ معافی

قرار نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس سے مسلمہ تاریخی واقعات کی تردید ہوتی ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ حکیم بوعلی سینا دو مرتبہ مجد الدولہ دیلمی کا وزیر مقرر ہوا مگر وہ علاء الدولہ دیلمی کا کبھی وزیر نہیں بنایا گیا۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد جب تاج الدولہ کے آغاز عہد میں علاء الدولہ نے ہمدان فتح کر لیا تو حکیم بوعلی سینا آخر الذکر حکمران کے دربار میں حاضر ہوا اور اس نے اپنی عمر کا باقی حصہ وہیں گذارا۔ علاء الدولہ نے اس کی قدردانی کی اور ہمیشہ عنایتیں اور نوازشیں کرتا رہا۔ چنانچہ حکیم بوعلی سینا نے اسی کی سرپرستی میں حکمت الٰہی تالیف کی جسے اس نے علاء الدولہ ہی کے نام سے معنون بھی کیا ہے۔ لیکن وہ اس کا وزیر کبھی نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں حکیم بوعلی سینا اور ابوریحان البیرونی دونوں کا ایک وقت مامون بن مامون کے دربار میں موجود رہنا اور غزنی سے طلبی کا خط پاتے ہی وہاں سے رخصت ہو جانا اس کا ثبوت بھی از روئے تاریخ غیر ممکن ہے۔ مشہور جرمن ادیب ایڈورڈ ساؤ (Edward Sachau) نے البیرونی کی کتاب آثار الباقیہ کے دیباچہ میں اس تاریخی غلط بیانی کا نہایت حسن وخوبی سے تار و پود بکھیر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب یہ داستان تاریخی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ بالکل لغو اور مہمل ہے کیونکہ مسلمہ تاریخی واقعات کی رو سے ابوریحان اور ابوالخیر ۴۰۷ھ میں خوارزم سے غزنی گئے۔ اور نظامی عروضی کا بیان ہے کہ حکیم بوعلی سینا اور ابوسہیل مسیحی ۴۰۳ھ سے قبل ہی خوارزم سے فرار ہو گئے تھے کیونکہ حکیم بوعلی سینا (بقول نظامی) جرجان پہنچ کر شمس المعالی امیر قابوس کا وزیر ہو گیا اور امیر قابوس کی تاریخ وفات ۴۰۳ھ ہے۔ دراصل اس داستان میں نظامی نے وقت اور مقصد کے لحاظ سے جداگانہ واقعات کو اپنی اختراع سے خلط ملط کر دیا ہے"۔

آگے چل کر ساؤ نے تحریر کیا ہے کہ "خود البیرونی نے یہ داستان لکھی ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے کیوں خوارزم پر حملہ کر کے اس کی آزادی کو کچل ڈالا اور اسے غزنی کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ البیرونی نے بحیثیت ایک چشم دید شاہد کے اس بدامنی اور بغاوت کا حال جس کا خاتمہ شہزادہ مامون بن مامون کے قتل پر ہوا ہے بتفصیل لکھا ہے۔ مامون کی اس حسرتناک موت کی وجہ سے محمود کو خوارزم کے معاملات میں دخل دینے کا بہانہ مل گیا اور وہ مامون بن مامون کے خون کا انتقام لینے کے لئے بہ عجلت تمام خوارزم آیا اور بغاوت فرو کر کے ۴۰۷ھ کے موسم بہار میں اس نے خوارزم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ قرار دے لیا۔ اس کے بعد سلطان نے باغی سرداروں کو قرار واقعی سزا دی اور اپنے سپہ سالار التونتاش کو گورنر مقرر کر کے اسی سال کے موسم بہار میں افغانستان واپس چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سا مال غنیمت اور بے شمار قیدی لے گیا جو بعد میں اس کی فوج میں شامل ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ قیدیوں میں خاندان شاہی کے چند افراد بھی تھے جن کو سلطان نے مختلف قلعوں میں قید کر دیا۔ غالباً اسی سفر میں ابوریحان، ابوالخیر اور ابوالنصر بھی سلطان کے ہمرکاب تھے۔"

اگر تاریخ اسلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ حکیم بوعلی سینا کی البیرونی سے غالباً کبھی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ حکیم بوعلی سینا نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں لکھا ہے کہ وہ علی بن مامون ہی کی زندگی میں خوارزم سے چلا گیا تھا اور اس زمانہ کے مشہور مورخ بیہقی کا بیان ہے کہ البیرونی علی بن مامون کے جانشین مامون بن مامون کے دربار میں ۴۰۰ھ سے غالباً ۴۰۷ھ یعنی سات برس تک حاضر رہا۔ اور مامون بن مامون کے قتل کر دیئے جانے کے بعد ۴۰۸ھ میں سلطان محمود کے ساتھ غزنی آ گیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکیم بوعلی سینا جب تک بخارا میں رہا البیرونی سے علمی و ادبی معاملات پر بذریعہ خط وکتابت تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔

اسی سلسلہ میں دو باتیں نہایت حیرت انگیز قابل توجہ ہیں چنانچہ ان سے بھی محمد خاوندشاہ کی دروغ گوئی اور غلط بیانی کا راز طشت از بام ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ جب حکیم بوعلی سینا فقیہ کے لباس میں تھا تو اس وقت سلطان محمود کے جاسوس اس کو شناخت نہ کر سکے ہوں لیکن جب حکیم نے ہمدان پہنچ کر اپنا

بھیس اُتارا اور اس کے بعد دوسری مرتبہ شمس الدولہ کا وزیر رہا اور وہاں سے رخصت ہو کر اصفہان میں علاء الدولہ بن کاکویا کے دربار میں حاضر ہوا جہاں اس نے بادشاہ کے ایک معزز مہمان اور مشیر خاص کی حیثیت سے قیام کیا۔ تو ان حالات میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے مشہور مقامات پر وہ اس قدر اہم اور ذمہ دارانہ حیثیت سے اتنے کافی عرصہ تک قیام پذیر رہے اور اس کی موجودگی کی اطلاع سلطان محمود کو نہ ملی ہو۔ اب اگر سلطان محمود کو معلوم ہو گیا تھا جو ایک امر لابدی تھا تو پھر سلطان نے جو بقول محمد خاوند شاہ اسے اس کے شیعی عقائد کی سزا دینے کے لئے بیحد کوشاں تھا ان معمولی حکمرانوں سے اسے حاصل کرنے کی سعی کیوں نہیں کی؟ اگر سلطان اس کی گرفتاری کی خواہش کرتا تو یقیناً وہ حکمران بھی والیِ خوارزم کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے تئیں اس کے غیظ و غضب کا شکار ہونے سے بچا لیتے ●

یہاں ایک اور واقعہ بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ سلطان محمود غزنوی اپنے عہد کے آخری سال یعنی ۴۲۰ھ میں رے گیا۔ خود محمد خاوند شاہ نے اس مہم کی مفصل کیفیت لکھی ہے جس کا مقصد دیلمی خاندان کے کمزور حکمران مجید الدولہ کو تخت سے اُتار کر اس علاقہ کو اپنے بیٹے مسعود کے حوالہ کرنا تھا تاکہ اس کو خوش کر کے محمد کو خراسان، غزنی اور بلادِ ہند کا واحد حکمران بنا دے۔ محمد خاوند شاہ نے تحریر کیا ہے کہ اسی موقع پر سلطان محمود نے عراق اور اصفہان کے علاقوں کو بھی تاخت و تاراج کیا۔ مسلّمہ تاریخی حقایق کی رُو سے حکیم ابو علی سینا اس وقت وہیں موجود تھا کیونکہ اس نے ۴۲۸ھ میں انتقال کیا۔ چنانچہ اس کے بعد سیرت نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اپنی حیات کے آخری پندرہ یا سولہ سال اس نے علاء الدولہ کی خدمت میں بسر کئے۔ اب اگر سلطان محمود حکیم کو درحقیقت گرفتار کرنا چاہتا تھا تو اس کا یہ مدعا ایک جنبشِ قلم پورا ہو سکتا تھا مگر ہمیں معلوم ہے کہ سلطان محمود نے کوئی ایسی خواہش نہیں کی اور اس سے محمد خاوند شاہ کے قول کی صاف تردید ہوتی ہے ●

رہا یہ سوال کہ جب محمد خاوند شاہ نے خود ہی سلطان محمود غزنوی کی خدمت اسلام کو نہایت شاندار الفاظ میں تحریر کیا ہے تو پھر اس نے سلطان کے خلاف دیدہ و دانستہ ایسی مہمل اور لغو اور خلاف واقعہ تہمت کیوں تراشی؟ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ محمد خاوند شاہ کو سنسنی پیدا کرنے والے واقعات لکھنے کا شوق تھا مگر وہ ایسے واقعات کو تاریخی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہی صحیح سمجھ لیتا تھا۔ ہمارے اس قول کے ثبوت میں ضمیمۂ "روضۃ الصفا" اور اسی نوع کی دیگر دستاویزات جو کتاب مذکور میں ہی اکثر جگہ تحریر ہیں پیش کی جا سکتی ہیں چنانچہ اسی طرح کی ایک اور داستان وہ عہد نامہ ہے جو بقول محمد خاوند شاہ نظام الملک طوسی حسن بن صباح اور عمر خیام نے زمانہ طالب علمی میں مرتب کیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ حکیم ابو علی سینا اور سلطان محمود غزنوی کے اس فرضی واقعہ کے متعلق عرب مؤرخ مثلاً علامہ ابن خلدون، الفخری، ابن ابی الضیباء، الاثیر وغیرہ بالکل خاموش ہیں یہاں تک کہ بیہقی نے بھی اپنی کتاب "تاریخ مسعودی" میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ایرانی مؤرخ اپنی غلط بیانیوں اور ناقابل اعتماد تحریروں کی وجہ سے بدنام ہیں۔ چنانچہ اس مہمل داستان کے مصنف بھی وہی ہیں ● اس کے علاوہ اس غلط بیانی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی اہل سنت والجماعت سے تھا اور محمد خاوند شاہ شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلئے ممکن ہے کہ اس نے مذہبی تعصب کی بنا پر اس غلط بیانی کو روا رکھا ہو۔ نظامی نے تو صرف یہ لکھا ہے کہ سلطان محمود نے علماء و حکماء کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا لیکن اس نے سلطان کی نیت پر کہیں حملہ نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد محمد خاوند شاہ نے تحریر کیا ہے کہ سلطان نے حکیم ابو علی سینا کو اس لئے طلب کیا تھا کہ اسے اس کے شیعی عقاید کی سزا دے۔ لیکن "نامۂ دانشوران" جو شاہ نصیر الدین قاچار کے عہد میں تالیف ہوئی اس کے مؤلفین نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ سلطان محمود حکیم ابو علی سینا کو اس کے شیعی عقاید کی پاداش میں قتل کر دینا چاہتا تھا ؎ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

(سید محمود مؤرخ)

غزل

اے خریدارانِ دل! دل چاہیئے، دل چاہیئے
دل سہی دولت اور تم، دل لینے کو دل چاہیئے

میں گیا دل کھو کے بزمِ حسن میں، آئی صدا
یہ تو دل والوں کی محفل ہے یہاں دل چاہیئے

بحرِ غم میں ڈوب کر اُچھلے، تو بیڑا پار ہے
عشق کے پیراک کو کشتی نہ ساحل چاہیئے

گنبدِ ایوانِ لیلا ہے بگولا دشت کا
نقشِ پا ہے خضرِ منزل شوق منزل چاہیئے

آنکھ ساغر، خونِ دل مے اور ساقی یادِ دوست
ایسی خلوت چاہیئے اور ایسی محفل چاہیئے

تو ہو سرمستِ خودی میں بیخودی میں یار خوب
دُور اس دُنیا سے دُور ایک ایسی محفل چاہیئے

بجھ گیا دل، اب قفس ہے اور یادِ آشیاں
سیر پھولوں کی، نہ گلبانگِ عنادل چاہیئے

اپنے مجنوں کو عطا کر دے ولایت عشق کی
ذکر تیرا زندگی جس کی ہو، وہ دل چاہیئے

حسن تجھ کو ڈھونڈنے آئیگا او گرمِ تلاش
عشق کی معراج یعنی جذب کامل چاہیئے

برقِ خرمن سوز پر اُڑ کر گرے پروانہ وار
مزرعِ اُمید کا نشتر وہ حاصل چاہیئے

(نشتر جالندھری)

خزاں

گزری ہوئی بہار کو ہم بھول جائینگے
اُجڑے ہوئے چمن میں مسرت کو پائینگے

اس زندگی سے دُور ہمیشہ کے واسطے
ہم ایسے جائینگے کہ کبھی پھر نہ آئینگے

دُنیا سے دُور جا کے ملیگا سکون جب
چھوٹی سی اِک اُجاڑ میں جنت بنائینگے

ناشاد و نامراد جو دِل عمر بھر رہا
اس دِل کو اب خوشی سے لحد میں سلائینگے

تاریک شب میں دل کی تسلی کے واسطے
خاموش تارے چمکیں گے اور جھلملائینگے

غم خوار ہوں گے طائرِ شیریں بیاں مرے
ہر صبح و شام وہ مجھے نغمے سنائینگے

روتے ہیں تیری یاد میں عہدِ گذشتہ ہم
تیری طرح نہیں کہ تو ہمیں بھول جائینگے

کر کر کے یاد تیری تغافل شعاریاں
آنکھوں سے سیلِ اشک ہمیشہ بہائینگے

"بے نوا"

محفلِ ادب

بازگشت

سجاد

اب مرے خوابوں میں تو آتی ہے کیوں؟ گیت پھر اُمید کے گاتی ہے کیوں؟

تُو نے جب ٹھکرا دیا میرے نیازِ عشق کو کر دیا محروم نغمہ میرے سازِ عشق کو

تُو نے مجھ سے میری دُنیائے محبت چھین لی میری جنت، وہ مری تنہا مسرت چھین لی

تیرے جلوے میرے غمخانے سے بیگانہ رہے تیرے نغمے میرے ویرانے سے بیگانہ رہے

میرے اشکوں کو ترے دامن کی حسرت ہی رہی میرے غم کو تیری پُرسش سے شکایت ہی رہی

بیچ دی میری محبت تُو نے دولت کے لئے کر دیا قرباں مجھے اپنی مسرت کے لئے

پھر مرے خوابوں میں تُو آتی ہے کیوں؟
گیت پھر اُمید کے گاتی ہے کیوں؟

"گلستان"

قدیم ہندوستانی معاشرت

(ای جے ایچ۔ میکے ایم بی۔ اے)

۱۹۲۱ء سے قبل ہم ہندوستان کی تاریخ ۱۵۰۰ ق م سے شروع کرنے کے عادی تھے۔ یعنی اس زمانے سے جب ماہرین تاریخ کے نزدیک ہندوستان میں آریہ وارد ہوئے لیکن گذشتہ دوازدہ سال کے عرصے میں جدید انکشافات نے اور ایک ہزار سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے کے حالات کو نمایاں کر دیا ہے۔

قدیم شہر موہنجوداڑو کے تودہ ہائے خاک و خشت دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے پاس کراچی کوئی دو سو ستر میل شمال کی طرف پڑے ہوئے ہیں۔ شہر مذکور کے وسیع کھنڈر تقریباً ایک مربع میل قطعہ زمین پر حاوی ہیں۔ یہ ایک دریا برآمد میدان میں واقع ہیں جس کی معقول طور پر آبپاشی بے انتہا سرسبزی اور شادابی پیدا کرے گی۔ فی الحال یہ ایک خشک اور بنجر ویرانہ ہے جس میں گرمی کے

گرد آلود درختوں اور گھنی خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ اس شہر کے مغرب کی سمت تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر بلوچستان کے کِرتار نامی سلسلۂ کوہ کا دامن ہے جو گرد و غبار کی دھند میں بہت حد تک نظر نہیں آتا۔ شمال جنوب اور مشرق کی طرف ملک کے وہ خطے ہیں جن میں ازمنۂ اولیٰ ہی سے کاشتکاری کا سلسلہ چلا آتا ہے۔ آج کل دریائے سندھ شہر سے تین میل کے فاصلے پر بہتا ہے لیکن اس بات کی واثق شہادتیں موجود ہیں کہ یہ بلدۂ قدیم اس دریا کے یا اس کے کسی قابل ذکر معاون کے مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ چنانچہ منہجو دارو کو شمالی ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی بہت آسائشیں حاصل تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اس بات کے دلائل بھی موجود ہیں کہ خلیج فارس کے رستے سے عراق اور ایران کے ساتھ بھی اس کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں ساحل بحر موجودہ محل وقوع سے کسی قدر شمال کی طرف تھا جیسا کہ ہمیں خلیج فارس کے شمال مغربی ساحل کے متعلق معلوم ہوا ہے۔ بعید نہیں کہ اُس زمانے کی بندرگاہ کہیں ٹھٹہ کے قرب و جوار میں واقع ہو۔

غالباً اس شہر کا اہم ترین حصہ وہ تھا جو آج مغرب کی سمت ایک بلند پشتے کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جس کی چوٹی پر مہاتما بدھ کا ستوپا (معبد) اور صومعہ استادہ ہے۔ اس ٹیلے میں وہ کشادہ اور وسیع حوض بھی ہیں جن کی کھدائی سر جان مارشل نے کی ہے۔ ذرا شمال کی جانب آٹھ نہایت نفیس غسل خانوں کی دو قطاریں ہیں۔ علاوہ بریں ایک بلند عمارت پر ایک بودھی معبد کھڑا ہے جو قریباً ۲۰۰ عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اُس کے قریب جانا ناممکن ہے اس خیال سے کہ مبادا معبد اور صومعہ کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

ہندوستان اور بعض دیگر ممالک کے مقدس مقامات کے قرینے سے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ستوپا کے نیچے جو عمارت ہے وہ بھی کوئی جائے متبرک بلکہ درحقیقت کوئی مندر تھی۔ اس عمارت کو بنظر تعمق دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ منہجو دارو میں کوئی اور عمارت ایسی نہیں جسے وثوق کے ساتھ شہر کی عبادت گاہ کہا جا سکے۔

مذکورہ بالا غسل خانوں کے دروازے ایک درمیانی رستے میں کھلتے ہیں جس میں ایک نفیس بدرو چلتی ہے۔ ہر کمرے میں نہانے کا عجیب و غریب بندوبست تھا۔ ہر کمرے میں نہایت چابکدستی سے فرش لگایا گیا تھا جس کے ایک طرف ڈھلوان ہوا کرتی تھی تاکہ پانی اندرونی نالی کے رستے سے بہ کر بآسانی بیرونی نالی میں جا گرے۔ ان غسل خانوں کی تعمیر میں یہ احتیاط برتی گئی تھی کہ کسی ایک کا دروازہ کسی دوسرے کے عین بالمقابل نہ ہو۔ دروازوں کے جوانب اس قدر مضبوط اور ٹھوس بنائے گئے تھے کہ رستے میں سے گذرتا ہوا کوئی شخص اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر غسل خانے میں سے اُوپر کی منزل کو سیڑھیاں چڑھتی تھیں جو اب منہدم ہو چکی ہیں۔ اس تمام انتظام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ لوگ ستر و اخفا کو بہت ملحوظ رکھتے تھے۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ یہ حمام صرف تہواروں کے موقع پر کوئی سنت پوری کرنے کے لئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔

مذہب اللہ کے پجاری غالباً بالائی منزلوں کے حجروں میں مقیم ہوا کرتے تھے۔ اور ہر ایک کے لئے ایک حمام وقف ہوا کرتا

تھا۔ ان غسل خانوں کے لئے پانی ایک کنویں سے حاصل کیا جاتا تھا جو عمارت کے جنوب مشرقی کونے میں واقع تھا۔ پانی کنویں سے نکال کر مٹی کے گھڑوں میں رکھا جاتا تھا۔ ان گھڑوں کے کئی ریزے مختلف کمروں میں پائے گئے ہیں۔ شاید شہر کے اس محلے میں سب لوگوں کے نہانے کا بندوبست تھا۔ اگرچہ خیال ہے کہ یہ عمارت محض مذہبی تقدس گاہ تھی اور حمام بھی مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے برتے جاتے تھے۔ ممکن ہے وہ عظیم الشان تالاب عوام کے نشست وشو کے لئے ہو اور مذکورہ بالا کمروں میں صرف پجاری غسل کرتے ہوں۔

اکثر غیر اہم بازار اور گلیاں بھی کھدائی کے بعد نہایت اعلےٰ اور موثر نظر آنے لگی ہیں۔ اگرچہ ازمنۂ قدیمہ میں کسی طرح ان کی یہ ہیئت نہ ہو گی۔ ان گلیوں کی بعض دیواریں بیس فٹ اونچی ہیں۔ اس زمانے میں طغیانی اور شورہ کے اثر سے یہ دیواریں کئی جگہوں پر شکستہ و ریختہ ہو گئی تھیں اور در حقیقت بہت زبردست مرمت کی محتاج تھیں۔ بعض اوقات بھلی بری مرمت کر بھی دی جاتی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ معمار بنیادوں کی مرمت کرتا ہوا اس بات سے خائف ہوتا تھا کہ کہیں دیوار کی دیوار اس کے سر پر نہ آ گرے۔

زیریں سطحوں پر مکانات نسبۃً نفیس اور معماروں کی چابکدستی کے شاہد ہیں۔ شہر کی تاریخ کے وسطی زمانے تک مکانات بغیر کسی استثنار کے نہایت مضبوط بنائے جاتے تھے۔ بعض عمارتوں میں جوڑ اس قدر مدہ ہیں کہ تیز اور باریک چاقو سے بھی ان میں سوراخ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید نفاست یہ ہے کہ اینٹیں چن دینے کے بعد اکثر اوپر سے صاف اور ہموار کر دی جاتی تھیں۔ پختہ اینٹوں کا استعمال عام تھا اور اینٹیں موجودہ انگریزی اینٹوں سے کسی قدر بڑی، اسی شکل کی اور اتنی ہی نفیس ہوا کرتی تھیں۔

اکثر مکانات دو منزلہ ہوا کرتے تھے۔ بالائی منزل پر جانے کے لئے اینٹوں کی بنی ہوئی بہت تنگ سیڑھیاں ہوا کرتی تھیں کیونکہ ایک ایسے گنجان اور معمور شہر میں جگہ کی کفایت ضروری ہو گئی تھی۔ اکثر اوقات بہت وسیع اور بڑے بڑے زینے بھی تعمیر کئے جاتے تھے۔ اس کا ثبوت اس زمانے کے بنے ہوئے ایک دوہرے زینے کے انکشاف سے ملا ہے جس کی سیڑھیاں کافی کشادہ لیکن پست ہیں۔ ہر سیڑھی کی اونچائی صرف تین انچ ہے۔ یہ زینہ یقیناً کسی اہم عبادتگاہ سے تعلق رکھتا ہو گا جس کی خالی بنیادیں باقی ہیں۔ یہ عمارت مٹی کے پشتے کے کنارے پر واقع تھی۔

شہر کی صفائی کا انتظام نہایت اعلےٰ اور بہمہ وجوہ مکمل تھا۔ یہ بات توجہ طلب ہے کیونکہ اس کی مثال ہندوستان کے باہر بھی اس عہد کے کسی شہر میں نہیں ملتی۔ ہر ایک زمانے میں بازاروں کے عین وسط میں نہایت محنت سے بنائی ہوئی نالیاں بہتی تھیں۔ اور بعض مقامات پر یہ نالیاں گلی کے دونوں اطراف پر بہتی تھیں اور ہر مکان سے چھوٹی چھوٹی نالیاں نکل کر ان سے آ ملتی تھیں۔ بازاروں کی نالیاں عام طور پر پختہ بنائی جاتی تھیں۔ لیکن جب بہت کشادہ نالیاں بنانا مد نظر ہوتا تھا جیسا کہ وسطی زمانے میں رواج ہو گیا تھا تو اینٹوں کی بجائے کھردرے پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ ان پتھروں کے کنارے بازار کی سطح کے برابر یا کسی قدر نیچے ہوا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض راہگیروں کے قدموں کی رگڑ سے چمک اٹھے! اس مقام پر میں اس بات کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں کہ موہنجوداڑو کے

بازاروں اور نالیوں کی صفائی کے ساتھ معاینہ کا بھی باقاعدہ انتظام تھا۔ قیاس ہے کہ یہ فرض بلدیہ کے ملازمین سرانجام دیتے ہونگے۔ ہم آج بھی ان نالیوں کے قریب ریت اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر پاتے ہیں جو نالیوں میں سے باہر نکال کر یہاں ڈالے گئے تھے۔

ازمنۂ قدیمہ میں یقیناً آج کل کی نسبت بارش کی افراط تھی۔ چنانچہ بعض مقامات پر طغیانیوں کا پانی باہر نکالنے کے لئے زیر زمین رستے بنے ہوئے تھے۔ یہ رستے اوپر سے ڈھکے رہتے تھے۔ مگر ان کے چھتوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے تھے تاکہ اوپر سے پانی ان میں جا سکے۔ ۲۷۵۰ ق۔م کے قریب ان نالیوں کی تعمیر "سینیٹری انجنیرنگ" کا محیر العقول کرشمہ ہے اور اس بات کا ثبوت کہ وادیٔ سندھ کے انسان تہذیب کی بہت بڑی معراج پر پہنچ چکے تھے۔

تاہم شہر کے نظام صفائی کے بعض ناقابل ستائش پہلو بھی ہیں۔ گھروں کی نالیاں اکثر بیرونی دیواروں میں سے باہر نکالی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ سندھ کے بڑے بڑے شہروں میں آج کل بھی رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک گرم ملک میں بند نالیوں پر کھلی نالیوں کو ترجیح دینی چاہیئے کیونکہ مؤخر الذکر اس قدر جلد تعفن پذیر نہیں ہوتیں۔

مہنجوداڑو کا فن تعمیر، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اپنے اوصاف میں بالائی سطحوں پر آہستہ آہستہ رو بانحطاط ہوتا گیا اور شہر کی آخری دو ساختوں میں مکانات نہایت بھدے بننے لگ گئے۔ شہر کی تیسری تعمیر کا انجام اس طرح ہوا کہ طغیانی آ گئی اور امیر لوگ مکان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس آخری طغیانی سے پہلے بھی کئی بار طغیانیاں رونما ہوئیں۔ عہد وسطےٰ کی تیسری تعمیر کے دوران میں ایک غیر معمولی طور پر آفت خیز سیلاب آیا۔ ابھی چار ہی سال کا عرصہ ہوا ہے کہ دریائے سندھ میں سیلاب آ گیا اور مہنجوداڑو کے کھنڈر ہوتے ہوتے بچے۔ اس کا عجائب گھر اور ملازمین کے مکانات معرض خطر میں آ گئے۔ لیکن سے فی الفور یہ انتظام کیا گیا کہ ایک بہت بڑا بند لگا کر سیلاب کا رُخ بدل دیا گیا۔

مہنجوداڑو کی کھدائی پر جو مزدور لگائے گئے وہ سندھیوں، براہویوں اور بلوچیوں پر مشتمل تھے۔ کھدائی کا افسر اعلےٰ خود ایک براہوئی تھا۔ ان براہویوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ مہنجوداڑو کے قدیم باشندوں کی اولاد ہیں۔ چنانچہ ان کے فن اور ان کی صناعی پر کچھ رائے زنی کرنے سے پہلے اس مسئلے کا حل ضروری ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟

لیکن ابھی اس سوال کا جواب پورے وثوق سے نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ہمارے پاس براہویوں کے اس دعوےٰ کی کوئی مستحکم شہادت ہی موجود ہے۔ چند انسانی ڈھانچوں کے معائنے کے بعد ڈاکٹر گوہا جو زولاجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ وہ بہت حد تک لمبوترے سروں اور بڑے ناکوں والی نسل انسانی سے تھے۔ ان کی کھوپڑیوں کی محراب اوپر کو اٹھی ہوتی تھی اور اہل سمیریا کی طرح ان کی ناک لمبی ہوتی تھی۔ کھوپڑیاں دو مختلف قسم کی دستیاب ہوتی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کے خط و خال بالکل منگولیائی ہیں۔ یہ بات اور زیادہ دلچسپ ہے کہ نیز یہاں پر چند مٹی کے بت ملے ہیں جن کی وضع بھی بالکل منگولیائی ہے۔ ڈاکٹر گوہا کی رائے ہے کہ مہنجوداڑو کے دو عناصر ایک زمانے میں مخلوط ہو گئے تھے۔ دوسری قسم کی کھوپڑیاں ان کھوپڑیوں سے مشابہ ہیں جو تل العبید میں پائی گئی ہیں، اور تیسرے

خیال میں اس بات کا انکشاف چنداں حیرت انگیز نہیں کہ وادیٔ سندھ اور وادیٔ دجلہ و فرات کے انسانوں میں کوئی نہ کوئی نسلی تعلق ضرور تھا۔ اگرچہ اب ان کے لئے "ہندی سمیریائی" کی اصطلاح استعمال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ ہم پہلے کرتے رہے ہیں۔

جو کھوپریاں فراہم کی گئی ہیں، وہ محض ان لوگوں کی نہیں جو طبعی موت سے زیر زمین دفن کئے گئے تھے۔ بلکہ مسٹر مارگریوز کو بہت سی ایسی کھوپریاں دستیاب ہوئی ہیں جن کی شکل و صورت بے حد مسخ شدہ حالت میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ کسی اتفاقی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ اور غیر متوقع طور پر مٹی کے ڈھیر تلے دب گئے تھے۔ یہ کھوپریاں بالائی سطح کے قریب ہی پائی گئی ہیں چنانچہ ان کا تعلق شہر کے آخری عہد تعمیر کے ساتھ تھا۔

کچھ بہت زیادہ سال نہیں ہوئے کہ آخری عہد تعمیر کے چند اور اسی نوع کے باقیات، اس انبار کے نیچے سے ملے جس کا نام ڈی۔ کے ایریا رکھا گیا ہے۔ یہ نو آدمیوں کے ڈھانچے اور دو ہاتھی دانت پر مشتمل تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حملہ آوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ جو غالباً بلوچستان کی طرف سے وارد ہوئے تھے۔ ان کی ہنگامی موت کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ ان میں سے ایک کا سر دھڑ سے بالکل جدا ہے اور باقی ماندہ کے اعضا مجروح اور مضروب نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہاتھی دانت کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کا جواب دشوار ہے۔ ممکن ہے یہ گروہ ایک خاندان کے لوگوں کا ہو جو شہر سے بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ اپنے ساتھ تھوڑا بہت تجارتی مال بھی لئے جا رہے تھے کہ دفعتاً قابو آ گئے اور مارے گئے۔ ان میں مرد بھی ہیں۔ عورتیں اور بچے بھی۔ جب ان کا باقی مال و متاع لوٹ لیا گیا تو حملہ آوروں نے ہاتھی دانت کو اپنے لئے بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا۔

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیلاب کے علاوہ شہر کے لوگوں کو کئی اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور میری رائے ہے کہ انہیں بلوچستان کے قبائل کا ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جیسے آج کل شمال مغربی سرحد کے قبائل بے حد اندیشہ ناک ہیں۔ تاہم جب شہر اپنی قوت اور عظمت کی معراج پر تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی مدافعت کیلئے کافی طور پر چاق و چوبند تھا۔ اس بات کا قطعی طور پر کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس زمانے میں شہر پر کبھی کسی نے یورش کی ہو یا شہر کے کسی حصے میں آگ لگا دی ہو جیسا کہ سمیریا کے کئی شہروں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔

یہ بات کہ اس شہر کے سمیریا اور ایلم کے ساتھ وسیع تجارتی تعلقات تھے ان کثیر التعداد مہروں سے ثابت ہوتی ہے جو ہندوستان کے کاریگروں کی محنت کا نتیجہ ہیں اور مذکورہ بالا دونوں شہروں کے کھنڈروں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان ہندوستانی مہروں کے علاوہ جو وہاں سے دستیاب ہوئی ہیں۔ وادیٔ سندھ میں سمیریا اور ایلم کے علاقوں کی بہت سی اشیا ملی ہیں۔

جس قدر ثبوت مہیا ہو چکے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے مغربی ایشیا کے کسی علاقے سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے لیکن ان کے آنے کا راستہ اور زمانہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کے مذہبی عقائد کے متعلق ہمیں جو تھوڑا بہت علم حاصل ہوا ہے اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے قدیم مذاہب کے رسوم کو اختیار کر لیا

تھا۔ مجھے یہ قیاس حیطۂ امکان میں نظر آتا ہے کہ کمیر یا کے رہنے والے وادیٔ سندھ کے باشندوں سے کسی دور کے رشتے کا احساس ضرور رکھتے تھے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو قدرتاً اس وجہ سے اُن کے درمیان تجارتی تعلقات کے قیام میں آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان ایسے تعلقات ضرور تھے۔

(ترجمہ علیم الدین شمسی) —————— "نخلستان"

مطبوعات

تاریخ صقلیہ۔ جلد اول۔ حجم ۵۱۶ صفحات۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس۔ قیمت للعہ روپیہ پتہ :- دار المصنفین اعظم گڑھ سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین و سب ایڈیٹر معارف نے "صقلیہ" کی یہ جامع اور پُر از معلومات تاریخ لکھ کر نہ صرف اُردو زبان پر احسان کیا ہے۔ بلکہ اسلامی تاریخ کی بھی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

کتاب موجودہ فنِ تاریخ کے اصول پر ہر طرح پوری اُترتی ہے۔ ہمارے خیال میں اردو میں بہت کم تاریخی کتابیں اس فنی مہارت کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مصنف کا اندازِ بیان نہایت شستہ، حشو و زوائد سے پاک اور ایک متین تاریخی تصنیف کے ہر طرح شایانِ شان ہے۔ صقلیہ کو اقبال نے اپنی مشہور نظم میں تہذیبِ حجازی کا مزار کہا ہے۔ اس مزار کی یہ گداز داستان ہر دردمند مسلمان سے آنسوؤں کا خراج ضرور وصول کریگی۔ ہماری رائے میں کوئی اسلامی کتب خانہ اس کتاب سے محروم نہیں رہنا چاہیئے۔

انجمن ترقیٔ اُردو کی مطبوعات

ہمیں انجمن ترقیٔ اردو کی حسبِ ذیل کتابیں موصول ہوئی ہیں۔ اس انجمن کی مطبوعات کے متعلق کسی قسم کی رائے یا حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کی ہر کتاب اردو ادب میں ایک درجۂ امتیاز رکھتی ہے۔ ذیل میں ہم محض ایک مختصر فہرست دینے پر اکتفا کرتے ہیں:-

تذکرہ ریختہ گویاں۔ مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی۔ مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب [illegible]۔ قیمت [illegible]

[illegible] کا اثر۔ ۱۳۲ صفحات۔ مولوی عبدالحق صاحب کا [illegible] مقدمہ۔ قیمت [illegible]

اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصّہ:- حجم ۷۰ صفحات - از مولوی عبدالحق صاحب - قیمت ۸ر

ترکوں کی اسلامی خدمات - ڈاکٹر جولیس جرمانس کے تین لیکچروں کا با محاورہ ترجمہ - قیمت ۱۲ر

داستان رانی کیتکی و کنور اودے بھان - مصنفہ سید انشا مرحوم - قیمت ۴ر

جنگنامہ عالم علی خان - نواب آصف جاہ نظام الملک اور عالم علی خان صوبہ دار دکن کی جنگ کا منظوم حال - مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب - قیمت ۶ر

مخزن شعراء - یعنی تذکرۂ شعرائے گجرات - مؤلفہ قاضی نورالدین حسین خان رضوی فایق مرحوم - مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے - قیمت مجلد ۱۲ر - غیر مجلد ۱۲ر

مرحوم دہلی کالج - از مولوی عبدالحق صاحب بی اے دہلی کالج کی جامع تاریخ اور اس ضمن میں انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کی تشریح - حجم ۱۷۰ صفحات بڑا سائز قیمت ۱۲ر - یہ سب کتابیں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے منگوا لیجئے +

مثنوی تغلق نامہ خسرو دہلوی :- تہذیب و تحشیہ از سید ہاشمی فرید آبادی - یہ کتاب سلسلۂ مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی ہے - یہ انجمن حال ہی میں قائم ہوئی ہے اور اس کی مجلس عاملہ میں دیگر قابل حضرات کے علاوہ مولوی عبدالحق صاحب علامہ عمادی صاحب نواب مسعود جنگ بہادر - نواب صدر یار جنگ بہادر، اور نواب حیدر نواز جنگ بہادر سی شخصیتیں شامل ہیں - دکن کی علمی خدمات کے سلسلہ میں یہ انجمن ایک مفید اور اہم اضافہ ہے - یہ کتاب امیر خسرو نے سلطان غیاث الدین کی فرمایش پر لکھی تھی یہ مثنوی دنیا کی بہترین منظوم تاریخوں میں شامل ہونے کے قابل ہے - ابتدا میں ہاشمی صاحب نے نہایت قابلیت سے دیباچہ لکھا ہے - قیمت فی نسخہ مجلد چار روپے - پتہ :- مجلس مخطوطات فارسیہ نام پلی - حیدرآباد دکن

ترکانِ احرار (طبع ہفتم) مصنفہ مولنا عبدالمجید صاحب عتیقی - قیمت ۱۲ر - مجلد ۸ر - کامل بک ڈپو لاہور سے منگوا لیجئے حضرت عتیقی متعدد تاریخی کتابوں، سیرتوں اور طبی کتابوں کے مؤلف ہیں - ۱۹۲۶ء میں ایک ڈاکٹر کی نادانی اور بے پروائی سے اُن کی بینائی زایل ہو گئی - لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور علمی خدمت انجام دے رہے ہیں ان کی موجودہ کتاب بے انتہا مقبول ہوئی ہے چنانچہ اب ساتویں بار چھپی ہے - یہ کتاب ترکی کی گذشتہ ربع صدی کی تاریخ ہے - اس میں ان تمام ترک مردوں اور عورتوں کے حالات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے گئے ہیں - جنہوں نے موجودہ ترکی کی تشکیل میں حصّہ لیا - کتاب میں بیسیوں ہاف ٹون عکسی تصاویر بھی دی گئی ہیں جس سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے - ہم شائقین سے اس کتاب کی پرزور سفارش کرتے ہیں - حضرت عتیقی ہر طرح کی حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں +

ادبی دنیا
میں صرف اعلیٰ پایہ کی نظمیں اور افسانے چھپتے ہیں
اسلئے
اعلیٰ پایہ کے لوگ صرف ادبی دنیا خریدتے ہیں
مینیجر ادبی دنیا لاہور

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

ہندوستان کا واحد اُردو جریدہ جو تنقید صحیح کا اعلیٰ معیار رکھتا ہے

اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان میں نگار ہی پہلا رسالہ ہے جس نے لوگوں کو قدامت پرستی کے راستہ سے ہٹایا اور جس نے زندگی کے تمام شعبوں پر تنقید کرکے پبلک کو عقل سے کام لینے کا درس دیا۔ اس کے مذہبی مقالات، اس کی ادبی تنقیدیں، اس کی تحقیقات تاریخی، اس کے معیاری افسانے، اس کی بلند پایہ نظمیں، الغرض اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک خاص رنگ لئے ہوتا ہے جس میں کوئی اور رسالہ اسکا شریک نہیں ہے۔

ہر سال جنوری کا پرچہ خاص اہتمام سے ضخیم نکلتا ہے اور اس کی قیمت زاید نہیں لیجاتی۔

جنوری سنہ ۳۵ء کا رسالہ لکھنؤ و دہلی اسکول کے شاعری کے متعلق نہایت ضخیم "لفظ آخریں" کی حیثیت سے اس طرح نکلنے والا ہے کہ پھر اس کے بعد اس موضوع پر نہ کسی کو لکھنے کی ضرورت ہوگی نہ گفتگو کرنے کی۔ قیمت سالانہ صہ، ششماہی سے،

نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں اور ادبی مقالات کے مجموعے

جمالستان۔......... قیمت علاوہ محصول .... للعہ،

نگارستان۔......... " .... عا،

دونوں کی مجموعی قیمت معہ محصول سے،

منیجر نگار لکھنؤ

اردو ادب کا بہترین ماہنامہ
جہانگیر
ناظرین کی خدمت میں ایک ہزار سے زائد صفحات سالانہ پیش کرتا ہے جن میں بہترین اصلاحی افسانے محققانہ علمی مقالے،
بصیرت افروز تنقیدی مضامین مسحور اثر نظمیں روح پرور غزلیں اور قہقہہ بدامن مزاحیہ مضامین ہوتے ہیں۔
ماہ مئی سے اس کے معیار اور ضخامت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ چار روپے تین آنہ (للعہ) سالانہ قیمت میں عام
پرچوں کے علاوہ دسمبر میں سالنامہ اور ستمبر میں نظام نمبر پیش کئے جاتے ہیں۔
ستمبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہونیوالا نظام نمبر گذشتہ سال سے ہر طرح بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ نظام نمبر ۱۹۳۲ء کا مطالعہ
کرنے والے حضرات تازہ نمبر کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔
نظام نمبر ۱۹۳۴ء کی اہم خصوصیت
اس میں حضرت یزدانی میرٹھی مرحوم۔ حضرت حافظ شیرازی رح اور حضرت امیر خسرو رح کا غیر مطبوعہ کلام
بھی شائع ہوگا۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے فی پرچہ۔
اسے مفت حاصل کرنے کے لئے پہلی فرصت میں للعہ کا منی آرڈر ارسال فرما کر سالانہ
خریداری قبول فرمائیں۔
منیجر رسالہ جہانگیر۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۰-۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتًہ بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

بیرورق و تصاویر در زینتہ پریس بل روڈ لاہور طبع شد

افسانہ نمبر

فہرست مضامین

جلد (۲۶)

"ہمایوں" بابت ماہ اگست ۱۹۳۴ء

نمبر (۲)

تصاویر:- بھولے ہوئے افسانے (رنگین) ۲- لکھنؤ اور اس کے پھول ۳- لکھنؤ اور شاہ بلوط

چندہ سالانہ ہے مع محصول ڈاک — ششماہی سے ر مع محصول ڈاک — قیمت فی پرچہ افسانہ نمبر ۱ر

افسانہ نمبر

کے

انعامی مقابلے کا فیصلہ

پہلا انعام { مسٹر شرف عالم آرزو جلیلی ایم ایس سی ریسرچ سکالر
محترمہ ح۔ب صاحبہ

دوسرا انعام ۔ پروفیسر سید فیاض محمود ایم۔اے

پہلا انعام تیس روپے کا مقرر تھا اور دوسرا پندرہ روپے کا۔ لیکن چونکہ دو افسانے اول درجے کے قرار دیئے گئے۔ اس لئے پہلے انعام کی رقم تیس روپے سے بڑھا کر پچاس روپے کر دی گئی اور پہلا انعام پانے والوں کو دو مساوی حصوں میں تقسیم ہوئی۔ پہلا انعام "مجبورِ محبت" اور "صنوبر" پر اور دوسرا "لمعات" پر دیا گیا۔

ان افسانوں کے علاوہ "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" اور "شاہراہ" پر بالخصوص بہت قابلِ تعریف سمجھے گئے۔

ایڈیٹر

"بزمِ ہمایوں"

لیجئے "ہمایوں" کا افسانہ نمبر آپکے ہاتھوں میں ہے۔ ساڑھے بارہ سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے اپنا ایک پرچہ کلیتہً افسانوں کے لئے وقف کر دیا۔ شاید اب اِس الزام کی تلافی ہو سکے کہ ہمایوں ایک "دقیق اور خشک علمی رسالہ" ہے جو تفریحات سے کنارہ کش رہنا اپنے لیئے باعث فخر سمجھتا ہے۔

آدمی کس کس کو خوش کرے۔ اس پرچے کا اعلان پڑھتے ہی بعض حضرات نیکار نے لگے ہیں کہ آخر آپ بھی مفید علمی و ادبی خدمت اور "ٹھوس" مضامین کو چھوڑ کر تفریحی مشاغل پر اتر آئے!

ہماری رائے میں یہ دونوں الزامات درست نہیں۔ "ہمایوں" کبھی خشک رسالہ نہیں رہا بلکہ ہم دقیق سے دقیق مضامین کو بھی سہل الفہم اور دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے خوگر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ علمی مضامین کے ساتھ نظمیں، افسانے اور لطیف ادب کے مضامین شائع کرنا "ہمایوں" کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے ہمارے اکثر معاصرین نے قابل قبول سمجھا ہے البتہ ایک لحاظ سے "ہمایوں" ضرور خشک ہے کیونکہ اس میں نام نہاد "تر" نظمیں "تر" افسانے اور "تر" ادب لطیف کے مضامین کبھی شائع نہیں ہوئے۔ ہماری دعا ہے کہ دوسرے معاصرین بھی یہ شیوہ اختیار کر لیں "تر" ادباء کی قلم کاریوں کا خاتمہ کرکے اُردو ادب کو ان کے حملوں سے بچالیں جو حضرات مضامین میں معنی کے بجائے بھی صرف "تری" کی تلاش کرتے ہیں اُن کے لیئے شاید موجودہ پرچہ بھی خشک ہو۔

"ٹھوس" مضامین کے سرپرستوں کو واضح ہو کہ اعلیٰ درجے کے افسانے کسی ٹھوس علمی مضمون سے کم پایہ نہیں ہوتے۔ انسانی زندگی کے مطالعہ اور اس کی تنقید سے بلند پایہ کوئی علم نہیں اور ایک اچھے افسانے کی ایک ایک سطر "زندگی" کے ظاہر و باطن اس کی مختلف صورتوں اور اس کے اہم تجربوں کے ولآویز علم کی گنجینہ دار ہوتی ہے اس کا ہر لفظ اس قابل ہوگا کہ اس پر غور کیا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر اس کے ساتھ ہی افسانے سے انسان کی ذہنی تفریح بھی ہو جائے تو یہ اتنا بڑا جرم نہیں جو معاف نہ کیا جا سکے۔

موجودہ پرچے کے افسانے تقریباً پچاس بہترین افسانوں میں سے جو افسانہ نمبر کے لیئے آئے منتخب کیے گئے ہیں۔ افسانوں کی ترتیب میں خیال بھی رکھا گیا ہے کہ اُن کی نوعیت مختلف ہو۔ محبت کے موضوع پر قدرتاً ایک سے زیادہ افسانے ہیں لیکن اختلاف نوعیت اُن میں بھی موجود ہے۔ موجودہ افسانوں میں معیار ادبی کے نقطہ نظر کے علاوہ یہ خیال بھی رکھا گیا ہے کہ وہ خاص و عام کو پسند آئیں ورنہ اعلیٰ درجے کے افسانے عموماً عام ذہنوں کو متاثر نہیں کرتے۔

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

ایسے بزرگوار بھی ہیں جو غالب کی غزل سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے اور "دردِ دل" سنتے ہی سر دھننے لگتے ہیں +

یک آہنگی کے عیب سے بچنے کے لیئے موجودہ پرچے میں جابجا دلآویز نظمیں بھی شائع کر دی گئی ہیں موصولہ افسانوں میں، ہمیں کوئی مزاحیہ افسانہ ہمایوں کے معیار کے مطابق نہیں ملا۔ تقریباً تمام افسانے نفسیاتی یا فلسفیانہ ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض اچھے افسانے قلت گنجائش کی وجہ سے افسانہ نمبر میں شائع نہیں ہو سکے وہ آئندہ شائع ہوتے رہیں گے۔

تصویریں

(۱)
"بھولے ہوئے افسانے"

یہ تصویر جو نظم اور افسانہ نمبر کی مناسبت کے باعث دوبارہ اشاعت پذیر ہوتی ہے، البرٹ مور (۱۸۴۱-۹۳ء) کی ایک بہترین تصویر ہے۔ حسن کی تخلیق اس مصور کا مابہ الامتیاز ہے - وہ اپنی تصویروں کی خفیف سے خفیف جزئیات میں بھی حسن و آرائش کا خیال مدنظر رکھتا ہے - چنانچہ موجودہ تصویر میں بھی حسین عورتوں کے ملبوسات کے علاوہ دوسری چھوٹی چھوٹی اور مقابلۃً کم اہم چیزوں میں مور کے گلکار تخیل نے اپنا رنگ دکھایا ہے +

عورتوں کے بشرے کی کیفیات اور ان کے مختلف اندازِ نشست سے نفسیاتی مطالعہ کا ایک دلچسپ موقع بہم پہنچا ہے۔

---

(۲)
نکنو اور اس کے پھول
نکنو اور شاہ بلوط

یہ تصویریں افسانہ "گوبرپکم نکنو" سے متعلق، اور حضرت گرب پڑ کی "قوائے موز" تصویر کشی کے کمالات کا نمونہ ہیں۔ نکنو صاحب کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ آپ بغیر کسی کوشش کے یکدم ہمایوں میں چھپ گئے۔ حالانکہ صدہا ادیب ہنوز اس "اعزاز" کے منتظر ہیں +

پھولوں سے خدا جانے کیا گناہ سرزد ہوا کہ مولانا نکنو کلنک کا ٹیکا بن کر ان کے ماتھے پر تھپ گئے۔ ہاں کھوسٹ شاہ بلوط کے مقابل اس بوڑھے بوبک کا جھریوں بھرا چہرہ واقعی عجیب بہار دکھا رہا ہے ع کند ہم جنس با ہم جنس پرواز عنقریب دونوں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی +

سرورق:- افسانہ نمبر کا سرورق ہمارے نوجوان مصور مسٹر محمد شریف کی محنت کا نتیجہ ہے ہم اس کاوش کیلئے انکے ممنون ہیں۔

"ہمایوں"

بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
سازِ دلِ وحشی کے
ٹوٹے ہوئے تاروں پر
پھر چوٹ لگائے جا، رو رو کے رُلائے جا
اے دوست سنائے جا، بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
انجام سے بے پروا
آغاز کی باتیں کر،
معصومیٔ الفت کے ان خاص اشاروں پر،
نیک و بدِ عالم سے
بیگانہ بنائے جا
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
مجبوریٔ الفت کے،
اندوہِ محبت کے
دن یاد دلائے جا، رو اور رُلائے جا
اے دوست سنائے جا، بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے، اے دوست سنائے جا
مرگِ دلِ غمگیں کے
افسانۂ خونیں کا
ہر باب سنائے جا، رٹ اور مٹائے جا
اے دوست سنائے جا، بھولے ہوئے افسانے

بھولے ہوئے افسانے اے دوست سنائے جا
پھر اُس کی محبت کا دیوانہ بنائے جا
اُس حسنِ فروزاں کا پروانہ بنائے جا
جل اور جلائے جا،
جی اور جلائے جا،
اے دوست سنائے جا بھولے ہوئے افسانے

حامد علی خاں

مجبورِ محبت

(مشرقی جرمنی کے مشہور افسانہ نگار تھیوڈور سٹارم کا شاہکار)

(۱)

بوڑھا آدمی

موسم خزاں میں ایک دن سہ پہر کے وقت ایک بوڑھا آدمی عمدہ لباس زیب تن کئے سڑک پر آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اُس کے جوتوں پر گرد جمی ہوئی تھی اور وہ سنہرے دستے کی ایک خوبصورت چھڑی کو بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں، بال سیاہ اُن کے مقابلہ میں اس کے بال برف کی مانند سفید تھے۔ اُن سیاہ اور مخمور آنکھوں سے جن میں اُس کا گمشدہ شباب پناہ گزین تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بتدریج اس کی نگاہیں شہر کے مکانات پر جو شام کے سنہرے کہر میں ملفوف تھے، جم گئیں۔ وہ غالباً اجنبی تھا کیونکہ راہگیروں میں سے شاید ہی کوئی اُس کی طرف مخاطب ہوتا تھا، اگرچہ اکثر لوگوں کی توجہ اُس کی سنجیدہ، مخمور اور سیاہ آنکھوں کی طرف منعطف ہو جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک اونچے مکان کے دروازے پر پہنچا اور شہر پر ایک آخری نظر ڈال کر مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کی گھنٹی بجنے پر بیٹھک کے کمرے میں ایک سبز پردہ ہلا اور اس کے پیچھے سے ایک بڈھی عورت کا چہرہ نمودار ہوا جس کی طرف اس شخص نے چھڑی سے اشارہ کیا اور کہا: "ابھی لیمپ روشن نہ کرو۔" اس پر بڑھیا نے پردہ گرا دیا۔ ہمارا اجنبی اس کمرے اور اس کے سامنے والی کوٹھری سے گزرتا ہوا ایک دروازے کے سامنے پہنچا۔ یہاں سے سیڑھیوں کو طے کرتا ہوا وہ مکان کے بالائی حصہ میں پہنچا اور ایک وسیع کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہاں اطمینان اور راحت کا سامان موجود تھا۔ ایک دیوار میں الماریاں نصب تھیں جو کتابوں سے بھری پڑی تھیں۔ دوسری دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ میز پر چند کتابیں منتشر تھیں۔ ایک آرام کرسی بھی تھی جس پر سرخ مخمل کے گدے تھے۔ بوڑھے آدمی نے ٹوپی اتاری اور آرام کرسی پر بیٹھ کر کسی خیال میں گم ہو گیا۔ تاریکی بتدریج بڑھتی گئی اور آخر کار چاند کی روپہلی شعاعوں نے دریچہ سے داخل ہو کر ان تصویروں کو منور کر دیا جو سامنے کی دیوار پر آویزاں تھیں۔ اُس شخص کی نظریں غیر اختیاری طور پر ان روپہلی شعاعوں کے ساتھ دیوار کی طرف گئیں اور ایک چھوٹی سی تصویر پر جم گئیں، جو سیاہ چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔ "الزبتھ!" بوڑھے آدمی نے آہستہ سے کہا اور اس نام کے لیتے ہی زمانہ بدل گیا۔ وہ پھر عہدِ شباب میں واپس چلا گیا۔

---

(۲)
بچپن کی دوستی

ایک ننھی سی لڑکی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا نام الزبتھ تھا اور اس کا سن غالباً پانچ سال کا ہوگا۔ اس وقت ہمارے اجنبی نے شاید اپنی زندگی کے دسویں سال میں قدم رکھا ہو۔ لڑکی کے گلے میں سرخ رنگ کا ایک ریشمی رومال لپٹا ہوا تھا۔ لڑکی کی بھوری بھوری آنکھیں اس سرخی کے توازن سے اور بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ لڑکی نے کہا: "رائن ہارٹ! چھٹی ہے! آج چھٹی ہے اور کل بھی چھٹی ہے! اسکول بند ہے"۔

رائن ہارٹ نے بغل سے سلیٹ نکال کر دروازے کے پیچھے رکھدی۔ اس کے بعد وہ اور الزبتھ دونوں دوڑتے ہوئے باغ میں پہنچے اور باغ کے پھاٹک سے باہر نکل کر سبزہ زار میں آگئے۔ یکایک اسکول بند ہو جانے کی وجہ سے دونوں بہت خوش تھے۔ رائن ہارٹ نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان بنالیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ہر سال گرمی کے زمانے میں یہیں رہا کرے۔ مگر ابھی اس مکان میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی رائن ہارٹ نے تھوڑی سی کانٹی اور لکڑی کے تختے لے کر ایک کرسی بنائی۔ الزبتھ سبزہ زار میں ادھر ادھر چند خاص قسم کے پھلوں کی تلاش میں معروف ہوگئی تاکہ اپنے گلے کے لئے ہار تیار کرے۔ رائن ہارٹ کرسی تیار کرچکا مگر اس وقت تک الزبتھ واپس نہ آئی۔

اس نے پکارنا شروع کیا: "الزبتھ! الزبتھ!" اور وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"چلو ہمارا گھر تیار ہوگیا۔ تم بہت تھک گئی ہو۔ مکان کے اندر آجاؤ۔ ہم دونوں نئی کرسی پر بیٹھیں گے اور میں تمہیں کوئی قصہ سناؤں گا"۔

دونوں مکان کے اندر داخل ہوئے اور نئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ الزبتھ نے گود میں سے پھل نکال کر ہار تیار کرنا شروع کیا اور رائن ہارٹ قصہ بیان کرنے لگا: "کسی ملک میں تین جلاہے رہتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

الزبتھ نے کہا: "یہ قصہ تو میں بارہا سن چکی ہوں۔ تم ہمیشہ ایک ہی قصہ دہرایا کرتے ہو"۔

رائن ہارٹ شرما کر خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے اُس شخص کا قصہ بیان کرنا شروع کیا جو شیروں کے غار میں پھینک دیا گیا تھا۔ "گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور جتنے شیر غار کے اندر تھے۔ سب محو خواب تھے۔ مگر کبھی کبھی وہ انگڑائی لیتے تھے اور اس وقت یہ شخص ڈر جاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ موت کا وقت قریب آرہا ہے۔ یکایک اس کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہوگئی اور جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک فرشتہ نظر آیا۔ فرشتے نے اُس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور پہاڑوں میں غائب ہوگیا"۔

الزبتھ ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی تھی۔ اس نے حیرت سے کہا: "فرشتہ اس کے پر بھی تھے؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا: "یہ تو محض خیالی افسانہ ہے! حقیقت میں فرشتوں کا وجود ہی نہیں ہے"۔

الزبتھ نے کہا "شرم کرو۔ رائن ہارٹ!" اور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔ مگر جب رائن ہارٹ کے چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں ہو گئے تو الزبتھ نے مشکوک لہجہ میں کہا "لوگ تو کہا کرتے ہیں کہ فرشتوں کے وجود میں کچھ بھی شک نہیں ہے۔ اماں جان، خالہ جان اور پھر اسکول کے استادوں کا بھی یہی خیال ہے"۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ فرشتوں کے وجود پر انہیں کیوں یقین ہے؟

اچھا یہ تو بتاؤ کہ شیر بھی واقعی کوئی جانور ہے یا نہیں؟"

"ہندوستان میں یہ جانور کثرت سے ہوتا ہے۔ وہاں مندر کے پجاری شیر کو گاڑی میں جوتتے ہیں اور اس گاڑی پر سوار ہو کر جنگل کا سفر کرتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ جوان ہونے پر ہندوستان جاؤں۔ یہ ملک ہمارے وطن سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہاں جاڑا کبھی نہیں ہوتا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گی ——— چلو گی نا؟"

"ضرور چلونگی۔ مگر میری والدہ بھی ساتھ جائیں گی اور تمہاری والدہ کو بھی چلنا ہوگا"۔

رائن ہارٹ نے کہا "نہیں وہ تو اس وقت تک بہت ضعیف ہو جائیں گی۔ وہ نہیں جا سکیں گی"۔

"میں تنہا جانے کی ہمت نہیں کر سکتی"۔

"لیکن تمہیں ہمت کرنی چاہیئے۔ اُس وقت تک تم میری بیوی ہو جاؤ گی اور تم کو کوئی بھی کچھ کہہ نہ سکے گا"۔

"میری والدہ میری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی"۔

رائن ہارٹ نے غصہ میں آکر کہا "ہم پھر واپس آجائیں گے۔ صاف صاف کہہ دو کہ تم میرے ساتھ سفر کرنا چاہتی ہو یا نہیں؟ ورنہ میں تنہا چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہ آؤں گا"۔

الزبتھ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں اور اُس نے رقت آمیز لہجہ میں کہا "مجھ کو اس طرح گھور کر نہ دیکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہندوستان ضرور چلوں گی"۔

خوشی کے جوش میں رائن ہارٹ نے الزبتھ کا ہاتھ پکڑ لیا اور سبزہ زار کی طرف دوڑا اور ناچ ناچ کر گانے لگا:-

"جائیں گے ہم ہندوستان۔ ہندوستان جائیں گے ہم

ہندوستان آآں۔ آآآ آآں ہندوستان

ہم جاآآآآ ئینگے۔ ہم جائیں گے ہندوستان

ہم . . . .

گاتے گاتے وہ یکایک خاموش ہو گیا اور الزبتھ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر اس نے الزبتھ سے کہا "مگر کیا فائدہ؟ تم بہت پست ہمت ہو"۔
باغ کے پھاٹک سے کوئی پکار رہا تھا "الزبتھ! رائن ہارٹ!"

دونوں نے جواب دیا: "ابھی آئے۔ بس ہم آہی رہے ہیں"۔ اور ایک دوسرے کی گردن میں اپنے ہاتھ حمائل کئے، اچھلتے کودتے، مکان کے اندر داخل ہوگئے۔

اس طرح یہ دونوں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ کبھی الزبتھ بہت مغموم ہوجاتی اور رائن ہارٹ حد سے زیادہ خوش وخرم رہتا۔ مگر باوجود اس کے دونوں میں کبھی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ فرصت کے اوقات دونوں ساتھ ہی گزارتے تھے، موسم سرما میں مکان کے اندر ہی اور گرمی کے زمانے میں سبزہ زاروں اور میدانوں میں۔ ایک دفعہ جب رائن ہارٹ کی موجودگی میں اسکول کے استاد نے الزبتھ پر غصہ کا اظہار کیا تو رائن ہارٹ نے سلیٹ اٹھا کر میز پر دے ماری کہ شاید استاد اس کی اس حرکت سے خفا ہوکر اس کی طرف متوجہ ہوجائے اور الزبتھ کو استاد کے عتاب سے نجات ملے۔ لیکن استاد کی توجہ رائن ہارٹ کی طرف منعطف نہ ہوئی۔ گویا اس نے سلیٹ کے گرنے کی آواز سنی ہی نہیں۔ رائن ہارٹ کو اس دن جغرافیہ کے سبق میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ بلکہ اُس نے ایک طویل نظم لکھی جس میں اُس نے اپنے کو ایک عقاب کا بچہ تصور کیا تھا استاد کو سیاہ کوے سے تشبیہ دی تھی، اور الزبتھ کو قمری قرار دیا تھا۔ عقاب کے بچے نے قسم کھائی تھی کہ طاقت پرواز ہوجانے پر کوے سے خوفناک انتقام لے گا۔ نظم لکھنے کے بعد نوجوان شاعر کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے اور وہ بہادری اور جانبازی کے خواب دیکھنے لگا۔ گھر پہنچ کر اس نے بیاض میں اس نظم کو خوبصورت حرفوں میں لکھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ دوسرے اسکول میں چلا گیا۔ وہاں اس نے اپنے ہم سن لڑکوں سے دوستی پیدا کرلی۔ لیکن پھر بھی الزبتھ سے دوستانہ تعلقات حسب دستور قائم رہے۔

اب وہ ان قصوں کا ایک مجموعہ لکھنے لگا جنہیں وہ اکثر الزبتھ کو سنایا کرتا تھا۔ اُس کی خواہش ہوتی تھی کہ ان قصوں میں اپنے خیالات کا بھی اظہار کرے۔ مگر وہ ناکام رہتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خود نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے ان قصوں کو وہ بجنسہ لکھ ڈالتا تھا جیسا کہ اس نے خود دوسروں سے سنا تھا۔ اس مجموعہ کو اس نے الزبتھ کے حوالہ کردیا اور اس نے اس کو اپنے صندوق میں حفاظت سے بند کردیا۔ رائن ہارٹ یہ سن کر بیحد خوش ہوتا کہ کبھی کبھی الزبتھ اس مجموعہ کے بعض افسانے اپنی ماں کو سنایا کرتی ہے۔

سات سال گزر گئے۔ رائن ہارٹ اپنی تعلیم کے سلسلہ میں شہر سے باہر جانے والا تھا۔ الزبتھ اس خیال کو اپنے ذہن میں نہیں آنے دینا چاہتی تھی کہ رائن ہارٹ سے جدائی کا وقت عنقریب آنے والا ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی جب رائن ہارٹ نے اس سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے لئے اب بھی افسانے لکھتا رہوں گا۔ اور جب کبھی اپنی والدہ کو خط لکھوں گا تو کوئی نہ کوئی افسانہ تمہارے لئے ضرور بھیجوں گا۔ اس کے عوض تم خط کے جواب میں ان افسانوں پر تنقید کیا کرنا۔ رائن ہارٹ کی روانگی کا وقت قریب آنے لگا۔ مگر اس سے قبل ہی اس کی بیاض میں متعدد نظموں کا اضافہ ہوگیا۔ بیاض کے وجود کی الزبتھ کو خبر نہ تھی، اگرچہ خود اسی کی وجہ سے رائن ہارٹ نے نظم لکھنا شروع کیا تھا۔

جنگل میں منگل (۳)

جون کا مہینہ تھا۔ دوسرے دن رائن ہارٹ روانہ ہونے والا تھا۔ اس کے دوستوں نے خواہش ظاہر کی کہ اُس کے جانے سے قبل بزم عیش و طرف گرم ہو۔ تاکہ سب کو اس سے آخری بار ملنے کا موقع ملے۔ اس لئے یہ طے پایا کہ قریب کے جنگل میں جا کر جشن منایا جائے۔

گاڑیوں پر سوار ہو کر وہ جنگل کے کنارے پہنچے! وہ وہاں سے کھانے پینے کی چیزوں کو ٹوکریوں میں لے کر وہ پیدل چلنے لگے۔ ان کے سامنے تھوڑے فاصلہ پر درختوں کی گھنی قطاریں تھیں۔ ان سے گزرتے ہوئے اور آدھ گھنٹہ تک اِدھر اُدھر گشت لگانے کے بعد سب کے سب ایک سبزہ زار میں پہنچے۔ بہت ہی خوش نما منظر تھا کہیں کہیں آفتاب کی سنہری کرنیں درختوں کے جھنڈ کو چیرتی ہوئی سطح زمین سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ درختوں پر گلہریاں اِدھر سے اُدھر اچکتی پھرتی تھیں۔ ایک جگہ درختوں کی شاخوں نے مل کر محراب کی شکل اختیار کر لی تھی یہیں سب آ کر ٹھہر گئے۔ ایک بوڑھا آدمی اس "یوم تفریح" کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا: "نوجوانو! میری بات غور سے سنو۔ تم میں سے ہر شخص کو دو سوکھی روٹیاں کھانے کو ملیں گی۔ کیونکہ ہم مکھن لانا بھول گئے۔ ان سوکھی روٹیوں کے ساتھ کھانے کی کوئی چیز تمہیں خود مہیا کرنی ہوگی۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر سٹرابیری کے درخت ملیں گے' بشرطیکہ تم تمہیں ڈھونڈ نکالو جو کوئی ان درختوں کا پتہ نہ نکال سکے گا، اُسے سوکھی روٹی کھانی پڑے گی۔ دنیا کا یہی دستور ہے۔ تمہاری بدقسمتی ہوگی اگر تم ناکام واپس آئے۔ غالباً تم نے میرا مطلب سمجھ لیا ہوگا؟"

نوجوانوں نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں ہاں! بالکل درست ہے"

"ابھی تم سے کچھ اور کہنا ہے۔ ہم ضعیفوں نے اپنے شباب میں بہت زحمتیں اٹھائی ہیں۔ اس لئے ہم لوگ آج گھر ہی پر رہیں گے یعنی ان درختوں کے سایہ کے نیچے۔ جب تک تم واپس آؤ ہم لوگ آلو کی ترکاری بنائیں گے۔ دسترخوان بچھائیں گے اور بارہ بجے کے قریب انڈوں کو بھی ابال لیں گے۔ ان خدمتوں کے عوض تم سٹرابیری کا حصہ ہمیں دے دوگے۔ اب میں تمہیں کافی ہدایتیں دے چکا ہوں۔ بس روانہ ہو جاؤ۔ پورب پچھم' جدھر جی چاہے چلے جاؤ۔ اور اپنی پھرتی اور چالاکی کا ثبوت دو۔"

نوجوانوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

رائن ہارٹ نے کہا۔ "آؤ الزبتھ مجھے سٹرابیری کے درختوں کا پتہ معلوم ہے تمہیں سوکھی روٹی کھانی نہ پڑے گی۔"

الزبتھ نے اپنی ٹوپی کے سبز فیتوں کو گرہ دے کر اپنے بازو پر لٹکا لیا اور بولی "چلو رائن ہارٹ۔ دیکھو' ٹوکری تیار ہے۔"

وہ جنگل میں چلے گئے۔ گھنے اور تاریک جنگل میں جہاں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف اُوپر ہوا میں باز کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر اُن کا گذر جھاڑیوں سے ہوا جہاں رائن ہارٹ کو راستہ بنانے کے لئے جنگلی پودوں کی شاخوں کو توڑنا پڑتا تھا۔ تھوڑی

دیر کے بعد اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "رائن ہارٹ! رائن ہارٹ!" آواز الزبتھ کی تھی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا کہ الزبتھ پیچھے رہ گئی ہے اور کانٹوں اور جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ واپس گیا اور اسے جھاڑیوں سے نکال کر کھلی جگہ میں لے آیا۔ یہاں تیتریاں پرواز کر رہی تھیں۔ ایک پھول سے دوسرے پھول پر ——— آزاد و بے پروا! ..... رائن ہارٹ نے الزبتھ کے بالوں کو سلجھایا اور بڑے اصرار کے بعد اس کو ٹوپی پہنادی۔

الزبتھ نے پوچھا: "مگر سٹرابیری کہاں ہے؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا: "ملنے کی جگہ تو یہی تھی لیکن ہمارے آنے سے قبل شاید پریوں یا جانوروں نے پھلوں کو کھالیا ہے"

الزبتھ نے کہا: "ہاں درختوں میں سٹرابیری کا ایک دانہ بھی نظر نہیں آتا۔ مگر پریوں کا تذکرہ نہ کرو۔ چلو اور کہیں چل کر تلاش کریں۔ میں ابھی تکان نہیں محسوس کرتی"۔

سامنے چھوٹا سا چشمہ تھا۔ اس کے بعد پھر جنگل۔ رائن ہارٹ الزبتھ کو کندھے پر چڑھا کر اس پار لے گیا جنگل کا کچھ حصہ طے کرنے کے بعد وہ ایک وسیع سبزہ زار میں پہنچ گئے۔

الزبتھ نے کہا: "یہاں سٹرابیری تلاش کرو بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے"۔

انہوں نے بہت تلاش کی مگر ناکام رہے۔

رائن ہارٹ نے کہا: "یہ خوشبو کسی دوسری چیز کی ہے"

رابیری کے پودے کثرت سے ادھر ادھر نظر آتے تھے۔ درمیان سبزہ زار تھا اور اس کے بعد پھر پودوں کی قطاریں۔

الزبتھ نے کہا: "یہ بہت تنہا مقام ہے۔ باقی لوگ معلوم نہیں کدھر چلے گئے؟"

رائن ہارٹ نے واپس جانے کے راستہ پر غور نہیں کیا تھا

اس نے الزبتھ سے پوچھا: "ہوا کس سمت کو بہ رہی ہے اور ہاتھ کو سر کے اوپر ہلا کر ہوا کا رخ دریافت کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس وقت ہوا ساکن تھی۔

الزبتھ چیخ اٹھی: "سنو! میں نے کچھ آوازیں سنی ہیں۔ اس طرف ......"

رائن ہارٹ نے چیخ کر کہا: "یہاں آؤ"

جواب ملا: "یہاں آؤ"

الزبتھ نے خوش ہو کر کہا: "انہوں نے تمہاری آواز سن لی"

"نہیں، یہ تو میری ہی آواز کی بازگشت تھی"

الزبتھ نے رائن ہارٹ کے قریب آکر کہا۔ "مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

رائن ہارٹ نے کہا۔ "نہیں تمہیں ڈرنا نہ چاہیئے۔ کیسا پر فضا مقام ہے۔ آؤ درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر تھوڑی دیر آرام کریں۔ ہم لوگ راستہ نہیں بھول سکتے۔ تمہاری پریشانی فضول ہے۔"

الزبتھ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئی اور خاموشی سے ہر سمت سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگی۔ رائن ہارٹ درخت پر چڑھ کر ایک مضبوط شاخ پر بیٹھ گیا اور الزبتھ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔ نیلے اور سنہرے رنگ کی ننھی ننھی مکھیاں ہوا میں بھنبھناتی پھرتی تھیں۔ کبھی کبھی ہُد ہُد اور دوسری چڑیوں کی چیخ پکار ادھر ادھر سے سنائی دیتی تھی۔

الزبتھ نے کہا۔ "سنو گھنٹہ بج رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"ہمارے سامنے —— تم سن رہے ہو؟ —— بارہ بج چکے۔"

"جب تو شہر اُسی طرف ہے جہاں سے گھنٹے کی آواز آرہی ہے۔ اگر ہم اسی سمت کو چلیں تو دوستوں کے ساتھ مل جائیں گے۔"

دونوں شہر کی طرف واپس چلے۔ انہوں نے مایوس ہو کر سٹرابری کی تلاش چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ الزبتھ پریشان ہو گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ دوستوں کی محفل کے قریب پہنچ گئے۔ قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ زمین پر ایک سفید چادر بچھی ہے۔ یہی چادر کھانے کی میز تھی۔ چادر پر سٹرابری کافی مقدار میں تھی۔ بوڑھا صدر تقریر کر رہا تھا اور کباب کے ٹکڑے سیخ سے نکال کر کھاتا بھی جاتا تھا۔

الزبتھ اور رائن ہارٹ کو آتے دیکھ کر سب چیخ اٹھے: "قافلہ سے بھٹکے ہوئے مسافر آگئے!"

بوڑھے صدر نے کہا۔ "چلو اپنے رومال کھولو اور جو کچھ تم لائے ہو میز پر رکھ دو۔ کہو تم کیا لائے ہو؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا۔ "صرف بھوک اور پیاس ساتھ لائے ہیں۔"

صدر نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر تم بھوکے ہی رہو گے۔ یہاں ناکاروں کو غذا نہیں ملتی، تم تو شرائط سے اچھی طرح واقف ہو۔"

لیکن آخر اُسے رحم آیا اور الزبتھ اور رائن ہارٹ کو بھی کھانا ملا۔ سب خوش ہو کر کھانے لگے۔ ساتھ ساتھ گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہو جاتے تھے۔ جھاڑیوں میں سے خوش الحان پرندوں کے نغموں کی آواز آرہی تھی۔

دن اسی طرح گزرا۔ آج کی صحرا نوردی میں رائن ہارٹ کو بھی کچھ مل ہی گیا۔ اگرچہ سٹرابری نہیں ملی۔ مگر محبت نے بھی اسی جنگل میں نشو و نما پائی تھی۔ مکان واپس آکر اس نے اپنی بیاض میں لکھا۔

جنگل کی شہزادی

ہوا ساکت ہے۔ اس خاموش و پُرامن وادی میں درختوں کی شاخیں جھول رہی ہیں۔
ایک حسین دوشیزہ درختوں کے نیچے بیٹھی ہے
وہ خوشنما جھاڑیوں سے گھری ہوئی ہے
فضا میں جنگلی پھولوں اور پھلوں کی خوشبو پھیل رہی ہے
حسین سنہری مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔
چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے
اُس کے بالوں کو سورج کی سنہری کرنیں چوم رہی ہیں۔
دُور سے کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے

اور اس سہانے منظر میں
یہ حسین دوشیزہ "جنگل کی شہزادی" معلوم ہوتی ہے"

آج اس کی زندگی میں انقلاب عظیم کا دن تھا۔ ایسا انقلاب' جسے وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر کوئی اس کی حالت پوچھتا تو وہ بیان نہ کر سکتا اور زبانِ حال سے صرف اتنا کہہ دیتا کہ :۔

"میرے جذبات کی دنیا زمانے سے نرالی ہے"

(۴)
کرسمس

کرسمس کا دن آگیا۔ سہ پہر کے وقت رائن ہارٹ اور چند دوسرے طلبہ ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ کیونکہ کمرہ ذرا تاریک تھا لیکن بہت کم لوگ آئے تھے۔ ہوٹل کے ملازم دیوار سے ٹیک لگا کر خاموش کھڑے تھے۔ ایک گوشہ میں ایک گویا بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی' جسے بیلہ بجانے میں کمال تھا۔ وہ صورت تصویر خاموش بیٹھی تھی۔
طلبہ کی میز پر شراب کی بوتل کھلی . . . ایک خوشرو نوجوان نے اُس لڑکی کی طرف شراب کا پیالہ بڑھا کر کہا: "تمہارے صدقے! آج ایک جام تم بھی پی لو۔"
اُس نے خاموشی اور متانت سے جواب دیا۔ "میں نہیں پی سکتی"۔
نوجوان نے کہا۔ "نہیں پی سکتیں تو گانا گاؤ" اور لڑکی کی گود میں ایک روپیہ پھینک دیا۔ لڑکی اپنے گیسو سنوارنے لگی اور مغنی

نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ مگر اس نے سر ہلا کر جواب دیا: "میں اس شخص کی فرمائش پر نہیں گاؤں گی"۔

رائن ہارٹ اپنا گلاس ہاتھ میں لئے ہوئے لڑکی کے پاس پہنچا۔

لڑکی نے ترشرو ہو کر پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

رائن ہارٹ نے کہا: "تمہاری آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"میری آنکھوں سے تمہیں کیا تعلق؟"

رائن ہارٹ نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا: "میں جانتا ہوں کہ تمہاری آنکھیں جھوٹی ہیں۔ قاتل ہیں، خونخوار ہیں"

لڑکی محو حیرت ہو کر رائن ہارٹ کو دیکھنے لگی۔

رائن ہارٹ نے شراب کے پیالے کو اپنے منہ سے لگا کر کہا: "تمہاری خوبصورت اور موذی آنکھوں کا جام صحت"۔ اور شراب پینے لگا۔

لڑکی نے ہنس کر کہا: "جام مجھے دے دو" اور اپنی سیاہ آنکھوں کو رائن ہارٹ کی آنکھوں کے مقابل کر کے گلاس میں جتنی شراب بچ گئی تھی، پی گئی۔ اس کے بعد اس نے گہری اور دردناک آواز میں گانا شروع کیا:۔

"میری چشم خون فشاں ہے دردِ دل کی رازداں،
خونِ دل آنسو بن کر حالِ دل کرتا ہے بیاں

جانتی ہوں کہ یہ کل تک نہیں رہنے والا — حسن پر اپنے نہیں ناز کبھی کرتی ہوں
مجھ کو معلوم ہے تم بھول مجھے جاؤ گے — پھر بھی میں صبح و مسا یاد تمہیں کرتی ہوں

غم کی ماری میں دکھیاری کوئی نہ میرا ہوئے
میری چشم خوں فشاں ہے دردِ دل کی رازداں
میری چشم . . . . "

لڑکی گا رہی تھی اور مغنی بید بجا رہا تھا۔ مجمع پر خاموشی چھائی تھی۔ رائن ہارٹ پر عجیب قسم کا کیف طاری تھا۔ اتنے میں ایک شخص ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔

اس نے کہا: "رائن ہارٹ! میں تمہارے ساتھ یہاں آنا چاہتا تھا مگر تم تو پہلے ہی سے آ چکے ہو۔ ہاں! تمہارے مکان پر کرسمس کی تیاری ہو رہی ہے"۔

رائن ہارٹ نے متعجب ہو کر کہا: "کرسمس؟ اب میں کرسمس کی خوشیاں منانے کے لائق نہیں رہا"۔

"مجھو تمہارے کمرے سے تو "کرسمس کیک" کی خوشبو آرہی تھی"۔

رائن ہارٹ نے گلاس کو میز پر رکھ دیا اور اپنی ٹوپی اٹھائی۔ لڑکی نے دریافت کیا "تم کہاں چلے؟"

"ابھی واپس آتا ہوں"۔

لڑکی کی پیشانی پر بل پڑ گیا۔ اُس نے خاص انداز سے میٹھے اور سریلے لہجہ میں کہا "ٹھہر جاؤ"۔

رائن ہارٹ نے پس و پیش کے بعد کہا "میں نہیں ٹھہر سکتا"۔

لڑکی نے قہقہہ لگایا اور رائن ہارٹ کو دھکا دے کر دروازے کی طرف بڑھا دیا اور کہا "جاؤ تم ناکارہ ہو۔ تم میں کوئی بھی کسی قابل نہیں"۔

لڑکی علیحدہ جا کر بیٹھ گئی اور رائن ہارٹ آہستہ آہستہ ہال کے باہر نکلنے لگا۔

باہر نکل کر وہ بہت مسرور ہوا۔ ابھی شفق کی روشنی باقی تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے۔ مکانوں کی کھڑکیاں روشنی سے جگمگا رہی تھیں کہیں سے سیٹی اور ٹین کا ڈھول بجنے کی آوازیں آرہی تھیں کہیں سے بچوں کے کھیلنے کا شور و غوغا سنائی دیتا تھا۔ سڑک پر ننھے ننھے غریب بچوں کی کثرت تھی۔ جو در بدر مارے مارے پھرتے تھے۔ اکثر یہ کسی مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اندرونی ساز و سامان کی جھلک سے ہی اپنی طبیعت خوش کر لیتے۔ کیونکہ وہ مکان کے اندر جا کر کرسمس کی چہل پہل میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔ کبھی کوئی دروازہ کھلتا اور دربان کی کرخت آواز ان ننھے مہمانوں کو سڑک پر بھگا دیتی۔ ایک جگہ سے گانے کی آواز بھی آرہی تھی۔ مگر رائن ہارٹ کی توجہ کسی چیز کی طرف منعطف نہ ہوئی۔ وہ تیزی سے اپنے مکان کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اپنے مکان پر پہنچا، بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ سیڑھیوں کو ٹٹولتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور بھینی بھینی خوشبو محسوس کرنے لگا۔

اسے اپنا گھر یاد آگیا۔ کرسمس کے دن اس کی ماں کے کمرے میں ایسی ہی خوشبو ہوتی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے لیمپ روشن کیا۔ میز پر ایک پارسل رکھا ہوا تھا۔ اس نے پارسل کو کھولا۔ وہی "کرسمس کیک" جو اُسے بہت مرغوب تھے اور جنہیں وہ کبھی نہ بھول سکتا تھا، پارسل میں موجود تھے۔ ان میں سے اکثر پر اس کا نام لکھا تھا۔ روشنائی سے نہیں بلکہ چینی کے شیرے سے حروف کیک پر جما دیئے گئے تھے۔ پارسل کے اندر چند رومال، دستانے اور دو خطوط بھی ملے۔ ایک خط اس کی ماں نے لکھا تھا اور دوسرا الزبتھ نے۔ رائن ہارٹ نے الزبتھ کا خط پہلے کھولا اور پڑھنے لگا۔ الزبتھ نے لکھا تھا۔

"کیک پر جو خوبصورت حروف لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے تم کو بتا دیا ہوگا کہ کیک کس نے تیار کیا۔ اُسی نے ان رومالوں کو بھی بنایا۔ اس دفعہ کرسمس کا دن یہاں خاموشی سے گزرے گا۔ والدہ ہمیشہ ساڑھے نو بجے شب تک چرخہ کاتنے سے فارغ ہو جاتی ہیں۔ میں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ تمہاری غیر موجودگی شاق گزرتی ہے۔ تم نے جو "بلبل" مجھے دیا تھا وہ پچھلے اتوار کو مر گیا۔ میں دیر تک روتی رہی کیونکہ مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ہر روز سہ پہر کے وقت گایا کرتا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ والدہ اکثر اس کے پنجرے پر کپڑا ڈال دیتی تھیں تاکہ وہ خاموش رہے۔ اب تو وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ اس کے کمرے میں اور بھی سناٹا چھایا رہتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی تمہارا

دوست ایک ہم لوگوں سے ملنے آیا کرتا ہے تم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ اپنے بھورے رنگ کے اوور کوٹ سے مشابہ ہے جب کبھی گرمیوں میں ڈنر پر آتا ہے اس کے دیکھتے ہی مجھے یہ تشبیہ بے ساختہ یاد آجاتی ہے۔ واللہ! کیسی مضحکہ خیز تشبیہ ہے۔ مگر کبھی والدہ صاحبہ سے نہ کہہ دینا۔ ممکن ہے کہ ان کو برا معلوم ہو۔ اچھا ذرا سوچو تو سہی کہ میں تمہاری والدہ کو کرسمس میں کیا تحفہ دوں گی! انہیں سوچ سکتے؟ ان کا تحفہ میں خود ہی ہوں ایک میری تصویر سیاہ کھلی سے تیار کر رہا ہے۔ اس تصویر کے لئے میں تین دفعہ بیٹھ چکی ہوں۔ ہر بار کم سے کم ایک گھنٹہ تک بیٹھنا پڑا تھا۔ مجھے یہ تجویز پسند نہ تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اجنبی میرا چہرہ اس قدر گھور کر دیکھے کہ میرے خد و خال کا نقشہ اس کے ذہن میں اتر جائے لیکن میری والدہ نے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا کہ تصویر دیکھ کر مسز ورنر بہت خوش ہوں گی۔

لیکن، رائن ہارٹ، تم اپنا وعدہ نہیں وفا کر رہے ہو۔ اب تک تم نے کوئی افسانہ نہیں بھیجا۔ میں نے اکثر تمہاری والدہ سے شکایت بھی کی۔ انہوں نے کہا کہ تم کسی زیادہ اہم کام میں مشغول ہوگے۔ مگر میں نہیں یقین کر سکتی۔ تمہاری خاموشی کی وجہ کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے؟"

اس کے بعد رائن ہارٹ نے اپنی ماں کا خط پڑھا۔ اور پھر ان خطوط کو حفاظت سے رکھ دیا۔ وہ یکایک گھر جانے کی زبردست خواہش محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ کمرے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ٹہلتا رہا۔ پھر دھیمی آواز میں بے اختیار گانے لگا:۔

وہ میرا آشیاں، وہ خندۂ گل اور وہ آزادی! قفس میں یاد آتا ہے مجھے رہنا گلستاں کا

بہار آئی ہے میں شغل جنوں کرتا ہوں، کرنے دو نہیں معلوم پھر کیا رنگ ہو یارو گلستاں کا

وہ میرا آشیاں وہ . . . .

گاتے گاتے وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ میز کی دراز میں سے کچھ روپیہ نکالا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر کر پھر سڑک پر پہنچ گیا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لڑکوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ بوڑھے اور جوان سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسمس کی شام اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

ہوٹل کے قریب پہنچ کر رائن ہارٹ نے بیلا بجانے والی لڑکی کی آواز سنی۔ وہ گا رہی تھی۔ ہوٹل کا دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر کے بعد کوئی شخص باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ رائن ہارٹ مکان کے سایہ میں چھپ گیا اور اس شخص کے چلے جانے کے بعد آگے بڑھا۔ ایک جوہری کی دکان سے سنگ سرخ کی ایک صلیب خرید کر وہ اسی راستہ سے واپس گیا جس سے وہ آیا تھا۔

اپنے مکان کے قریب اس نے ایک کم سن لڑکی کو دیکھا جو پھٹے کپڑے پہنے تھی اور ایک مکان کے دروازہ پر دستک دے رہی تھی۔ رائن ہارٹ نے پوچھا "میں دروازہ کھولنے میں تمہاری مدد کروں؟" لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ رائن ہارٹ نے دروازہ کھول دیا اور لڑکی سے کہا "لیکن تم کو میں اندر نہ جانے دوں گا۔ ممکن ہے کہ لوگ وہاں سے تمہیں نکال دیں۔ آؤ، میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں ایک اوورکوٹ کی

کھلاؤں گا"۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولی اور اس کے مکان تک گئی۔

کمرہ روشن تھا۔ جاتے وقت اس نے روشنی گل نہیں کی تھی۔ کیک اور مٹھائیوں کا آدھے سے زیادہ حصہ اس نے لڑکی کو دے دیا، مگر اپنے نام والا کیک نہیں۔ پھر اس نے لڑکی سے کہا "اب دوڑ کر گھر چلی جاؤ اور اپنی ماں کو بھی تھوڑی سی مٹھائی دو"۔ لڑکی نے استعجاب سے رائن ہارٹ کی طرف دیکھا۔ غریب لڑکی کے ساتھ کوئی کبھی ایسی مہربانی سے پیش نہ آیا تھا۔ وہ اپنے معصومانہ جذبات کا اظہار نہ کر سکی۔ رائن ہارٹ نے لیمپ لے کر دروازہ تک لڑکی کو پہنچا دیا۔ وہ بہت خوش و خرم، اچھلتی کودتی ہوئی چلی گئی۔

رائن ہارٹ نے آتشدان میں آگ سلگا دی اور اپنا بوسیدہ رومال نکال کر میز پر رکھا۔ اپنی والدہ اور الزبتھ کو طویل خطوط لکھنے میں اُس نے رات گزار دی۔ وہ ابھی خط لکھ ہی رہا تھا کہ آفتاب طلوع ہو گیا اور اس کی شعاعیں کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر باہر برف جم گئی تھی۔ اس لئے یہ شیشے آئینہ کا کام دے رہے تھے۔ رائن ہارٹ نے جب کھڑکیوں کی طرف دیکھا تو ایک زرد غمگین چہرہ اُسے گھورتا ہوا نظر آیا۔

(۵)

وطن!

"ایسٹر" کی تعطیل میں رائن ہارٹ اپنے گھر گیا۔ جب وہ دوسرے دن الزبتھ سے ملنے گیا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔ شرمائی ہوئی تھی۔

رائن ہارٹ نے الزبتھ سے کہا "تمہارا قدِ رعنا تو صنوبر کو بھی شرما رہا ہے"۔ وہ خاموش رہی۔ رائن ہارٹ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور الزبتھ کے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھ میں دبائے رہا۔ الزبتھ نے کوشش کی کہ آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ کو چھڑا لے۔ رائن ہارٹ کو حیرت ہوئی کیونکہ الزبتھ نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی تھی۔ وہ روزانہ الزبتھ سے ملا کرتا تھا۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اگلی سی بات باقی نہ تھی۔ جب کبھی دونوں ساتھ بیٹھتے تو گھنٹوں تک خاموشی طاری رہتی۔ رائن ہارٹ سخت پریشان تھا کہ اس کشیدگی کا باعث کیا ہے۔ چھٹیوں کو آسانی سے گزار دینے کے لئے وہ الزبتھ کو علم نباتات پڑھانے لگا۔ اس علم کو اس نے یونیورسٹی میں بڑی دلچسپی سے حاصل کیا تھا۔ الزبتھ نے خوش ہو کر پڑھنا شروع کیا اور بہت جلد ترقی کرنے لگی۔ ہفتہ میں دو یا تین بار وہ سبزہ زاروں اور میدانوں میں چلے جاتے تھے اور پودوں اور پتیوں کا ایک ذخیرہ لے آتے تھے۔ پھر خود ان کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس غرض سے رائن ہارٹ دوپہر کے وقت الزبتھ کے پاس جایا کرتا تھا۔

ایک روز الزبتھ کے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے دیکھا کہ ایک سنہرا پنجرا لٹکا ہوا ہے۔ یہ پنجرا اس سے قبل وہاں نہ تھا۔ اس کے اندر گھاس* رکھی ہوئی تھی۔ پنجرے میں ایک کینری تھی جو اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہی تھی اور چیخ چیخ کر الزبتھ کی انگلیوں پر چونچ

---

* یہاں گھاس سے مراد ایک خاص قسم کی گھاس ہے (chickweed) جسے چڑیاں شوق سے کھاتی ہیں۔

ماریہی تھی۔ رائن ہارٹ کا لنسٹ "بھی اسی جگہ رہا کرتا تھا۔

اس نے مسکرا کر الزبتھ سے پوچھا "میرا غریب لنسٹ مرنے کے بعد گولڈ فنش سے مبدّل ہو گیا؟"

الزبتھ کی ماں نے کہا "لنسٹ مرکر دوسری شکل نہیں اختیار کر لیتا۔ تمہارے دوست ایرک نے آج دوپہر کے وقت یہ چڑیا الزبتھ کو اپنے فارم سے تحفتہً بھیج دی ہے"۔ الزبتھ کی ماں اس وقت کرسی پر بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔

رائن ہارٹ نے پوچھا "کون سا فارم؟"

"تم نہیں جانتے؟"

"کیا؟"

"کہ ایرک نے اپنے باپ والا فارم جو ایمیزی میں ہے لے لیا ہے اور ایک مہینے سے وہیں رہتا ہے؟"

"مگر آپ نے مجھ سے اس کے متعلق کبھی تذکرہ نہیں کیا"۔

"اور تم نے بھی تو کبھی اپنے دوست کے متعلق مجھ سے کچھ دریافت نہیں کیا۔ وہ ایک ہوشیار، سنجیدہ اور ذی شعور لڑکا ہے"۔ یہ کہہ کر الزبتھ کی ماں قہوہ تیار کرنے چلی گئی۔

الزبتھ ابھی تک پنجرے کو درست کرنے میں مصروف تھی۔

اس نے رائن ہارٹ سے کہا "ذرا ٹھہر جاؤ، میں ابھی فارغ ہو جاؤں گی"۔

مگر رائن ہارٹ نے خلافِ معمول کوئی جواب نہ دیا۔ الزبتھ دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ رائن ہارٹ کے چہرہ پر پریشانی کے ایسے آثار نمایاں تھے جس کا تجربہ کبھی الزبتھ کو نہ ہوا تھا۔

الزبتھ نے پوچھا "رائن ہارٹ! تمہیں کیا تکلیف ہے، تم بیمار ہو؟"

"میں بیمار ہوں؟"

"تم اس قدر غمگین کیوں معلوم ہوتے ہو؟"

اس نے کہا "الزبتھ! میں اس زرد چڑیا کو دیکھنے کا روادار نہیں"۔

وہ محو حیرت ہو کر رائن ہارٹ کو دیکھنے لگی۔ اس نے کچھ سمجھا نہیں بولی "تم عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہو!"

رائن ہارٹ نے کوئی جواب نہ دیا صرف الزبتھ کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اتنے میں الزبتھ کی ماں قہوہ لے کر آ گئی۔ قہوہ پی کر وہ چرخہ کاتنے لگی۔ الزبتھ اور رائن ہارٹ دوسرے کمرے میں چلے گئے یہاں وہ پتیوں اور پھولوں کو شناخت کر کے علٰحدہ کرنے لگے جب بھی الزبتھ کسی پودے کے لاطینی نام کا صحیح تلفظ نہ ادا کر سکتی تھی تو رائن ہارٹ اسے بتا دیتا تھا۔

جب الزبتھ پھولوں اور پودوں کی شناخت ختم کر چکی تو اس نے رائن ہارٹ سے کہا: "مجھے لالہ کے ایک پھول کی بھی ضرورت ہے؟" رائن ہارٹ نے ایک سفید کاپی جیب سے نکالی اور اس کے اوراق کے درمیان سے چند سوکھی ہوئی پتیاں نکال کر الزبتھ کو دیں۔

اس کاپی میں کچھ لکھا ہوا دیکھ کر الزبتھ نے پوچھا: "تم نے پھر کچھ افسانے لکھے ہیں؟"

رائن ہارٹ نے کہا: "یہ افسانے نہیں ہیں" اور کاپی الزبتھ کو دے دی۔

اس کاپی میں رائن ہارٹ کی چند نظمیں لکھی ہوئی تھیں۔ الزبتھ نے نظموں کی سرخیوں کو پڑھنا شروع کیا: "جب استاد اس پر خفا ہوا تھا" — "جب وہ جنگل میں راستہ بھول گئے تھے" . . . . . . "اس کا پہلا خط" . . . .

رائن ہارٹ الزبتھ کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ خاموش، سر جھکائے کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھی۔ کبھی کبھی اس کے چہرہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ مطالعہ ختم کرنے کے بعد اس نے خاموشی سے کتاب کو رائن ہارٹ کے سامنے رکھ دیا۔

تعطیل کے دن اسی طرح گزرے۔ آخر رائن ہارٹ کی واپسی کا دن آ پہنچا۔ الزبتھ نے اپنی ماں سے اجازت حاصل کر لی کہ وہ اپنے دوست کو اسٹیشن تک پہنچا آئے۔ دروازے سے باہر نکل کر رائن ہارٹ نے الزبتھ کے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا اور اس طرح یہ دونوں اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر رائن ہارٹ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ الزبتھ سے جدا ہونے سے پہلے کچھ گفتگو کر لینی چاہئے۔ اس کی زندگی اور آئندہ خوشی کا دار و مدار اسی گفتگو پر تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر الفاظ یارا نہ دیتے تھے۔ وہ پریشان تھا کہ یہ طلسم خاموشی کس طرح ٹوٹے۔ اسی فکر میں اس کی رفتار سست ہو گئی۔ اب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔

الزبتھ نے اس کو مخاطب کر کے کہا: "سینٹ میری کے گرجا میں دس بج چکے ہیں کہیں تمہارے پہنچنے سے قبل گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"

مگر پھر بھی رائن ہارٹ نے اپنی رفتار کو تیز نہ کیا۔ آخر اس نے رقّت آمیز لہجہ میں کہا: "الزبتھ! دو برس تک اب تم مجھے نہ دیکھ سکو گی۔ نہیں معلوم جب میں دوبارہ یہاں واپس آؤں گا تو تم مجھ سے اسی طرح محبت کرو گی جیسا اب کرتی ہو یا نہیں!"

الزبتھ نے کہا: "میں تمہیں بھول کیوں جانے لگی؟ میں نے کل ہی تمہارے لئے جنگ کی ہے۔"

"تم نے میرے لئے جنگ کی؟ بھلا یہ تو بتاؤ کہ کس سے جنگ کی اور کیوں جنگ کی؟"

"کل رات کے وقت مجھ سے اور والدہ صاحبہ سے تمہارے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ رائن ہارٹ میں اب وہ اگلی سی بات باقی نہیں رہی۔"

تھوڑی دیر تک رائن ہارٹ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا: "میں اب بھی وہی ہوں جو پہلے تھا۔ الزبتھ! تمہارا خیال میرے متعلق کیا ہے؟"

"میں تم کو اب بھی ویسا ہی باقی ہوں جیسے تم پہلے تھے"۔

اب رائن ہارٹ تیزی سے چلنے لگا۔ اس کے چہرے سے انبساط و سرور کے آثار نمایاں تھے۔ الزبتھ نے اس سے پوچھا: "تم اس قدر مسرور کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"ایک راز ہے۔ ایک لطیف راز۔ جو میں تم کو ابھی نہ بتاؤں گا۔ دو سال کے بعد جب میں واپس آؤں گا تو اس راز کا انکشاف کرونگا"

اسٹیشن پہنچ کر الزبتھ رائن ہارٹ سے رخصت ہو گئی اور مکان واپس گئی۔

(۶)

ایک خط

دو سال کے بعد ایک دن رائن ہارٹ مطالعہ میں مشغول تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ رائن ہارٹ نے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکیہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "مسٹر ورنر[1]! آپ کے نام کا ایک خط ہے"۔

وطن سے واپس آنے کے بعد رائن ہارٹ نے الزبتھ کو کوئی خط نہ لکھا تھا۔ نہ الزبتھ نے رائن ہارٹ کو خط سے یاد کیا تھا۔ یہ خط رائن ہارٹ کی والدہ نے بھیجا تھا۔ رائن ہارٹ نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

"میرے بچے! تم ابھی جوان ہو۔ اور جوانی ہی انسان کی زندگی میں تغیر و تبدل کا وقت ہوتا ہے۔ یہاں بھی بہت سے تغیرات رونما ہوئے ہیں جن سے غالباً تم کو صدمہ ہوگا۔ کل الزبتھ نے ایرک سے شادی کرنا منظور کر لیا۔ پچھلے دو مہینوں میں وہ برابر انکار کرتی رہی تھی۔ لیکن آخر کار وہ کسی طرح راضی ہو گئی۔ شادی بہت جلد ہو جائے گی اور اس کی ماں بھی اس کے ساتھ چلی جائے گی"۔

(۷)

ایمینزی

چند سال اور گزر گئے۔ بہار کا موسم اور سہ پہر کا وقت تھا۔ سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے درخت تھے۔ ایک نوجوان اس سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں کسی راہ چلنے والے کو تلاش کر رہی تھیں لیکن کوئی نظر نہ آتا تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کسان "بیل گاڑی" پر سوار نظر آیا۔ نوجوان مسافر نے اس سے پوچھا:-

"میرے دوست۔ ایمینزی کو یہی راستہ گیا ہے؟"

"سیدھے چلے جائیے۔ آپ بہت جلد ایمینزی پہنچ جائیں گے۔ اب قریب ہی ہے"۔

مسافر نے رفتار تیز کر دی۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں سڑک پہاڑی کے اوپر چلی گئی تھی۔ پہاڑی پر پہنچ کر اسے نہایت خوش نما منظر نظر آیا۔ دوسری طرف پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع جھیل تھی جو سرسبز و شاداب پودوں سے بھری تھی جھیل کے

---

[1] رائن ہارٹ کا پورا نام رائن ہارٹ ورنر تھا (مترجم)

دوسرے کنارے پر بھی نیلگوں پہاڑیاں تھیں۔ سامنے جنگل میں درخت پھلوں سے لدے تھے اور درختوں کے پیچھے کسی مکان کی سرخ دیواریں نظر آرہی تھیں۔ ایک بگلا مکان کی چھت پر سے اڑ کر جھیل کے اوپر چکر لگانے لگا۔ مسافر کے منہ سے بے ساختہ نکلا "امینیزی!"

تھوڑی دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا اور جھیل کے دوسرے کنارے پانی میں جو مکان کا عکس تھا، اس کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منزل مقصود کی طرف قدم اٹھایا۔

اب سڑک بالکل ڈھلوان ہو گئی تھی۔ جھیل نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی مگر درختوں کے درمیان سے کبھی کبھی جھیل کی جھلک نظر آتی تھی۔ اب سڑک پھر اوپر کی جانب چڑھنے لگی۔ یہاں جنگل کے بجائے سڑک کے کنارے انگور کی لتیاں نظر آتی تھیں۔ انواع و اقسام کے پھل کے درخت بھی تھے۔ شہد کی مکھیاں فضا میں بھنبھنا رہی تھیں۔ اتنے میں ایک شخص بھورے رنگ کا اوورکوٹ پہنے مسافر کی طرف آیا۔ جب وہ مسافر کے قریب پہنچا تو فرط مسرت سے چیخ اٹھا:

"خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ رائن ہارٹ! خوش آمدید!"

"ایرک! خدا تم کو خوش رکھے۔ میں کس زبان سے تمہارے اخلاق کا شکریہ ادا کروں؟"

اس کے بعد ان دونوں نے ہاتھ ملایا اور معانقہ کیا۔

ایرک نے اپنے دوست کے سنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا "کیا یہ واقعی تم ہو؟"

"ہاں ایرک میں ہی ہوں یعنی رائن ہارٹ۔" "تم تو بالکل ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔ صرف کسی قدر زیادہ خوش معلوم ہوتے ہو۔"

ایرک نے مسکرا کر کہا: "رائن ہارٹ! میری خوشی کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ میں نے بہت بڑی بازی جیتی ہے۔ وہ تم کو دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ تمہارے آنے کی اس کو مطلقاً خبر نہیں ہے۔"

"کس کو خبر نہیں ہے؟"

"الزبتھ کو"

"تم نے الزبتھ کو میرے آنے کی خبر نہ دی تھی؟"

"میں نے تم کو خط لکھ دیا تھا، مگر الزبتھ یا اس کی والدہ کو اس کے متعلق کچھ نہ کہا تھا۔ الزبتھ تم کو یکایک دیکھے گی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔"

رائن ہارٹ متفکر ہو گیا۔ جیسے جیسے وہ فارم کے قریب ہوتا گیا۔ اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ اب سڑک کے کنارے انگور کی لتیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ان کی جگہ ایک وسیع باغ نظر آیا۔ ایک بگلا پودوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ ایرک نے تالی بجا کر اس کو اڑا دیا۔ بگلا ایک نئے مکان کی چھت پر جا کر بیٹھ گیا جس کے چاروں طرف شفتالو اور خوبانی کے درخت تھے۔

ایرک نے کہا: "یہ بھٹی ہے، جس کو میں نے دو سال قبل بنوایا تھا"۔

"مکانات جو نظر آرہے ہیں، ان میں سے ایک میرے جدِّ امجد اور ایک والد صاحب نے بنوایا تھا۔ غرض ہم لوگ ہمیشہ ترقی کرتے چلے جارہے ہیں"۔

اس طرح گفتگو کرتے ہوئے وہ مکان کے صحن میں پہنچ گئے۔ خوشنما پھولوں اور پودوں سے صحن آراستہ تھا۔ کچھ لوگ ادھرسے ادھر جارہے تھے۔ انہوں نے جھک کر ایرک اور اس کے دوست کو سلام کیا۔ اب وہ مکان کے بڑے کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ ایرک نے ایک دروازہ کھولا جس سے وہ ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے سے باغ کا نہایت ہی دلفریب منظر نظر آتا تھا جھیل اور پہاڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

باغ میں ایک چبوترے پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اٹھ کر ایرک کی طرف بڑھی، مگر اجنبی پر نظر پڑتے ہی محوِ حیرت ہوکر کھڑی ہوگئی۔ رائن ہارٹ نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھی:۔

"رائن ہارٹ! تم یہاں آگئے؟ تم سے ملے ہوئے مدتِ دراز گزر گئی تھی"۔

"کچھ ایسی طویل مدت تو نہیں گزری . . . . "۔ رائن ہارٹ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ الزبتھ کی آواز سن کر اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ اس کو وہ گھڑی یاد آگئی جب اس نے چند سال قبل اپنے شہر میں الزبتھ کو الوداع کہی تھی۔

ایرک خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے کہا: "الزبتھ! تم کو رائن ہارٹ کے آنے کی ہرگز توقع نہ رہی ہوگی"۔

"ایرک! تمہاری مہربانیوں کا شکریہ میں کس طرح ادا کروں!"

ایرک نے الزبتھ کے ننھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا: "اب ہم رائن ہارٹ کو یہاں سے جلد بھاگ نہ جانے دیں گے۔ ہم اس کو اس طرح یہاں رکھیں گے کہ وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر تصور کرے۔ دیکھو! رائن ہارٹ کیسا دجیہہ اور سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے عرصے سے اُسے نہ دیکھا تھا"۔

الزبتھ نے شرمیلی نگاہوں سے رائن ہارٹ کی طرف دیکھا۔ رائن ہارٹ نے مسکرا کر کہا:

"چونکہ میں عرصۂ دراز تک تم سے جدا رہا، اس لئے میری شکل و شباہت میں تم کو فرق معلوم ہوتا ہے"۔

اتنے میں الزبتھ کی ماں پہنچ گئی۔ اس نے رائن ہارٹ کو دیکھتے ہی کہا: "مسٹر ورنر! خوش آمدید!" اب سوال و جواب کا سلسلہ چھڑ گیا۔ عورتیں اپنے کاموں میں مشغول ہوگئیں۔ رائن ہارٹ نے ناشتہ کھایا۔ ایرک سگار پینے لگا اور روزمرہ کی گفتگو ہونے لگی۔

دوسرے دن رائن ہارٹ، ایرک کے ساتھ باغ اور بھٹی وغیرہ دیکھنے گیا۔ انتظام بہت اچھا تھا۔ مزدور سب تندرست اور خوش و خرم

معلوم ہوتے تھے۔ دوپہر کے وقت دونوں واپس آئے۔

رائن ہارٹ کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ مقامی محاورے اور گیت جمع کرتا تھا۔ اس کا ارادہ اس مجموعہ کو شائع کرانے کا تھا۔ الزبتھ اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتی تھی۔ رائن ہارٹ روز شام کو جھیل کے کنارے ٹہلنے جاتا تھا جھیل کا راستہ باغ کے کنارے کنارے تھا آخیر میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس کے تین طرف خوش نما درخت تھے اس جگہ کا نام الزبتھ کی ماں نے "شام کی نشست گاہ" رکھا تھا۔ کیونکہ یہاں سے غروب آفتاب کا منظر نہایت پرلطف ہوتا تھا۔ رائن ہارٹ ایک دن اسی راستہ سے ٹہل کر واپس آرہا تھا کہ پانی برسنے لگا۔ وہ ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہوا مگر یہاں بھی وہ پانی کے تڑیڑوں سے بچ نہ سکا۔ جب وہ "شام کی نشستگاہ" کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کوئی عورت وہاں اس طرح بیٹھی ہے گویا کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ رائن ہارٹ سمجھا شاید الزبتھ ہو اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ مگر وہ یکایک اٹھی اور درختوں کی آڑ میں خدا جانے کدھر چلی گئی۔ رائن ہارٹ اس کی وجہ سمجھ سکا تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ الزبتھ ہی تھی وہ اس سے پوچھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ مکان میں داخل ہوتے وقت اس نے باغ کے پھاٹک کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس خوف سے کہ کہیں الزبتھ پر نظر نہ پڑ جائے۔

(۸)

یہ میری ماں کا قصور تھا

ایک دن شام کے وقت گھر کے لوگ باغ والی کوٹھڑی میں بیٹھے ہوئے تھے آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ رائن ہارٹ سے لوگوں نے فرمائش کی کہ وہ اپنے مجموعہ میں سے بعض گیت پسند کر کے سنائے۔ رائن ہارٹ اپنے کمرے میں گیا اور کاغذ کا ایک گٹھا لے کر واپس آیا۔ الزبتھ، رائن ہارٹ کے قریب آکر بیٹھ گئی اور دونوں نے مل کر ان کاغذات کا مطالعہ شروع کیا۔

رائن ہارٹ نے کہا "یہ کاغذات میرے ایک دوست نے بھیجے ہیں"۔

"ابھی میں نے خود نہیں دیکھا کہ ان میں کیا لکھا ہے"۔

الزبتھ نے ایک گیت پسند کر کے رائن ہارٹ سے گانے کی فرمائش کی۔

رائن ہارٹ نے گانا شروع کیا۔

الزبتھ نے پوچھا "ان خوبصورت نغموں کا مصنف کون ہے؟"

رائن ہارٹ نے جواب دیا "ان نغموں کا کوئی مصنف نہیں ہوتا۔ یہ آپ ہی آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ خود بخود سڑکوں پر لوگ ان کو گاتے پھرتے ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان سے واقف ہو جاتے ہیں بعض ٹکڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں ہمیں خود اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے"۔

رائن ہارٹ نے ایک پرچہ اٹھا کر پڑھا:۔

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں

الزبتھ نے خوش ہو کر کہا "میں اس گیت سے واقف ہوں ۔اس کو گاؤ رائن ہارٹ "۔

۔ الزبتھ اور رائن ہارٹ نے مل کر گانا شروع کیا۔

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں ۔۔۔ بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

پھول ہو یا کہ شبنم نہیں یکساں کوئی ۔۔۔ کوئی خنداں ہی چمن میں تو ہے گریاں کوئی

ہیں مصائب ہی تو دیباچۂ عیش و راحت ۔۔۔ عقل اگر ہو تو بنے طالبِ حرماں کوئی

حوادث سے بن گزارا نہیں یاں ۔۔۔ حوادث سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

الزبتھ کی ماں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہی تھی۔ جب گانا ختم ہو گیا۔ تو رائن ہارٹ نے دوسرا پرچہ تلاش کر کے نکالا۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی :۔

بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

رائن ہارٹ نے مسکرا کر کہا "سنو! بچے بچے کی زبان پر یہ گیت موجود ہے۔ کوئی کسان اس گیت کو گاتا ہوا جا رہا ہے "۔

ایرک نے کہا "یہ نغمے بہت قدیم ہیں جنگل کی گہرائیوں سے نکل پڑتے ہیں ۔فضائے بسیط سے ٹپک پڑتے ہیں۔ خدا جانے ان نغموں کا بنانے والا کون تھا! "

اس کے بعد رائن ہارٹ نے دوسرا گیت گانا شروع کیا :۔

"یہ میری ماں کا قصور تھا
اسی نے مجھے مجبور کیا
کہ میں اپنے عاشق سے دستبردار ہو جاؤں
اور دوسرے شخص کو اپنا شوہر بنا لوں
میں نے بہت آرزو کی ۔منت و سماجت کی
مگر اس نے ایک نہ سنی
اب میری زندگی سے خوشی مفقود ہو گئی ہے
کاش میں پھر آزاد ہو جاؤں

یا صدفتہ لوٹ آئے؟

رائن ہارٹ گاتے وقت ایک عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ گانا ختم کر چکا تو الزبتھ اٹھ کر باغ میں چلی گئی۔ ایرک بھی اُٹھ کر ساتھ جانے لگا تو الزبتھ کی ماں نے اُسے روک دیا کہ الزبتھ کسی کام کی غرض سے باہر گئی ہے۔"

تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ باغ سے ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو سے بھرے ہوئے مکان کے اندر آرہے تھے۔ پانی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ درختوں پر سے بلبلوں کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

"نہ کھیل موسم گل میں شکار اے صیاد — چمن کی دیکھ لوں میں بھی بہار اے صیاد
جفا و جور کا گلچیں کے میں نشانہ ہوں — کوئی نہیں ہے مرا غمگسار اے صیاد

چاند کی روپہلی شعاعیں درختوں سے چھن چھن کر زمین پر آرہی تھیں۔ رائن ہارٹ نے کاغذات کو اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ جھیل کے کنارے کی طرف سیر کی غرض سے چل دیا۔

جھیل پر جنگل کے درختوں کے طویل سائے پڑ رہے تھے۔ صرف جھیل کا مرکزی حصہ چاند کی دھیمی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے نرم جھونکے درختوں سے ٹکرا کر لطیف نغمہ کی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ رائن ہارٹ جھیل کے کنارے کنارے جا رہا تھا، اس نے پانی کے اندر کنول کے ایک پھول کو دیکھا۔ اور کوٹ اتار کر پانی میں کود پڑا۔ کنارے کے قریب پانی بہت کم تھا۔ کانٹوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے اس کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پانی اتنا گہرا تھا کہ وہ اس میں تیر سکتا تھا۔ تیرنے کی جو اس نے کوشش کی تو دو تین غوطے کھائے۔ پھر سنبھل کر وہ پانی کی سطح پر آیا اور تیرنے لگا۔ اب وہ کنول کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ تیرتا جاتا تھا مگر کنول اس سے دور ہٹتا جاتا تھا۔ آخر کار وہ اس قدر قریب پہنچ گیا کہ کنول صاف نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پھول کو لے لینا چاہا مگر یکایک وہ جالے میں پھنس گیا اور غوطے کھانے لگا۔ اس نے مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور تیرتا ہوا کنارے کی طرف واپس گیا۔ کنول کا پھول اب بھی اسی جگہ پانی میں نظر آرہا تھا۔ اس نے کپڑے پہن لئے اور آہستہ آہستہ مکان کی جانب چلا۔ جب باغ سے کوٹھری کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ایرک اور اس کی ساس سفر کی تیاری میں مشغول ہیں۔ کیونکہ ضرورت سے انہیں دوسرے دن کہیں جانا تھا۔

"اتنی رات گزرے تم کہاں گئے تھے اور کیا کر رہے تھے؟" الزبتھ کی ماں نے رائن ہارٹ سے پوچھا۔

"میں جھیل سے کنول کا پھول لانے گیا تھا۔ مگر ناکام رہا۔"

ایرک نے پوچھا "کنول کے پھول کی تم کو کیا ضرورت تھی؟"

"کسی زمانے میں یہ پھول مجھے بہت محبوب تھا۔"

(۹)

الزبتھ

دوسرے دن سہ پہر کے وقت رائن ہارٹ مکان کے اُس پار جھیل کے کنارے الزبتھ کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ ایرک نے الزبتھ کو ہدایت کر دی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں رائن ہارٹ کو مکانات کا باقی حصہ اور جھیل کے دوسری جانب کے مناظر دکھائے۔ دونوں گھنٹوں تک ادھر ادھر گشت لگاتے رہے۔ آخر کار الزبتھ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ اس وقت رائن ہارٹ نے کہیں دور سے کوئل کی آواز سنی۔ بس اس کو کوئی واقعہ یاد آگیا۔ اس نے الزبتھ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا: "چلو سٹرابری تلاش کریں"۔

الزبتھ نے جواب دیا "یہ سٹرابری کا موسم نہیں ہے"

رائن ہارٹ نے کہا "لیکن اب موسم قریب ہی ہے"

الزبتھ سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر دونوں سیر و تفریح میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد رائن ہارٹ نے جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ اس کے چہرے پر رنج و غم کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے الزبتھ سے پوچھا:

"تم اس پھول کو پہچانتی ہو؟"

الزبتھ نے جواب دیا "اس کو لالہ کہتے ہیں۔ میں اکثر جنگل سے اس پھول کو لایا کرتی ہوں"۔

رائن ہارٹ نے کہا "میرے پاس ایک بیاض ہے جس میں لالے کا ایک پھول ہے مگر اب اس کی پتیاں مرجھا چکی ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ وہ پھول مجھ کو کس نے دیا تھا؟"

الزبتھ کی نظریں اس پھول پر جم گئیں جو رائن ہارٹ کے ہاتھ میں تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

رائن ہارٹ نے یکایک کہا "الزبتھ! ہمارا عہد شباب کہاں گیا؟"

الزبتھ خاموش رہی —— آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

الزبتھ نے کہا "طوفان کا سامان نظر آرہا ہے"۔ دونوں تیزی سے چلنے لگے اور جھیل کے کنارے پہنچ کر کشتی میں سوار ہو گئے۔

رائن ہارٹ یکایک الزبتھ کے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ہاتھوں نے دل کے راز کو فاش کر دیا تھا —— وہ راز جسے الزبتھ کے چہرے نے ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ جب عورت مغموم ہوتی ہے اور اپنے جذبات پر قابو پانا چاہتی ہے تو اس کے ہاتھوں میں خفیف سا لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ الزبتھ نے جب محسوس کیا کہ رائن ہارٹ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ تو اس نے اپنے ہاتھوں کو کشتی کے باہر پانی میں لٹکا دیا۔

جب وہ مکان پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص چاقو سان پر چڑھا رہا ہے اور چکی گھماتے وقت کچھ گاتا بھی جاتا ہے۔ ایک حسین لڑکی

جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ الزبتھ سے بھیک کی طالب ہوئی۔ رائن ہارٹ جیب ٹٹولنے لگا۔ مگر الزبتھ نے آگے بڑھ کر جتنی رقم اس کے پاس موجود تھی' اس لڑکی کو دے دی اور تیزی سے مکان کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔

بھیک مانگنے والی لڑکی وہیں کھڑی رہی۔

رائن ہارٹ نے اس سے پوچھا "تم اور کیا چاہتی ہو؟"

اس نے رائن ہارٹ کو تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "میں کچھ بھی نہیں چاہتی!" اور دروازے کے باہر نکل گئی۔ رائن ہارٹ نے اس کا نام لے کر پکارا۔ مگر اس نے جواب نہ دیا۔

میری چشم خوں فشاں ہے دردِ دل کی رازداں۔"

لڑکی دردناک آواز سے گا رہی تھی۔

رائن ہارٹ ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے کانوں میں ایک پرانے گیت کے الفاظ گونجنے لگے۔ اسے وہ موقع یاد آگیا جب اس نے یہ گیت سنا تھا:۔

"میری چشم خوں فشاں ہے . . . ."

وہ اپنے کمرہ میں چلا گیا اور آرام کرنا چاہا لیکن جذبات کا ایک دریا امڈا چلا آتا تھا۔ خیالاتِ پریشاں نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ نیچے بیٹھک کے کمرے میں گیا۔ مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میز پر وہ سرخ مالا رکھی تھی جو صبح کے وقت الزبتھ کے گلے میں تھی۔ رائن ہارٹ نے اس کو اٹھا کر دیکھا۔ مگر پھر فوراً ہی رکھ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مالا کے دانے آگ کے انگارے تھے جو اس کے ہاتھوں کو جلا ڈالتے۔ وہ جھیل کے کنارے چلا گیا اور کشتی کھول کر جھیل کی خوب سیر کی۔ وہ تمام ان مقامات پر گیا۔ جہاں جہاں الزبتھ کے ساتھ گیا تھا۔ واپس آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور دریچہ کے قریب آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیچے باغ میں ایک بلبل نغمہ زن تھا۔ رائن ہارٹ نے بلبل کے نغمہ سے لطف اندوز ہونا چاہا۔ مگر اسے صرف اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اب گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ رات زیادہ آگئی تھی۔ وہ گھنٹوں اسی طرح بیٹھا رہا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو صبح صادق کا وقت ہو چکا تھا۔ اب ظلمتِ شب کافور ہو چلی تھی۔ رائن ہارٹ نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنی چھتری لے لی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر نیچے کے کمرے میں اتر آیا۔ اتنے میں سیڑھیوں سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ رائن ہارٹ نے اس طرف پھر کر دیکھا تو الزبتھ نظر آئی۔ اس نے رائن ہارٹ کا شانہ پکڑ کر کہا۔ "تم اب واپس نہ آؤ گے۔ میں جانتی ہوں۔ تم ہرگز واپس نہ آؤ گے"۔ اس کی آواز میں اس قدر رقت تھی کہ وہ مشکل سے بول سکی۔

رائن ہارٹ نے کہا "میں اب کبھی نہ آؤں گا" اور دروازہ کھول کر باہر کی طرف گیا۔ چند قدم جانے کے بعد اس نے الزبتھ کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر تیزی سے بھاگ نکلا۔ اس طرح جیسے کوئی اس کو پکڑنے کے لئے آرہا ہو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ مگر رائن ہارٹ

کے خون میں ہیجان برپا تھا۔ وہ تیزی سے چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب کی سنہری شعاعیں افق سے نمودار ہوئیں۔ اب ابن مارٹ ایمبزی سے بہت دور نکل گیا تھا اور اس کے قلب کو کسی قدر اطمینان تھا۔

(۱۰)

بوڑھا آدمی

اب چاند کی روشنی کمرے میں نہ آتی تھی۔ بالکل اندھیرا ہوگیا تھا۔ بوڑھا آدمی اسی طرح آرام کرسی پر بیٹھا محوِ خیال تھا۔ بتدریج کمرے کی سیاہ فضا نے ایک جھیل کی شکل اختیار کرلی۔ جھیل کے اُس کنارے پر جہاں تک نظر کام کرسکتی تھی، کنول کا ایک پھول نظر آرہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

بوڑھے آدمی نے کہا: "بریجیٹ! تم نے اچھا کیا کہ لیمپ لے آئیں۔ میز پر رکھ دو۔"

اس نے کرسی میز کے قریب کھینچ لی اور مطالعہ میں مشغول ہوگیا۔

آرزو جلیلی

"دنیا کا مختصر ترین مختصر افسانہ"

ٹرین میں ایک شخص نے اثنائے گفتگو میں اپنے ہمسفر سے کہا: "لیکن مجھے بھوت پریت پر یقین نہیں!"

"نہیں؟" دوسرے نے پوچھا، اور غائب ہوگیا! . . . . .

(ترجمہ) "تمنائی!"

بھوکا ہندوستان

ایک مفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گزر
خاک پر بیٹھا تھا بچہ، اور بیوی تخت پر

تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا،
وزن اک نازک سی عورت کا بھی جس پر بار تھا

تیرہ قسمت گھر کا مالک پائمالِ صد جنوں
بوریئے پر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سرنگوں

فرقِ پیشانی پہ تھا چھایا ہوا دل کا دھواں
جس میں نقصاں تھیں خرافت کی سبک چنگاریاں

اس کی ہستی تھی اک ایسی ہستیِ نامعتبر
مارتے ہیں قہقہے جہال جس کے علم پر

تھا وہ یوں اس نامراد دنیا میں پابندِ قلق
ہر سبک سر کو تھا جس پر معترض ہونے کا حق

تھا وہ اُس عالم میں جب رہتی نہیں چہرے پہ آب
مانتا ہے شیب کے دعوے جب انساں کا شباب

منہ یقین کا جانبِ اوہام پھر جاتا ہے جب
آدمی خود اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے جب

فاقہ کش انسان جب ہوتا ہے یوں زیر و زبر
جھینپتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر

جب سبک ہوتا ہے اس کی رمزِ محبت کا نیاز
خود شریکِ زندگی بھی ترک کر دیتی ہے ناز

جب کوئی عزت سے پیش آتا ہے تو مردِ حزیں
سوچنے لگتا ہے یہ مجھکو بناتا تو نہیں

زندگی جس وقت ہو جاتی ہے یوں زار و حزیں
وہم بن جاتا ہے خود اپنی شرافت کا یقیں

دل میں جب احساسِ رحمت کا نہیں رہتا ہے دم
کفر کی سرحد پہ جب پڑتے ہیں انساں کے قدم

جب زبوں و خستہ جاں انسان کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں ہوتا ہے مدد کی التجا

زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ حسرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی موقع کبھی دیتے نہیں

جب خذف معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گہر
وہم ہوتا ہے رکاکت کا خود اپنی وضع پر

رُخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشاں
جس کے سچ پر جھوٹ کا ہوتا ہے دنیا کو گماں

اُس مصیبت سے تھی اُس کی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت میں شرافت تو لنے لگتی ہے پر

اس کے سر پر تھا تہی دستی کا وہ بارِ گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں

مفلسی کے اُس کنارے پر تھا وہ گرمِ خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف و بام پر
روح تھرانے لگی میری، یہ منظر دیکھ کر

گھر تھا یا اک کارواں بھٹکا ہوا، کھویا ہوا،
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی مکاں سویا ہوا

یہ کھنڈر اُس قصرِ عالی کا تھا اک ایسا مقام
تھا جہاں کل اُس کے آبا کے غلاموں کا قیام

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر آتا نہ تھا
عہدِ طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا

جو مکاں کل نغمۂ خدّام سے پُرجوش تھا
آج آقا کو لئے آغوش میں خاموش تھا

پوچھتا جاتا تھا لیکن خیر سے تو ہیں مکیں
مجھ میں اک مدت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں

طاق پر رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ،
طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلا نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ،
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

سرد چولھے کے قریب اُترتا ہوا ہلکا غبار
لگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

جا بجا سے پٹریاں دیوار کی چھوٹی ہوئی ... دھنیاں کُل پانچ تھیں، ان میں بھی دو ٹوٹی ہوئی
ایک گوشے میں تھا بستر کے عوض تھوڑا سا پیال ... جس پہ دو ٹکڑے دری کے اور اک صد پارہ شال
شال کے ہر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار ... عہدِ ماضی کی یہی لے دے کے تھی اک یادگار
بچہ بہلا سا ہوا تھا خاک کے اک ڈھیر سے ... ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے
کھیلنے میں طفلکِ معصوم تھا ڈوبا ہوا ... آئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا

کانپتی آئی صدا اور ہل گیا بچے کا دل، ... سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل
ہو گئی اگلی ضدوں کی یاد سے دنیا سیاہ ... ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ
ماں کی نظریں اٹھ گئیں، اٹھ کر مڑیں، مڑ کر جھکیں ... ہائے میرے لال میرے پاس تو کچھ بھی نہیں
دیکھ کر ماں کی اداسی ہو گئی پامالِ یاس ... انکھڑیوں میں آم کی سرخی تخیل میں مٹھاس
ہونٹ کانپے خود بخود اور رہ گئے پھر کانپ کے ... آنکھ میں غلطاں ہوئے اگلی ضدوں کے تجربے
راستے میں آ گئی دیوار، نالے چڑھ گئے ... منہ میں تھرائی زباں، الفاظ آگے بڑھ گئے،
چھا گیا آنکھوں پہ سناٹا دلِ ناکام کا ... اشک بن کر آنکھ سے ٹپکا تصور آم کا
چہرہ مرجھایا نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا، ... دل کے سناٹے میں بچپن کھو گیا، سونے لگا
نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے ... باپ کا سر اور دکھیا ماں کے لب ہلنے لگے

آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں
اس کرے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں

آہ اک دل بھی ترے آلام پر ہلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو و مسلم نہیں اُٹھتے تری امداد پر
تف ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پر

اس طرف سے خوبیٔ قسمت سے باجا اور گائے
اس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

ہائے کیا کرنا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ

ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں
ان کو جس میداں میں مرنا چاہیئے مرتے نہیں

سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی
مار کر اپنوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی

آہ اے ہندوستاں اے کشورِ زار و نزار
تیرے بچے بھی بلکتے ہیں جواں بھی بے قرار

اے ہزبرِ تند خو اُٹھ اور ان کو پھاڑ ڈال
بھیڑیے پہنے ہوئے پھرتے ہیں جو شیروں کی کھال

اے زمیں کی بھٹیو بھڑکو، پھاڑو، سانس لو،
اہلِ نخوت کو بھسم کر دو، جلا دو، پھونک دو

اے بھڑکتی آگ ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل،
اے رگِ غیرت اُبھر! اے خون کے چشمے اُبل

تا کجا یہ خواب اے ہندوستاں آغوش میں
آج بھی ہیں سینکڑوں ارجن ترے آغوش میں

تیرہ باطن سرکشوں کی ہمتوں کو پست کر
جست کر اے شیرِ نر، نظریں جما کر، جست کر

زندہ ہے تو میری ہمت کو پرِ پرواز دے
وہم ہوتا ہے مجھے، آواز دے، آواز دے

یہ اجل کی بے حسی ہے یا فقط خوابِ گراں
بول اے ہندوستاں ہندوستاں ہندوستاں

جوشؔ

لمعات

میدان! وسیع، بسیط، بے کنار جس کے درمیان سے ایک سڑک گزرتی تھی۔ سڑک کے کناروں پر کہیں کہیں شیشم یا پیپل کے درخت تھے۔ دونوں طرف لاتعداد کھیت تھے، کچھ خشک کچھ سرسبز کچھ چٹیل۔ یہ کھیت دور دور تک تاحدِ نگاہ بچھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ چوڑی نہر کے مٹیالے، پانی کی سُست رو نالیاں تھیں۔ سر پر بیساکھ کے اوائل کا سورج تھا۔ سردی بالکل نکل چکی تھی۔ دھوپ روز بروز تیز ہوتی جاتی تھی۔ ببول کے درخت عام تھے کہیں دو ایک اس کھیت کے کنارے، کہیں تین چار ان کھیتوں کے جوڑ پہ۔ ہوں نہ یک ایک آدھ بیری بھی تھی۔ کہیں کوئی دھتورے کا بوٹا بھی اگ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بیا، یا کالی کلچی یا کوئی اور ننھا سا سبز یا بھورا پرندہ پھدکتا، چہلتا، اڑان بھرتا، گذر جاتا۔ کوے اور گدھ عام تھے۔ بگو موخر الذکر ہمیشہ بہت بلند اپنے مضبوط بازوؤں پر فضا میں تیرتے نظر آتے۔ نیچے سے ان کی پرواز بہت پرسکون اور شاندار معلوم ہوتی۔ یہ میدان اس قدر ہموار تھا کہ میلوں تک نگاہ درختوں کو چیرتی ہوئی نکل جاتی اور کوئی چیز اسے روک نہ سکتی۔ یہاں کا آسمان، اس زمین کا ایک حصہ تھا۔ کیونکہ زمین سے جب نظر اٹھتی تو افق پر صاف زمین و آسمان کا اتصال دکھائی دیتا۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے ان میدانوں کا کوئی آغاز نہیں ہے اور نہ کوئی حد۔ اور اگر سامنے سے درخت ہٹ جائیں تو سامنے پھر بھی میدان ہی ہوں اور ایسے ہی درخت۔ ان بے پایاں میدانوں میں اس وقت کے سوا جب ہوا چلتی اور درخت مجبوراً ہل ہل کر کراہنے لگتے، کبھی کوئی صدا پیدا نہ ہوتی۔

سڑک کے اوپر سے بجلی کے بلند قامت اور پُرشوکت کھمبوں کا سلسلہ اٹھے ہاتھ گزر جاتا۔ ان میدانوں میں ہر طرف دیکھنے کے بعد یہی پرہیبت کھمبے تھے جن پر ہر پھر کر نظر ٹھہرتی۔ ایک اونچے کھمبے سے دوسرے کی چوٹی تک سات آٹھ موٹی موٹی تانبے کی تاروں کا جال ہوتا جس پر کبھی کبھی کوئی پرندہ آ بیٹھتا۔ ہر کھمبے پر زمین سے کچھ اوپر نیل کی ایک سُرخ تختی ہوتی جس پر ایک کھوپری کی تصویر نظر آتی۔ بانہیں پھیلائے یہ دیو قامت، آہنیں برج اس سرزمین پر حاوی تھے۔

اِس سڑک سے کوئی دو فرلانگ ہٹ کر کچے مکانوں کا ایک گاؤں تھا جس کو پیپل اور بڑ کے درخت سڑک سے تقریباً چھپائے ہوئے تھے۔ اسی لئے ان وسعتوں میں اس گاؤں کی کوئی ممتاز حیثیت نہ تھی۔ گاؤں کے باہر کچھ فاصلے پر ایک نشیب تھا۔ غالباً اسی جگہ سے مٹی نکال کر یہ گھر تیار ہوئے تھے۔ اس میں ایک حصہ باقی جگہ سے کافی گہرا تھا۔ یہاں برسات کا پانی ارد گرد سے بہا کر اکٹھا ہو جایا کرتا تھا۔ اس جوہڑ کی تہ میں چکنی مٹی کے بعد ریت آنی شروع ہو گئی تھی اس لئے یہاں سے لوگوں نے مٹی نکالنی بند کر دی تھی۔ اتفاق سے اس

کے بیچ اور بیچ کنارے پر کچھ سایہ دار درخت بھی تھے۔ ساری سردیاں اس میں کافی پانی رہتا اور گاؤں کے ڈھور ڈنگر یہیں آکے پانی پیتے اور گرمیوں میں یہیں وہ نہلائے جاتے۔ اس گاؤں کے کچھ لوگ سبزیوں کی کاشت بھی کرتے تقریباً سب سبزیاں اسی جوہڑ میں دھوئی جاتیں بعد میں یہیں سے چھکڑوں پر لاد کر لوگ نزدیک کے شہر کی منڈی میں بیچنے لے جاتے۔ شاید تہ میں ریت ہونے کی وجہ سے پانی بہت گدلا نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں میں لڑکیاں بالے یہاں صبح شام نہا بھی لیتے۔

آج کل کٹائی کے دن تھے۔ گاؤں کے گرد ہر طرف سبزی مائل زردی ہی زردی نظر آتی تھی۔ آدھ آدھ کوس تک جہاں تک نگاہ کام کرتی پکے ہوئے گیہوں کے کھیت پھیلتے چلے گئے تھے۔ البتہ اب بیچ میں کہیں کہیں کٹے ہوئے گیہوں کے گٹھے بندھے ہوئے ملتے۔ اور گندم گوں لوگ صبح سویرے ہی دور نزدیک کھیتوں میں بیٹھے فصل کاٹتے دکھائی دیتے لیکن شور نہ ہوتا۔ آوازیں بھی اٹھتیں کہیں کہیں سے کوئی کوک بھی سنائی دیتی، مگر اس وسیع فضا میں سب کچھ جذب ہو کر رہ جاتا۔ دور سے محسوس بھی نہ ہوتا کہ ان میدانوں میں کوئی متنفس موجود ہے۔

انہی دنوں مزدور لوگ کٹائی کے لئے جہاں کہیں جان پہچان ہو پہنچ جاتے۔ کسانوں کو مدد کی ضرورت ہوتی، دس پندرہ دن کا کام ہوتا۔ کچھ اناج مل جاتا، ایک دو روپے بھی مل جاتے، پگڑی کی قیمت ہی نکل آتی۔ مہینے دو مہینے کا غلہ گھر آ جاتا۔ کٹائی کے بعد آس پاس کی غریب عورتیں سٹے چننے آ جاتیں۔ غالباً نصف یا دو تہائی حصے پر وہ کٹے ہوئے کھیتوں میں جھکی ہوئی سارا دن گیہوں کے گرے پڑے ننھے ننھے سٹے چنتی رہتیں۔ کچھ کام بن جاتا۔ خانہ بدوش لوگ بھی ان دنوں اکثر ایسی ہی جگہ اپنی ٹاٹ اور سرکنڈوں کی جھونپڑیاں لا ڈالتے۔ مرد اگر کام مل جائے تو کٹائی کر لیتے ورنہ عورتیں تو ضرور چننے چنانے چلی جاتیں۔ وقت گزر جاتا۔

اس دفعہ بھی کچھ جانگلو خانہ بدوش اس گاؤں میں اپنا مختصر سا سامان گدھوں یا ایک پرانے چھکڑے پر لادے آ پہنچے اور گاؤں کے اس طرف اپنی تھیلیوں، ٹاٹ اور بانس کی جھونپڑیاں قائم کر لیں۔ دو تین جھونپڑیاں تھیں جن میں تین چار آدمی اور پانچ چھ عورتیں اور کچھ بچے تھے۔ یوں تو ہر چیز ان سب کی مشترک ہی معلوم ہوتی تھی۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ تین گھر تو ضرور ہیں۔ صبح اٹھتے ہی کچھ کھانے کا بندوبست کرتے، بچوں کا دانہ دو کا ... دو ایک عورتیں پاس کے گاؤں میں بھیک مانگنے چلی جاتیں۔ باقی سب مرد اور عورتیں ایک آدھ بوڑھی عورت یا مرد اور بچوں کے سوا پہنچ آنے کے بعد دوسرے دن ہی کام پر جانے لگے۔ ایک جھونپڑی میں جس کا رخ گاؤں کی طرف تھا ایک عورت کا دودھ پیتا بچہ تھا۔ وہ صبح اسے دودھ پلا کے اپنی جوان لڑکی کے سپرد کر جاتی۔ لڑکی اکثر جھونپڑی میں ایک چار پائی پر پڑی رہتی کبھی اٹھتی اور اگر بچہ روتا تو اسے اٹھا کے بہلاتی ورنہ پھر چار پائی پر پڑی رہتی۔ غالباً ابھی بیماری سے اٹھی تھی۔ کبھی لیٹے لیٹے طبیعت جو گھبراتی تو باہر نکل کر اس بوڑھی سے باتیں کر، اس کی چلم بھر، یونہی آس پاس ٹہل ٹہلا کر پھر جا لیٹتی۔

ان ڈیروں کو پینے کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی۔ اس لئے صبح سویرے ایک دو عورتیں گھڑے سر پر اٹھائے گاؤں چلی جاتیں

پاس ہی نہر کے پانی کی کسی گہری راج بہا سے بھر لیتیں یا جوہڑ ہی سے لے آتیں۔ بکریوں یا گدھوں کو پانی پلانا ہوتا تو بچے ادھر ادھر سے پلا لاتے۔ یونہی ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس جوان لڑکی کی صحت اب شاید اچھی ہو گئی تھی۔ کیونکہ جب سب لوگ کام کو جاتے تو وہ بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ کام کرنے کے لئے نہیں تو دیکھنے کے لئے چلی جاتی۔ یا اگر صبح ساتھ نہ جاتی تو دوپہر کو کسی بڑی بوڑھی کے ساتھ جو دوسروں کے لئے روٹی لے جا رہی ہوتی اپنے دودھ پیتے بھائی کو ماں کے پاس لے جاتی۔ مگر عموماً وہ اپنے چھوٹے بھائی بھتیجوں، بہنوں بھتیجیوں کے ساتھ پاس کے جوہڑ پر چلی جایا کرتی۔ خود کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتی اور ان کے کھیل دیکھتی یا انہیں زیادہ گہرے پانی میں جانے سے روکتی۔

اسی جوہڑ کے قریب گاؤں کی شاملات تھی۔ جہاں گاؤں کے مویشی چرتے۔ تمام گاؤں کے مویشی ایک ہی آدمی کے سپرد تھے۔ لوگ اسے یا تو فصل کے موقع پر غلہ دے دیتے یا چار چار آنے، آٹھ آٹھ آنے مہینہ دے دیتے اور یہ سارا دن انہیں چراتا رہتا۔ آج کل گھاس اور جگہ کم تھی، اسی لئے جوہڑ کے نزدیک کی شاملات ہی پر مویشیوں کا گزارا تھا۔ گائیں بھینسیں چرتی رہتیں اور یہ درختوں کے نیچے بیٹھا رہتا۔ بانسری بھی تھوڑی بہت بجا لیتا تھا۔ کبھی کبھی اس میں سے کوئی سر نکال لیتا کبھی سو بھی رہتا۔ اور دن ہوتے تو دو دستے یار، چھوٹے بڑے آ جاتے اور ایک میلا کچیلا تاش لے آتے۔ تمام دوپہر کھیلتے رہتے۔ لیکن اب کٹائی کے دن تھے۔ سب چھوٹے بڑے کھیتوں میں مشغول تھے۔ اکیلا ہوتا۔ کبھی بیٹھا رہتا اور اِدھر اُدھر کا کوئی ڈھور ڈنگر بچھڑ جاتا تو زور زور سے پکارتا۔ اور اگر وہ واپس نہ آتا تو اٹھ کر دوڑتا اور ایک آدھ سونٹا مار، پھر اوروں میں لا ملاتا۔

جوہڑ کافی رقبہ میں تھا۔ اور اس کی گہرائی میں بھی جگہ جگہ فرق تھا۔ چنانچہ زیادہ گہری جگہ وہ تھی جس کے کنارے پر درخت تھے۔ گاؤں کی طرف سے ایک ہموار ڈھلان چلی آتی تھی۔ ادھر پانی بھی زیادہ نہ تھا۔ چنانچہ جب کبھی گاؤں والیوں کو گارے کی ضرورت ہوتی تو یہیں سے جاتیں۔ مویشی بھی ادھر ہی پانی پینے آتے اور ادھر ہی نہلائے جاتے۔ بھینسیں بھی یہیں کے پایاب پانی میں مزے سے اینٹھتیں۔ دوسری جانب پانی گہرا تھا اور نسبتاً صاف بھی۔ چنانچہ عورتیں کپڑے دھونے یہیں آتیں اور اگر نہانا ہوتا تو بے تکلف نہا لیتیں۔ عام طور پر یہاں مرد نہ ہوتے تھے۔

چرواہے کی عمر کوئی بیس ایک سال ہوگی۔ گھر کا غریب تھا۔ تھوڑی بہت زمین بھی تھی۔ مگر عام طور پر باپ بیٹے بٹائی پر زمین لے لیتے۔ باقی بھائی باپ کے ساتھ کھیتی باڑی کرتے۔ یہ بچپن ہی سے سیلانی تھا۔ جب چھوٹا تھا تبھی اپنی گائے لے کے صبح سویرے نکل آتا اور چراتا رہتا۔ پھر یہاں سے نہلا دھلا کے سہ پہر کو واپس لے جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے لوگ بھی اپنے مال مویشی چرانے کے لئے دینے لگے۔ اور اب تو اور کسی کام میں اس کا جی لگتا ہی نہ تھا۔ مویشی ہوتے اور یہ اور اس کی بانسری۔ یا کوئی ساتھی۔ عموماً یہ ساتھی گاؤں کے لڑکے ہی ہوتے مگر آج کل اس کے پاس کوئی نہ آتا۔

عام طور پر جوہڑ پر شور نہ ہوتا تھا اور ہوتا بھی تو صبح و شام جب لڑکے نہانے آتے لیکن آج کل تو کسی کو فرصت ہی نہ تھی۔ اسی لئے جب ان خانہ بدوش بچوں نے آکر دوپہر کو بھی پانی میں چھلانگیں مارنا اور تیرنا اور شور مچانا شروع کیا تو اسے بہت بُرا لگا مگر پانی تو کسی کی ملکیت نہ تھا۔ اور نہ کبھی کسی کو اس نے یا گاؤں والوں نے منع ہی کیا تھا۔ پھر بھی اگر سوتے ہوئے کوئی کسی کو دق کرے تو آخر غصہ آ ہی جاتا ہے۔ اس لئے ایک دن تنگ آکر اس نے انہیں گالیاں دے کر وہاں سے نکال دیا۔ شاید اس لئے کہ چند گاؤں کی لڑکیوں کو وہاں کپڑے بھی دھونے تھے۔

دوسرے دن وہ لڑکے بانے اپنے ساتھ اپنی بڑی بہن کو جو اب تندرست ہو گئی تھی لے کے آئے انہیں خیال تھا کہ اس چرواہے کو ان کی بہن کچھ نہ کچھ کہے گی اور اسے خود بھی خیال تھا کہ کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیئے۔ مگر وہاں پہنچی تو کوئی نہ تھا۔ وہ بیٹھ گئی مگر اس نے لڑکوں کو تنبیہ کر دی کہ بہت شور نہ مچاؤ۔ اس کے اپنے کپڑے میلے تھے اور لہنگا جو اس کی پنڈلیوں تک آتا تھا کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ کرتے کی جگہ ایک صدری سی تھی جو انگیا بھی تھی اور کرتا بھی۔ لڑکی کا رنگ سانولا گندمی تھا مگر چہرہ بے داغ تھا۔ جوان جسم اس پر اعضا کی آزاد حرکت سے چال بہت دلاویز ہو گئی تھی۔ مگر اس کی خبر نہ اسے تھی نہ کسی اور کو۔ جب وہ چرواہا اپنی جگہ آیا تو اس نے اس لڑکی کو وہاں بیٹھے دیکھا اور یہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی۔ مگر اس نوجوان نے اس کی طرف زیادہ غور سے نہ دیکھا۔ لڑکے بھی بہت شور نہ کر رہے تھے، اور دور تھے۔ گاؤں کی طرف، البتہ، اس نے دو تین دفعہ دیکھا، مگر ادھر سے کوئی نہیں آ رہا تھا۔ خود لڑکی پہلے تو اس کی طرف بڑھی، مگر اس چرواہے کے انداز سے کچھ ایسی بے پروائی ٹپکتی تھی اور وہ اتنا راست قامت اور شکل کا ایسا اچھا تھا کہ وہ اسے کچھ نہ کہہ سکی۔

اتنے میں گاؤں کی طرف سے کچھ جوان لڑکیاں میلے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں اٹھائے آتی دکھائی دیں۔ ان میں ایک ایسی شوخ قدم تھی کہ دور ہی سے ان سب سے الگ نظر آتی تھی۔ نزدیک آئیں تو یوں معلوم ہوتا۔ گویا اس خوش رفتار کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ گندمی رنگ تھا، بھورے بھورے گال تھے جوان سینہ اور ہنستے ہوئے ہونٹ۔ مگر ان سب پر مستزاد اس کے جسم میں زندہ خون موجزن تھا۔ اور ہر حرکت ہر بات، ہر جنبش سے شوخی اور آزادی اور بے فکری ٹپکتی تھی۔ خانہ بدوش لڑکی نے دیکھا کہ وہ چرواہا جوہڑ کے پاس کنارے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جب تک وہ لڑکیاں وہاں رہیں ان میں اتنا مشغول رہا کہ اسے اور کسی چیز کا خیال نہ رہا۔

دوسرے دن بھی یہی کیفیت گزری، اور پھر ہر روز وہ دیکھتی کہ وہ لڑکی کبھی اکیلی، کبھی کسی کے ساتھ، کبھی کپڑے دھونے، کبھی گاگر لینے، کبھی کسی بچہ کو ساتھ لئے ہوئے نہانے ہی وہاں آتی۔ اور وہ چرواہا اسے دیکھتا رہتا۔ ایک دن وہ ذرا دیر سے پہنچی۔ آئی تو دیکھا کہ وہ لڑکیاں دو ایک سہیلیوں کے ساتھ کپڑے دھو کے پانی میں اتر کر نہا رہی ہیں۔ مگر وہ جوان چرواہا وہاں موجود نہیں۔ وہ اپنی جگہ آ کے بیٹھ گئی مگر جب اس کا اپنا جسم اسے پھر تھکا تھکا سا محسوس ہونے لگا تھا وہ گھاس پر چھاؤں میں ایک بازو کے بل لیٹ گئی۔ اس کی پنڈلیاں اس طرح لیٹنے سے گھٹنوں تک کھلی تھیں اور ان کی سڈول اور نرم ساخت صاف نمایاں ہو رہی تھی۔ مگر وہاں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اتنے میں وہ لڑکیاں

نہا کے نکلیں اور کپڑے پہننے لگیں۔ جب وہ تیار ہو کے جانے لگیں تو پھر اس خانہ بدوش لڑکی نے ادھر ادھر غور سے نگاہ دوڑائی۔ ایک درخت کے دوسری طرف اسے شبہ ہوا کہ اس چرواہے کا سونٹا تھوڑا سا دکھائی دے رہا ہے۔ مگر ہر طرف خاموشی تھی۔ جب وہ لڑکیاں چلی گئیں تو وہ چرواہا بھی انہیں درختوں سے نکل کر، اس اجنبی لڑکی کے پاس سے ان دیکھے گذرتا ہوا اپنی گایوں بھینسوں کی طرف چلا گیا۔

وہ دیر تک وہاں بیٹھی رہی مگر وہ جوان پھر نہ آیا۔ دوسرے دن وہ پھر بچوں کو ساتھ لائی، مگر اس دن جب تک وہ وہاں رہی، وہ چرواہا اسے دکھائی نہ دیا۔ وہ خود اٹھی اور پریشان و آوارہ ادھر ادھر پھرتی رہی۔ بلکہ جہاں کٹائی ہو رہی تھی اور اس کے ماں باپ اور بھائی بند کام کر رہے تھے، وہاں بھی ہو آئی۔ گاؤں کی طرف بھی گئی۔ مگر وہاں اسے کیا ملتا! نہ وہ لڑکی دکھائی دی اور نہ وہ چرواہا ہی ملا۔ بیشی شاملات میں چر رہے تھے اور جوہڑ کے اس کنارے پانی میں بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔

یونہی ایک دو دن اور گزر گئے۔

لڑکی بہت پریشان رہنے لگی۔ ایک دن اتفاق سے جب وہ اکیلی جوہڑ کے پاس پہنچی تو اسے وہ چرواہا کنارے پر لیٹا مل گیا۔ وہ آج اس کی طرف نہ گئی بلکہ دوسری طرف مڑ کر گاؤں کی جانب سے پانی کے کنارے آئی۔ اسے کچھ مسرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ اب تو وہ اس کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بڑی توجہ سے اپنی صدری اتاری، پھر لہنگا اتارا اور پانی میں اترنے لگی۔ اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا اور وہ اپنے جسم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی موہوم سے احساس کی وجہ سے اس نے اپنے بدن میں ایک ہلکی سی گرمی محسوس کی۔ جب پانی اس کی کمر تک آ پہنچا تو اس نے نظر اٹھا کر اپنے چرواہے کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔

نزدیک و دور اس خطۂ زمین کی لامتناہی وسعتوں میں کوئی شور، کوئی آواز، کوئی دھڑکن سنائی نہ دیتی تھی۔ اوپر آسمان کی لامحدود بلندیاں تھیں اور نیچے وسیع بیابان!

فیاض محمود

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق و این عجب

زہر زبان کہ می شنوی نامکرر است

شاہراہ پر

شاید وہ شام اپنے ساتھ غیر معمولی تیرگی لائی تھی۔ یا میں نے ہی اس سے قبل تاریکی اور وحشت کو کبھی یوں دوش بدوش نہ دیکھا تھا۔ کمرے کے ہر کونے سے تاریک سائے اُٹھے اور فضا میں دم توڑتی ہوئی روشنی کی آخری جھلکیوں سے دست و گریباں ہونے لگے ——— میں نے ظلمت و نور کی اس کشمکش سے گھبرا کر سامنے کی کھڑکی کھول دی۔ تاکہ ایک بار پھر اس کھلی کھڑکی سے روشنی کو تاریکی پر غالب دیکھ لوں۔ لیکن شفق کی سرخ روشنی بھی یوں کانپتی اور لرزتی ہوئی اندر آئی۔ گویا وہ خود تاریکی کے ہاتھوں میرے پاس پناہ لینے آئی ہے۔ اور اس اداس روشنی نے کمرے کی ہر چیز کو اور بھی افسردہ بنا دیا۔

پھر دفعتہً چھت میں کوئی چڑیا پھڑپھڑائی اور ہوا کا ایک سرد جھونکا ہلکی سی سنسناہٹ کے ساتھ کھڑکی میں سے گزر گیا۔ اور اس جھونکے کی ہلکی سی سنسناہٹ اور چڑیا کے پروں کی دھیمی آواز نے خدا جانے کیوں تنہائی کا شدید احساس میری روح پر طاری کر دیا۔ ——— میں اس کمرے میں تنہا ہوں ——— بالکل تنہا ——— اور سرد دنیا نے شاید میرے خلاف سازش کر لی ہے کہ اس کی خوشیوں سے معمور صداؤں کی ہلکی سے ہلکی بھنبھناہٹ بھی اس کلبۂ احزاں تک کبھی نہ آئے گی ——— ہر کوئی اپنی پُر مسرت آواز کو ایک افسردہ بازگشت میں تبدیل کرنے سے گریزاں تھا۔ ایک ایسا ساز جس سے افسردہ گتوں کے سوا کبھی کوئی آواز نہ نکلی وہ ان کے زمزمہ ساز ترانوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل ہی کب تھا؟

میں نے وحشت اور تنہائی کے خیال کو بھول جانے کے لئے کمرے کے تمام بند دروازے کھول دیئے۔ شاید سرد اور تیز ہوا اندر آکر کوئی نیا تغیر کر ڈالے ——— لیکن ہر سمت سے وحشت، حزن اور تاریکی کو ساتھ لئے ہوئے اداس قدموں سے آتی اور چپکے چپکے آکر میرے پہلو میں سر جھکا دیتی۔

آخری کھڑکی شاہراہ پر کھلتی تھی اور مجھے یاد نہیں کہ اس سے قبل میں نے اسے کب کھولا تھا لیکن آج اس کھڑکی کے کھلتے ہی میرے قدم وہیں رک گئے ——— شاید تنہائی کے طویل لمحے بھی اپنی معمولی سست رفتاری سے اُکتا کر ایک گردش کے متلاشی تھے۔ ——— یک بیک زندگی اپنی تمام خوشگوار مصروفیتوں اور ہنگاموں کے درمیان میری نگاہ کے سامنے آگئی۔ جس طرح تاریک جنگلوں میں بھٹکا ہوا مسافر کسی شہر کی دور و دراز روشنیوں پر نظر پڑتے ہی خوف اور تنہائی کی تمام کوفت کو بھول جاتا ہے اسی طرح میں نے اپنے خلوت کدہ کے تاریک روزن سے چپکے چپکے روشن دنیا پر نگاہ ڈالی۔

کیا یہی وہ بارونق بستی تھی جسے میرا خیال مجھ سے دور، بعید از قیاس فاصلوں پر پہنچا چکا تھا، اور جو اپنی تمام درخشانیوں سمیت کسی سیاہ خانے کی تاریک زندگی پر دُور سے مسکراتی نظر آتی تھی۔ آخر میں نے اپنے قریب ہی اُسے ڈھونڈ پایا —— پھر کیوں نہ میں بھی دنیا کی گوناگوں مسرتوں میں شامل ہو جاؤں؟ کیوں نہ تمام افکار کو اس چہل پہل اور گہما گہمی میں غرق کر دوں؟

مگر میری عزلت گزینی نے تو کبھی مجھے اس چھوٹی سی کھڑکی کے قریب بھی نہ آنے دیا تھا۔ زمانہ گزر گیا —— اور اب یہ دنیا کیوں کر مجھے اپنی مسرت کا راز بتائے گی۔ ایک اجنبی کو کون اپنی قیمتی متاع کا حصہ دار بنا سکتا ہے؟

راستے سے ذرا ہٹ کر درخت کے نیچے ایک نابینا فقیر کھڑا ہر گزرنے والے کے سامنے اپنے کمزور بازوؤں کو پھیلا پھیلا کر پیہم صدا لگا رہا تھا۔ معلوم نہیں کب سے وہ کھڑا تھا —— مگر اب تو اس کی دبلی پتلی ٹانگیں ڈگمگا رہی تھیں۔ اور اس کی صدا اس کے حلق سے بلا ارادہ رُک رُک کر نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ اتنی مایوسانہ جیسے یاس نے اس آواز سے امید کی ایک ایک رمق چن لی ہے۔

ہجوم کو اپنی بے پناہ مصروفیتوں میں رک کر یہ بے معنی سی صدا سُن لینے کی بھی فرصت نہ تھی اور واقعی ان معمولی سے ٹوٹے پھوٹے فقروں کی اُن بڑے بڑے معاملات کے سامنے حقیقت ہی کیا تھی جو ان سب کو درپیش ہوں گے۔ لیکن آہ کس قدر ادنیٰ تھی فقیر کی خواہش۔ ہر راہگیر سے ایک پیسہ طلب کرنا —— اور وہ اس میں بھی ناکام تھا۔ لوگوں کی نظروں میں اس ناکامی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ خود نہ جانے کن بڑی بڑی کامیابیوں کے آرزومند تھے۔ پھر وہ کیسے جان سکتے کہ آنکھوں کا نور کھو چکنے کے بعد، اپنی تمام حسرت نصیبیوں سے گزر کر اب فقیر کے لئے ہر راہگیر سے ایک تانبے کا سکّہ حاصل کرنا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

زندگی کی مسرتوں کے خوش آیند لمحے شاید خواب میں بھی اس بے نور چہرے کے قریب ہو کر نہ گزرے ہوں گے، اور میری نگاہ آج صرف مسرت اور درخشانی کو دیکھنے کی آرزومند تھی۔

سامنے سے ایک ننھا سا غریب بھولا بھالا بچہ آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک پیالہ تھا جس میں شاید اس کے کھانے کی کوئی چیز ہوگی۔ وہ طفلانہ مسرت سے اپنے سر کو جنبش دیتا اور مسکراتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے معصومیت اس کی ہمرکابی کے لئے آسمانوں سے نیچے اتر آئی ہے! اور یک بیک تمام کائنات اس کی موجودگی میں مسکرا اٹھی۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ بچے کی بے لوث مسکراہٹ کو چرا کر ہمیشہ کے لئے اپنے دل کے اندر محفوظ کر لوں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں یہ سب کچھ گزر گیا۔ چلتے چلتے بچے کی نگاہ ایک بڑے سے کتے پر پڑ گئی۔ جو بجلی کے کھمبے کے پیچھے سے اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ بچے نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے پاؤں

میں ٹھوکر لگی اور ساتھ ہی اس کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ دفعتہً اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا اور فرطِ رنج سے وہ وہیں زمین پر گر کر رونے لگا۔ روتے اور سسکیاں بھرتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ شاید ہمدردی کا کوئی جملہ سننے کے لئے ——— لیکن لوگ اپنی بے پناہ مصروفیتوں میں غرق تیزی سے آگے بڑھے جا رہے تھے۔

آخر بچے نے ایک ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور سسکیاں بھرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے پیالے کے ٹکڑوں کو اٹھا اٹھا کر چاٹنے لگا۔

قریب سے چند نوجوان لڑکیاں ایک دوسری کا ہاتھ تھامے دھیمی آواز میں اپنی باتیں کرتی ہوئی گزر گئیں اور ان کے پیچھے دو مُسن عورتیں اپنی سنجیدہ اور تیز نگاہوں سے انہیں گھورتی ہوئیں ان کی بے فکری پر بیزاری کا ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔

سڑک کے دوسرے کنارے ایک بڑھیا میوہ فروش دیر سے بیٹھا صدا لگا رہا تھا۔ شاید صبح سے لے کر اب تک وہ اپنی ٹوکری کو سڑک پر رکھے متواتر یہی صدا لگا رہا تھا ——— اس کے صبح و شام یونہی بسر ہوئے جا رہے تھے ——— وہ کبھی کنج عافیت میں بیٹھ کر اپنے متعلق کچھ اور نہ سوچ سکا تھا۔ لیکن کیا یہ بے ربط سی صدا کسی انسانی قلب کو مطمئن کر دینے کے لئے کافی تھی۔ ؟ نہیں اس آواز کی لرزش اور اس کا تھکا ہوا اداس لہجہ خود اس بات کی شہادت دے رہے تھے کہ یہ صدا اُسے کبھی مطمئن نہیں کر سکی۔ ہاں صرف وہ دن بھر سڑک کے کنارے بیٹھ کر جھوٹ بولنے پر مجبور تھا۔ اگرچہ ان گلے سڑے پھلوں کی تعریف کے بجائے اس کے دل میں بھی زندگی کے متعلق مختلف قسم کے ہنگاموں کا ایک طوفان برپا رہتا تھا لیکن اس کی زبان ہر لمحہ اس کے دل سے الگ رہنے پر مجبور تھی۔

ایک موٹر گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی گزری اور ادھیڑ عمر کا ایک شریف صورت شخص جو اپنے خیال میں محو سڑک پر سے گزر رہا تھا موٹر کی جھپٹ سے بچنے کے لئے بے اختیار بھاگ کر دوسرے کنارے پر جا کھڑا ہوا اور جب وہ رکا تو احساسِ ندامت سے اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم آ گیا۔ شاید وہ اپنی وضع داری کو قائم رکھنے کے لئے مسکرا رہا تھا لیکن اس خاموش مسکراہٹ نے اس کے دلی جذبات کو آئینے کی طرح اس کے چہرے پر روشن کر دیا ——— اپنی جگہ تو وہ بھی ایک معزز انسان تھا۔ غریبی اس کی سنجیدگی اور وقار کو تو اس سے نہیں چھین سکی تھی ——— پھر کیوں اُسے اس بے بسی کے انداز میں موٹر کی جھپٹ سے بچنے کے لئے بھاگنا پڑا تھا جب کہ اس جیسا ایک انسان ہی اس موٹر میں بھی سوار تھا۔

پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن شام کی دھندلی فضا میں ایک مجبور مسکراہٹ دُور دُور تک پھیلی ہوئی باقی رہ گئی۔

غریب بچہ واپس جا رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے پیالے کے خالی ٹکڑے وہیں زمین پر پڑے تھے۔

میں نے کھڑکی کو چھوڑ دیا۔ میرا کمرہ روشن ہو چکا تھا لیکن آہ ——— دنیا باہر تاریکی میں ٹھٹکتی پھر رہی تھی۔ بین مال سے لوگوں

بچے کی طرح جو اپنے سینے میں درد کی ایک ہلکی سی ٹیس محسوس کرتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ اس کی آرزو کیا ہے۔

اور اس رات میں نے خدا کو ان الفاظ میں پکارا

اے خدا! اے قادرِ مطلق! اپنی مجبور کائنات سے محبت کرنے کے لئے اس تنگدل کے عوض مجھے اپنا وسیع دل دے ڈال ——— یا مجھے اس مختصر سی ناچیز زندگی کے بجائے اتنی زندگیاں عطا کر جنہیں تیری پیدا کی ہوئی خاک کے ایک ایک ذرہ کی آسائش کے لئے میں قربان کرسکوں۔

میرے خدا! تیری دنیا تاریک رات میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ مجھے اپنا وسیع دل دے ڈال۔

"راہرو"

بیمار بچہ

بچہ۔ امی جان! اپنا ہاتھ میری پیشانی پر رکھنا۔ اماں۔ اماں میں کہاں ہوں؟ مجھے یہ کمرہ اتنا کھلا اور ڈراؤنا کیوں دکھائی دیتا ہے۔ اتنی رات گزر چکی ہے۔ مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟۔

ماں۔ میری جان! ڈرو نہیں! رات بڑے آرام سے گزر رہی ہے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں جو تمہیں تکلیف پہنچائے۔ تمام شہر میں لیپ جل رہے ہیں اور کوئی بچہ بے قرار نہیں۔ سب مزے کی نیند سو رہے ہیں۔

بچہ۔ اُمّی! اُمّی! میرے کان میں کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیوں بعض چیزیں اتنی بڑی اور نزدیک ہیں اور بعض اتنی چھوٹی اور دور ہیں کہ ان کے خیال سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھ سے کیا قصور ہوگیا ہے مجھے کیوں ڈر لگتا ہے؟ پیاری اماں تم کیوں رو رہی ہو؟

ماں۔ باہر بازار میں لوگوں کے چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے گاڑیاں بھی چل رہی ہیں خدا بڑا مہربان ہے۔ ابھی ایک دو گھنٹے میں سورج کی روشنی کھڑکی کے پردے میں سے چھن چھن کر کمرے میں داخل ہوگی۔ اس وقت میرا لخت جگر آرام سے سو جائے گا اور چہچہاتے ہوئے پرندے اور پہاڑیوں پر چرتی ہوئی بھیڑیں اس کو خواب میں نظر آئیں گی۔ اے خدا! اس ڈراونی رات میں جب تمام بچے آرام سے سو رہے ہیں یہ ننھا معصوم جسے کھیل کود کے سوا کچھ پتہ ہی نہیں ڈر کے پنجے میں گرفتار مصیبت کی گھڑیاں کاٹ رہا ہے۔ میرے پروردگار! جب صبح ہو اور سورج کی روشنی تمام کائنات کو منور کردے جب دوسرے بچے نیند سے بیدار ہو کر خوشی سے اچھلنے کودنے اور گانے لگ جائیں تو تُو اس معصوم پر اپنی رحمت کے پھول برسا۔ خدایا رحم کر۔ اس بچہ کو بیماری سے نجات دے۔ سدا پائندہ رکھ! بہر صورت اس مصیبت سے نکال۔

(ترجمہ)

ذکاء اللہ

گیت کے مناظر

انگلیوں کا رقص اور تاروں کی لرزش کیا کہوں؛ دل میں لہریں لے رہا ہے ایک سیلاب جنوں
پھر رہے ہیں گیت کے صد رنگ منظر آنکھ میں جذب ہیں کیا کیا نقوشِ سحر پرور آنکھ میں

یہ گماں ہوتا ہے اک تالاب ہے حسن آفریں سانپ سے لہرا رہے ہیں جس کے اندر ہمنشیں
اور اس میں رفتہ رفتہ ڈوبتا جاتا ہوں میں موت کے اعماق کی جانب بڑھا جاتا ہوں میں

یا کوئی ویراں محل ہے جس کی خوابیدہ فضا کر رہی ہے پیش نظارہ خیال و خواب کا
اک بہاریں شام ماضی کی، ہے لوٹ آئی ہوئی قہقہوں کی ایک پنہاں گونج ہے چھائی ہوئی
چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سے فضا معمور ہے آنچلوں کی سرسراہٹ سے ہوا مخمور ہے

یا کوئی جنگل ہے، سناٹا ہے جس میں چار سُو دوپہر کا وقت ہے اور چل رہی ہے گرم لُو
اور افق سے اٹھ رہی ہے ایک مستانہ گھٹا لے کے اپنے ساتھ اک طوفاں سرور و کیف کا
جوشِ مستی میں بگولے ناچتے ہیں اس طرح ریگِ صحرا میں امنگیں جاگ اٹھی ہوں جس طرح

یا کوئی دریا ہے جس میں اک سفینہ ہے رواں اور سفینے میں ہے روشن اک چراغِ نیم جاں
جس کی دھیمی سی ضیا میں جھلملاتا ہے جنوں لے رہا ہے سانس ہر سُو شب کا وحشت زا فسوں

غرق ہے دل مضطرب جذبات کے ہیجان میں
کھا رہی ہے روح ہچکولے کسی طوفان میں

عدم

چھبّیس مزدور اور ایک دوشیزہ

ہم تعداد میں چھبّیس تھے —— چھبّیس متحرک مشینیں ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک بسکٹوں کے لئے میدہ تیار کرتے۔

ہماری زنداں نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں جن کا نصف حصہ آہنی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور شیشے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے، اینٹوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتی تھیں۔ اس لئے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔

ہمارے آقا نے کھڑکیوں کا نصف حصہ اس لئے بند کرا دیا تھا کہ ہمارے ہاتھ اس کی روٹی میں سے ایک لقمہ بھی غریبوں کو دینے کے لئے باہر نہ نکل سکیں؛ یا ہم ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

ہمارا مالک ہمیں "جیل کے غلاموں" کے نام سے پکارتا اور کھانے کے لئے گوشت کی بجائے انتڑیاں دیتا۔

اس سنگین زنداں کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑیوں کے جالے سے اٹی ہوئی تھی ہم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس چار دیواری میں جو کیچڑ اور میدے کے خمیر سے بھری ہوئی تھی ہماری زندگی —— غم و فکر کی زندگی تھی۔

پوری نیند اور آرام کئے بغیر ہم ہر روز صبح پانچ بجے بیدار ہو کر نیم خوابی ہی کی حالت میں اس میدے سے بسکٹ تیار کرنے لگ جاتے جو ہمارے دوسرے رفیقوں نے ہمارے سونے کے وقت تیار کیا ہوتا تھا۔

اس طرح صبح سے لے کر رات کے دس بجے تک ہم میں سے کچھ تو بسکٹوں کے لئے خمیر تیار کرتے رہتے اور کچھ میدہ گوندھتے رہتے۔ اتنا عرصہ ہی ابلتے ہوئے پانی کی آواز اور بھٹی میں نانبائی کے سلاخ ڈالنے کا شور ہمارے کانوں میں گونجتا رہتا۔

صبح سے لے کر شام تک بھٹی جہنم کی طرح دہکتی رہتی اور اس کی سرخ شعاعوں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا گویا ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا ہے۔

وہ بڑی بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی جو اپنے بڑے حلق سے آگ اگل رہا ہو یا ہمارے سامنے جہنم کی آگ کی طرح جھلسا دینے والی گرم سانس لے رہا ہو اور ہمارے غیر مختتم کام کا اپنی پیشانی کے دو سیاہ و تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر رہا ہو۔ یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے —— آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحمدلی کے جذبے سے عاری ہوں۔

ہر روز ہم ناقابلِ برداشت گرد و غبار اور پانی کی جھلسا دینے والی بھاپ کے درمیان اپنے عرق آلود ہاتھوں سے

میدہ گوندھتے رہتے اور بسکٹ تیار کرتے ہمیں اس کام سے سخت نفرت تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہم اپنے تیار کردہ بسکٹوں پر ریت ملی سیاہ روٹی کو ترجیح دیتے۔

روزمرہ کے کام سے ہمارے اعضا مشینوں کی طرح خودبخود کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے اور بسا اوقات ان کی حرکت ہمارے دل و دماغ سے محو ہو جاتی تھی۔

کام کے دوران میں ہم ایک دوسرے سے بالکل ہمکلام نہ ہوتے کیونکہ ہماری گفتگو کے لئے کوئی موضوع ہی نہ تھا اس لئے ہمارا تمام وقت خاموشی میں گزرتا۔ بشرطیکہ ہم میں سے کوئی کسی سے جھگڑ نہ پڑے ——— مگر جھگڑنے کا موقع کبھی نہ آتا تھا ——— اور آتا بھی کیسے؟ جبکہ انسان نیم مردہ ہو یا اس کی حیات شب و روز کی متواتر محنت سے ایک بت کی طرح کند اور مردہ کر دی گئی ہو۔

خاموشی ان اشخاص کے لئے جو سب کچھ کہ چکے ہوں اور کچھ کہنے کے لئے باقی نہ رکھتے ہوں ایک خوفناک اذیت ہے مگر ان انسانوں کے لئے جو ابھی تک اپنی آواز ہی سے ناآشنا ہوں خاموشی بجائے تکلیف دہ ہونے کے آسان اور راحت رساں ہے۔ اس خاموشی کو کبھی کبھی ہمارا راگ توڑ دیتا ——— وہ راگ اس طرح ظہور میں آتا۔

ہم میں سے کبھی ایک تھکے ہوئے گھوڑے کے ہنہنانے کی طرح کوئی ایسا راگ الاپنا شروع کر دیتا جو عموماً ایسے موقعوں پر روح کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ پہلے پہل تو اس اداس راگ میں کوئی شامل نہ ہوتا اور وہ راگ ہماری زنداں نما کوٹھڑی کی چھت تلے شمع کی لو کی طرح لرزتا رہتا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد اس گانے والے کے ساتھ ہم میں سے ایک اور شامل ہو جاتا ——— اب دو غمگین ہم آہنگ آوازیں ہماری قبر نما کوٹھڑی کی کثیف فضا میں تیرتی نظر آتیں ——— تھوڑی دیر کے بعد ہم سب اس راگ میں شامل ہو جاتے اب بہت سی آوازیں جمع ہو کر سمندر کی موجوں کی طرح اس سنگین قفس کی سیاہ دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر گونجنا شروع کر دیتیں۔

اس طرح ہم سب اپنے آپ کو راگ میں مصروف پاتے۔ ہمارے بلند راگ کے سُر کوٹھڑی میں سما نہ سکتے تھے۔ وہ پتھر کی سیاہ دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر آہ و زاری اور نالہ و فریاد کرتے اور ہمارے بے حس دلوں میں ایک ہیجان ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتے جو مندمل زخموں کو پھر ہرا کر دیتا اور دل کو اک نئے الم کے لئے بیدار کر دیتا۔

اکثر کوئی گانے والا، سرد آہ بھرتے ہوئے اپنا گانا بند کر دیتا اور آنکھیں بند کئے، اپنے رفیقوں کے راگ کو خاموشی سے سنتا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ——— اس کی نگاہوں میں راگ کی بڑھتی ہوئی لہر ایک دور افتادہ سڑک تھی ——— دور بہت دور ——— ایک کشادہ سڑک سورج کی چمک اور روشنی سے منور جس پر وہ اپنے آپ کو گامزن پاتا۔

اس دوران میں آگ کے شعلے بھٹی میں سرخ زبانیں نکال رہے ہوتے، نانبائی کی آہنی سلاخ بھٹی کی زرد اینٹوں پر تیز رفتار سے کھیل رہی ہوتی ابلتے ہوئے پانی کا شور بدستور جاری رہتا اور شعلوں کا عکس دیوار پر رقصاں، خاموش ہنسی ہنس رہا ہوتا ——— اور ہم کبھی

غیر کے لفظوں میں اُن انسانوں کا دکھ درد بیان کرنے میں مصروف ہوتے جن سے سورج کی روشنی چھین لی گئی ہو ——— جو غلام ہوں۔
یہ تھی ہماری زندگی ——— جیسیں غلاموں کی زندگی۔ اس قفس میں زندگی کے ایام اس قدر تلخ گزرتے کہ معلوم ہوتا کہ اس سنگین مکان کی تینوں منزلیں ہمارے کندھوں ہی پر تعمیر کی گئی ہیں۔

گانے کے علاوہ ہمارے پاس ایک اور شغل تھا جس کی ہماری نظروں میں ویسی ہی قدر و قیمت تھی جیسی سورج کی دلفریب شعاعوں کی۔
ہمارے مکان کی دوسری منزل میں زری کا ایک کارخانہ تھا جس میں بہت سی لڑکیاں ملازم تھیں۔ ان لڑکیوں میں سولہ برس کی ایک دوشیزہ شینیا نامی بھی تھی جو ہمارے سامنے والی دیوار کی چھوٹی کھڑکی کے پاس ہر روز آتی اور سلاخوں کے ساتھ اپنا گلاب سا چہرہ لگا کر سریلی آواز میں پکارتی "مظلوم قیدیو! مجھے تھوڑے سے بسکٹ تو دو"۔

اس آواز کو سنتے ہی ہم سب کھڑکی کے پاس دوڑے جاتے اور اس خوبصورت اور معصوم چہرے کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگ جاتے۔ اس کی آمد ہمارے لئے ایک نہایت خوشگوار چیز تھی۔ اس کی تیکھی ناک کو کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چمٹے ہوئے اور سپید دانتوں کو مسکراتے ہوئے سرخ ہونٹوں میں چمکتے ہوئے دیکھنے سے ہمارے دل کو راحت پہنچتی تھی۔ اُس کو کھڑکی کے پاس دیکھ کر ہم سب دروازے کی جانب بڑھتے اور ایک دوسرے کو ریلتے ہوئے دروازہ کھول دیتے۔ دروازہ کھلنے پر وہ اندر آجاتی ——— ہمیشہ اسی انداز کے ساتھ مسکراتی ہوئی، اپنے خوبصورت سر کو ایک طرف لٹکائے ہوئے جس سے بھورے بالوں کے خوبصورت گیسو عجب دلکش انداز میں اس کے شانوں پر لٹک رہے ہوتے۔

ہم غلیظ، زشت رُو، بد وضع اور حسرت زدہ بھکاریوں کی طرح کھڑے اس کی شکل کی طرف دیکھا کرتے اور وہ رلونے کی دہلیز پر کھڑی محو تبسم ہوتی۔ ہم سب اس کی خدمت میں صبح کا سلام عرض کرتے اور اس کے ساتھ گفتگو کرتے وقت خاص الفاظ استعمال کرتے ——— وہ الفاظ ہماری زبان سے خاص اُسی اور صرف اُسی کے لئے نکلتے۔
اس سے ہمکلام ہوتے وقت ہماری آواز خلافِ معمول ملائم اور نرم ہوتی اور ہمارے بھونڈے مذاق اور ٹھٹھے اس وقت بالکل غائب ہو جاتے ——— یہ آداب صرف اسی کے لئے مخصوص تھے۔
نانبائی سرخ اور خستہ بسکٹ نکال کر اس کی جھولی میں عجب چابکدستی سے پھینک دیا کرتا۔
"دیکھو! یہ خیال رہے، کہیں آقا کے دام میں گرفتار نہ ہو جانا" ہم ہمیشہ اُسے اس خطرے سے آگاہ کرتے رہتے۔
اس پر وہ دلکش ہنسی ہنستی ہوئی یہ جواب دیتی "خدا حافظ میرے ننھے قیدیو" ——— اور یہ کہتے ہی وہ ہماری نظروں سے غائب ہو جایا کرتی تھی۔
اس کی روانگی کے بعد ہم دیر تک اس کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ——— ہمارے خیالات ہمیشہ یکساں ہوتے اس لئے کہ وہ ہم اور ہمارے گرد و نواح کی اشیا ہمیشہ وہی ہوتیں۔

اُس انسان کے لئے زندگی ایک عذاب ہے جس کا ماحول غیر متغیر ہو۔ جتنا عرصہ وہ اس ماحول میں بسر کرے گا اسی قدر اس فضا کا سکون اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا جائیگا۔

ہم صنفِ نازک کے متعلق ایسے الفاظ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات وہ گفتگو ناگوارِ خاطر ہو جایا کرتی تھی ——— اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ ہمارے خیالات عورتوں کے متعلق اس قدر بُرے تھے۔ بلکہ وہ صنف جس کے متعلق ہم اظہارِ خیال کیا کرتے عورت کہلانے کی مستحق ہی نہیں مگر ٹینیا کی شان میں ہمارے منہ سے کبھی کوئی گستاخانہ کلمہ نکلنے نہ پاتا ——— شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ہمارے پاس بہت کم عرصہ ٹھہرتی تھی۔ ——— وہ آسمان سے ٹوٹتے ہوئے ستارے کی طرح روشنی دکھا کر ہماری نظروں سے پھر اوجھل ہو جایا کرتی تھی۔ اور یا اس کی وجہ اس کا حسن ہو۔ کیونکہ ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی۔ گو زنداں جیسی مشقت نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا مگر پھر بھی ہم انسان تھے ——— اور بنی نوعِ انسان کی طرح ہم بھی کسی نہ کسی کی پرستش کئے زندہ نہ رہ سکتے تھے۔

ہمارے لئے اس کی ذات سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور شے نہ تھی اس لئے کہ بیسیوں انسانوں میں سے جو اس عمارت میں رہتے ایک صرف وہی تھی جو ہماری پروا کیا کرتی تھی ——— سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔

ہر روز اس کے لئے بسکٹ مہیا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے ——— یہ ایک نذرانہ ہوتا جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربانگاہ پر پیش کیا کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مقدس فرض ہو گئی جس کے ساتھ ہمارا اور اس کا رشتہ بھی باہم مضبوط ہو گیا بسکٹوں کے نذرانے کے علاوہ ہم ٹینیا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے ——— یہی کہ وہ اس سردی میں گرم کپڑے کا استعمال کیا کرے اور سیڑھیوں پر سے احتیاط کے ساتھ اترا کرے۔ ہماری ان نصیحتوں کو وہ مسکراتی ہوئی سنا کرتی اور ان پر کبھی عمل نہ کرتی ——— اس کا یہ طرزِ عمل ہمیں کبھی ناگوار معلوم نہ ہوتا کیونکہ نصیحتوں کے پسِ پردہ ہماری صرف یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس بات سے باخبر ہو جائے کہ ہم اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

بعض اوقات وہ ہمیں کوئی کام کرنے کے لئے کہتی جسے ہم بصد خوشی ——— نہیں بلکہ ایک فخر کے ساتھ کرتے لیکن جب ایک دفعہ ہمارے رفیق نے اُسے اپنی قمیص دے کر پیوند لگانے کو کہا تو اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا "کیا ایسی فضول کام رہ گیا ہے میرے لئے ؟ مجھے اور بہت سے کام کرنے ہیں۔"

ہم اپنے بیوقوف ساتھی کی اس حرکت پر خوب ہنسے اور پھر اس نے کبھی کوئی کام کرنے کو نہ کہا ہمیں اس سے محبت تھی ——— اگر محبت کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ تمام جذبات اسی لفظ میں نہاں ہیں۔

انسان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے کہ وہ کسی کو اپنی محبت کا مرکز بنائے، خواہ اس کا محبوب اس کی محبت کے بوجھ تلے پس ہی کیوں نہ جائے۔ ہم اگر ٹینیا سے محبت کرتے تھے تو بہ مجبوری۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی اور شے موجود نہ تھی جس سے ہم اپنا دل لگاتے۔ کبھی کبھی ہم میں سے کسی شخص کو یہ خیال آتا کہ ہم سب اس لڑکی کے متعلق بے فائدہ سرگردانی کیوں کر رہے ہیں؟ اس چھوکری کی محبت آخر ہمیں کیا دے گی؟

اس شخص کی جو ٹینیا کی شان میں ایسے گستاخانہ کلمات کہنے کی جرأت کرتا بہت بری حالت کی جاتی۔

ہم چاہتے تھے کہ کسی شے سے محبت کریں اور اب چونکہ ہمیں وہ چیز جسے ہم ڈھونڈتے تھے مل گئی تھی اس لئے الفت کرتے اور وہ چیز جسے ہم چھبیس اشخاص محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لازم تھا کہ دوسرے اس کا احترام کریں۔ اس لئے کہ وہ ہماری مقدس عبادت کا مرکز تھی اور اگر کوئی شخص ہمارے نظریہ کے خلاف چلتا تو وہ ہمارا دشمن تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ اکثر اس چیز سے محبت کرتے ہیں جو حقیقت میں محبت کئے جانے کے قابل نہیں ہوتی۔ مگر یہاں ہم چھبیس شخص ایک ہی کشتی میں سوار تھے، اس لئے ہم چاہتے تھے کہ اس چیز کو جسے ہم پیار کرتے ہیں، دوسرے مقدس خیال کریں۔

بسکٹ کے کارخانے کے علاوہ ہمارا آقا ایک کیک بنانے والی فیکٹری کا بھی مالک تھا جو اسی مکان میں واقع تھی۔ ہماری تیرہ نما کوٹھڑی اور اس کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔

اس فیکٹری کے ملازم اپنے کام کو ہمارے کام سے اعلیٰ اور صفا خیال کرتے ہوئے ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہمارے ساتھ بہت کم ملنے کی زحمت گوارا کرتے بلکہ جب کبھی انہیں صحن میں ہمارے ساتھ دوچار ہونے کا اتفاق ہوتا تو وہ ہمیں دیکھ کر منہ چڑھایا کرتے تھے۔

ہمیں ان کے کارخانے میں جانے کی اجازت نہ تھی صرف اس لئے کہ ہمارے آقا کو شبہ تھا کہ ہم وہاں سے مکھن کے کیک چرا لیں گے۔ ہمیں بھی ان سے نفرت تھی، رشک تھا اس لئے کہ ان کا کام نسبتہً کم اور مزدوری کہیں زیادہ تھی۔ ان کے لئے خورد و نوش کا سامان ہم سے نہایت اچھا تھا، ان کے کام کرنے کی جگہ روشن اور صاف اور وہ ہمارے برعکس تندرست اور صاف ستھرے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہم سب زرد اور نحیف تھے۔ ہم میں سے تین دائم المرض اور دیاتی تپ دق ایسے لرزہ خیز مرض میں مبتلا تھے۔ ایک بیچارہ تو نقرس کی وجہ سے قریب قریب اپاہج ہو رہا تھا۔

تعطیل کے دنوں میں وہ خوبصورت لباس اور روشن کئے ہوئے بوٹ پہن کر باغ میں چہل قدمی کے لئے جاتے ——— اور ہم چیتھڑے لٹکائے، پھٹے ہوئے بوٹ پہنے باغ کی جانب جاتے مگر پولیس ہمیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتی۔ ان حالات کی موجودگی میں یہ کب ممکن ہو سکتا تھا کہ ہم ان کیک بنانے والوں کو محبت کی نظروں سے دیکھتے۔

چند روز ہوئے ہم نے یہ افواہ سنی کہ ان کا منتظم شراب نوشی کی وجہ سے نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک اور شخص کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو کسی زمانے میں سپاہی تھا۔

اس سپاہی کے متعلق روایت تھی کہ وہ شوخ رنگ کی واسکٹ پہنے' ایک بڑی سی سنہری زنجیر لٹکائے صحن میں گھوما کرتا ہے۔ ہم اس نے منتظم کو دیکھنے کے بہت شائق تھے اور اس کی ملاقات کی امید میں ہم سب نے باری باری صحن میں چکر کاٹے مگر بے سود ایک روز وہ خود ہی ہمارے کارخانے میں چلا آیا۔

بوٹ کی ٹھوکر سے دروازے کو کھول کر وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا "خدا تمہارے ساتھ ہو! میرے بچو! آداب عرض ہے" بھٹی کا دھواں سیاہ بادلوں کی طرح چکر لگاتا ہوا دروازے سے گزر رہا تھا جہاں سپاہی عجب پُر رعب انداز میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو کمال صفائی سے تاؤ دے رکھا تھا جن کے نیچے سے اس کے زرد دانت ظاہر ہو رہے تھے۔

وہ آج نیلے رنگ کی ایک بھڑکیلی کامدار واسکٹ پہنے ہوئے تھا جس پر سنہری بٹن جا بجا چمک رہے تھے ---- سونے کی وہ زنجیر جس کے متعلق ہم نے سنا تھا بلاشک و شبہ اپنی جگہ موجود تھی۔

یہ سپاہی مضبوط' دراز قد اور خوبصورت تھا۔ اس کی بڑی اور روشن آنکھوں میں تندرستی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ایک کلف شدہ ٹوپی اس کے سر کی زینت تھی اور اس کے پائجامے کے پائنچوں کے نیچے اس کا تازہ روغن کیا ہوا بوٹ چمک رہا تھا۔

ہمارے نانبائی نے اس کی خدمت میں دروازہ بند کرنے کے لئے مودبانہ التجا کی۔ دروازے کو بند کرنے کے بعد اس نے ہم سے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کئے' ہم نے اُن سوالات کا جواب دیتے ہوئے اُسے بتایا کہ ہمارا آقا خون چوسنے والا لٹیرا' غلاموں کا تاجر' انسانی اجناس فروخت کرنے والا گماشتہ اور ایذا رساں انسان ہے۔ ہم نے اُن خیالات کا اظہار بھی کیا جو ہمارے دل میں اپنے آقا کے متعلق تھے مگر ان کا صفحۂ قرطاس پر لانا ناممکن ہے۔

سپاہی اپنے سوالات کا جواب بڑے غور سے سنتا رہا مگر یک لخت جیسے وہ چونک پڑا ہو یوں گویا ہوا "تم لوگوں کے پاس چھوکریاں تو بہت ہوں گی؟"

اس پر ہم میں سے بعض تو ہنس پڑے اور بعض نے افسردہ منہ بنا لئے۔ آخر کار ہم میں سے ایک نے سپاہی پر واضح کر دیا کہ ہمارے گرد و نواح میں چھوکریاں ضرور موجود ہیں ---- کوئی درجن بھر کے قریب۔

اس پر سپاہی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے پوچھا "کیا ان سے دل لگی بھی ہوا کرتی ہے؟"

ہم پھر ہنس پڑے ---- ہم میں سے اکثر اس امر کے خواہشمند تھے کہ سپاہی پر واضح کر دیا جائے کہ وہ چھوکریاں جن کے متعلق وہ اس قسم کی گفتگو کر رہا ہے بعینہٖ اسی کی مانند تیز و طرار ہیں ---- مگر یہ بات کہنے کی ہم میں سے کسی کو جرأت نہ تھی لیکن ایک نے تو دبی زبان

سے یہ کہہ ہی دیا۔

"اس حالت میں جس میں ہم ہیں یہ کیونکر . . . ."

"درست ہے! اس حالت میں اس قسم کی تفریح تمہارے لئے ناممکن ہے۔ دراصل تمہیں اپنی موجودہ حالت میں نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں ارا کوئی قصور نہیں، تمہاری قسمت ہی بُری ہے ـــ میرا مطلب سمجھتے ہونا؟ ـــ اور عورتیں، تم جانتے ہو اس مرد کو پسند کرتی ہیں جو ح دار، جوان اور خوبصورت ہو۔ اس کے علاوہ وہ مرد میں طاقت اور قوت کی بھی عزت کرتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے آستین چڑھا کر بازو کو کہنی تک برہنہ کرتے ہوئے کہا۔ اس بازو کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ بازو مضبوط سفید تھا جس پر سنہری بال چمک رہے تھے۔

پھر اُس نے کہا "ٹانگیں اور چھاتی بھی ایسی ہی مضبوط ہے ـــ گوشت سے بھری ہوئی۔ اب طاقت کے علاوہ مرد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ بہترین لباس زیب تن کرے۔ میری طرف دیکھو۔ تمام عورتیں مجھ سے محبت کرتی ہیں حالانکہ میں نے ان کے بارے میں کبھی کوشش نہیں ـــ ایسی مدہوش ہیں؟" یہ کہہ کر وہ ایک ٹوکری پر بیٹھ گیا اور ہمیں سنانا شروع کیا کہ عورتیں اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ اس کا کس قسم کا سلوک ہوتا ہے۔

اس کی روانگی کے بعد ہم عرصہ دراز تک خاموش رہے اور اس عرصہ میں اس کے افسانہائے عشق کے متعلق دل میں سوچتے رہے۔

اس خاموشی کے بعد دفعتہً ہم گفتگو میں مشغول ہو گئے جس میں اتفاق آرا سے سپاہی کو خوش خلق قرار دیا۔

سپاہی حلیم اور خوش طبع تھا۔ اس نے ہم سے اس طرح گفتگو کی۔ گویا وہ ہمیں میں سے ہے ـــ ہمارے پاس آج تک کوئی ایسا شخص نہ آیا تھا جس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی دوستانہ گفتگو کی ہو۔

ہم عرصے تک اس کی ان تازہ کامیابیوں کے متعلق ذکر کرتے رہے جو اُسے فیکٹری کی لڑکیوں کی محبت جیتنے میں حاصل ہوئی تھیں ـــ لڑکیوں کی محبت جو ہماری طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتیں جیسے انہیں ہم سے کوئی غرض ہی نہیں اور جن کو ہم للچائی للچائی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور وہ صحن میں مختلف قسم کے خوبصورت لباس پہن کر گزر رہی ہوتیں۔

نانبائی نے دفعتہً دلگیر آواز میں کہا "ٹینیا کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے کہیں وہ سپاہی کی گرفت میں نہ آجائے؟"

ان الفاظ نے ہم پر بہت اثر کیا اس لئے ہم خاموش رہے۔

ٹینیا کا خیال ہمارے دماغوں سے تقریباً محو ہو چکا تھا یعنی سپاہی کے خوبصورت اور مضبوط جسم نے اُسے ہماری آنکھوں سے کچھ عرصے کے لئے اوجھل کر دیا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ ہم میں سے بعض کو یقین تھا کہ ٹینیا معمولی سپاہی کی خاطر اپنی عصمت کو ہاتھ سے جانے نہ دے گی۔ مگر بعض کا یہ خیال تھا کہ وہ سپاہی کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

ہم میں سے بعض نے رائے دی کہ اگر سپاہی اپنی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے تو اس کی پسلیاں نکال ڈالی جائیں۔ اس بحث کے اختتام پر فیصلہ ہوا کہ ہم سب ٹینیا کی حفاظت کریں اور اُسے آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیں۔

ایک ماہ گزر گیا۔

سپاہی حسب معمول اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس دوران میں وہ ہمارے کارخانے میں کئی دفعہ آیا مگر ہم کو کبھی لڑکیوں پر فتح پانے کے قصوں کے متعلق کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔

ٹینیا بھی ہر روز صبح کے وقت اپنے بسکٹوں کی خاطر آتی۔ اس کا رویہ حسب دستور ویسا ہی دوستانہ تھا۔ ہم نے اُسے سپاہی کے متعلق آگاہ کرنا چاہا مگر ان پھبتیوں سے جو وہ اُس پر اڑاتی ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ اس کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔

ہمیں اپنی ننھی دوشیزہ ٹینیا پر ناز ہوتا جب ہم ہر روز سپاہی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی لڑکی دیکھتے۔ ٹینیا کے اس باوقار رویے نے ہمارے حوصلوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ اب ہم اُس کی عصمت کے نگاہبان سپاہی کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس کے برعکس ٹینیا کی محبت و عظمت ہمارے دلوں میں روز بروز بڑھتی گئی۔

ایک روز سپاہی شراب سے مخمور ہنستا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ جب ہم نے اس کے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا۔ "وہ دیکھو کریا! مجھ پر آپس میں لڑ رہی تھیں —— انھوں نے ایک دوسری کو سخت ذلیل کیا —— ہا ہا ہا! —— ایک دوسری کے بال پکڑ کر زمین پر گر پڑیں —— ہا ہا ہا! —— اور دیوانی بلیوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا —— اور میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ عورتیں صاف لڑائی کیوں نہیں لڑتیں۔ نوچنے سے فائدہ؟"

وہ بنچ پر بیٹھا ہوا نہایت تندرست اور صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ ہم خاموش تھے اس لئے کہ اس کی آمد ہمیں ناگوار گزر رہی تھی۔

"میں اس معمے کو حل کرنے سے قاصر ہوں۔ خدا جانے عورتیں مجھ پر کیوں فریفتہ ہیں —— بس آنکھ جھپکنے کی دیر ہے ——"

یہ کہتے وقت سپاہی اپنے سفید بازوؤں کو ہوا میں حرکت دے رہا تھا اور ہماری طرف دوستانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ہمارے رفیق نانبائی نے غصہ کی وجہ سے آہنی سلاخ کو بھٹی میں تیزی سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "ننھے ننھے پودوں کو اکھاڑنا کوئی جوانمردی نہیں۔ مزا تو جب ہے کہ کسی مضبوط درخت کو گرایا جائے۔"

سپاہی نے دریافت کیا۔ "تم مجھ سے مخاطب ہو کیا؟"

"ہاں، تمھیں سے مخاطب ہوں۔"

"اس سے تمھارا مطلب؟"

"کچھ بھی نہیں —— کچھ بھی نہیں!"

"مظہرو! مظہرو! وہ کونسا مضبوط درخت ہے جس کا تم ذکر کررہے تھے؟"

نابینائی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور بھٹی سے پکے ہوئے بسکٹ نکالنے میں مشغول رہا۔ اس سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ سپاہی اور اس کی گفتگو کو بالکل بھول چکا ہے۔ مگر سپاہی بہت بے چین ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھٹی کے قریب آیا اور بولا "کہو تو ——— کس عورت کا ذکر کررہے تھے؟ ——— تم نے میری ہتک کی ہے۔ کوئی عورت مجھ پر غالب نہیں آسکتی ———"

اس کی گفتگو سے معلوم ہورہا تھا کہ وہ نابینائی کے اس جملے سے سخت ناراض ہوگیا ہو غالباً اُس کو یہی بات پر فخر تھا کہ اس میں عورتوں کو مسحور کرنے کا وصف بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ورنہ درحقیقت سوائے اس وصف کے اس شخص میں زندگی کے متعلق کوئی چیز بھی موجود نہ تھی اسی ایک رہے سہے وصف کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو زندہ انسان کہلانے کا مستحق ہوسکتا تھا۔ دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں جو بیماری کو خواہ وہ روحانی ہو یا بدنی، زندگی کا ایک بیش قیمت جزو تصور کرتے ہوئے، اس کی تمام عمر پرورش کرتے رہتے ہیں اور اسی میں اپنی زندگی کا راز سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی زندگی عموماً تکلیف دہ ہوا کرتی ہے، وہ اس پُر از مصائب زندگی کے متعلق دوسروں سے شکایت ضرور کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ اپنے ہمجنسوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراسکیں اور اس طرح وہ انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھیں۔ اگر ایسے افراد سے یہ بیچینی، کرب اور تکلیف چھین لی جائے، ان کے درد کی دوا کردی جائے تو وہ پہلے کی طرح شاداں نہ رہیں گے اس لئے کہ ان کی زندگی کا آخری سہارا اُن سے علیحدہ کردیا گیا ——— اب وہ کھوکھلے برتن کے مانند ہوں گے۔

بعض اوقات کسی انسان کی زندگی اس قدر مفلس اور نادار ہوتی ہے کہ وہ بے مقصد کسی معیوب چیز ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے اور اُسی کے بھروسے زندہ رہنا چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ اکثر، لوگ صرف دماغی بیکاری کی وجہ سے گناہ کی طرف راغب ہوجاتے ہیں۔

سپاہی سخت ناراض ہوگیا تھا۔ وہ نابینائی کی طرف لپکا اور درشت لہجہ میں بولا "میں جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ بولو ——— کس لڑکی کا ذکر کررہے ہو؟"

نابینائی نے سپاہی کی طرف اچانک مڑتے ہوئے کہا "کہوں پھر؟"

"ہاں! ہاں!"

"کیا تم ٹینیا کو جانتے ہو؟"

"کیوں؟"

"بس وہی لڑکی ہے ——— اُسے قابو میں لانے کی کوشش کرو۔"

"میں؟"

"ہاں! ہاں! تم"

"یہ تو بالکل معمولی بات ہے"

"ہم بھی دیکھیں کیسے؟"

"تو پھر دیکھ لو گے ——— ہا ہا ———"

"وہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے"

"صرف ایک ماہ کی مہلت چاہتا ہوں"۔

"یہ شیخ چلی مت بنو میاں سپاہی!"

"اچھا چودہ روز سہی ——— اس کے بعد تم دیکھ لینا ——— کیا نام لیا تھا؟ ——— ٹینیا ———"

"اب جاؤ! تم کام میں حارج ہو رہے ہو"۔

"صرف چودہ روز، اور وہ میرے قابو میں ہوگی ——— تمہاری قسمت!!"

"میں کہتا ہوں یہاں سے دور ہو جاؤ!"

یہ کہہ کر نانبائی وحشیوں کی طرح غضبناک ہوگیا۔ اس حالت کو دیکھ کر سپاہی سخت حیران ہوا اور خاموشی سے یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ "بہت اچھا"۔

اس بحث کے دوران میں ہم سب خاموش رہے۔ اس لئے کہ ہم ان کی باہم گفتگو کو بہت غور سے سن رہے تھے لیکن جونہی سپاہی رخصت ہوا۔ ہمارے درمیان گفتگو کا ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ ہم میں سے ایک نے چلا کر نانبائی سے کہا:۔

"تمہیں یہ کیا شرارت سوجھی ہے؟"

نانبائی نے تندی سے جواب دیا۔ "کام کئے جاؤ اپنا ——— سنا ہے یا نہیں؟"

ہمیں دراصل اس امر کی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ چونکہ سپاہی اپنے الفاظ کو پورا کرنے کی کوشش ضرور کرے گا، اس لئے لازم طور پہ ٹینیا کی عصمت خطرے میں ہے۔

مگر باوجود اس کے ہم اس بحث کا نتیجہ دیکھنے کے لئے سخت بیقرار تھے ——— اس بحث کا نتیجہ جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہ تھی۔ "کیا ٹینیا سپاہی کے مقابلے کی تاب لا سکے گی؟" اس سوال پر ہم سب یک زبان چلا اُٹھے جیسے ہمیں اس پر پوری طرح بھروسا ہو۔ "ہمّی ٹینیا ضرور ثابت قدم رہے گی"۔

ہمیں اپنے ننھے دیوتا کی ثابت قدمی اور استقلال کا امتحان لینے کی عرصہ سے خواہش تھی لیکن اب ہم الجھ میں یہ ثابت کرنے کی

کوشش کرتے کہ ٹینیا اس امتحان میں ضرور سرخرو ہوگی۔

اس دن سے ہماری زندگی عجیب قسم کی ہوگئی جس سے ہم بالکل ناآشنا تھے آپس میں ایسی بحث کرتے رہتے جیسے ہم پہلے سے زیادہ عقلمند اور ذی فہم بن گئے ہوں اور ہماری گفتگو کچھ معنی رکھتی ہو۔

اب ہمیں معلوم ہورہا تھا کہ ہم شیطان کے ساتھ بازی لگارہے ہیں اور ٹینیا ہماری طرف سے داؤ ہے۔

جب ہم نے کیک بنانے والے نانبائی سے یہ خبر سنی کہ سپاہی نے ٹینیا کا پیچھا کرنا شروع کردیا ہے تو ہمیں سخت رنج پہنچا اور ہم اس رنج کو مٹانے کے لئے اس قدر محو تھے کہ ہمیں معلوم تک نہ ہوا کہ آقا نے ہماری بے چینی اور اضطراب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدے میں تیس سیر کا اضافہ کردیا ہے۔

اس اضطراب کے دوران میں ٹینیا کا نام ہر وقت ہمارے وردِ زبان ہوتا اور ہم ہر روز صبح کے وقت غیر معمولی بے صبری کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتے۔

گو وہ ہر روز ہمارے پاس آتی مگر ہم نے سپاہی والی تکرار کا اس کے ساتھ ذکر تک نہ کیا اور نہ اس سے کسی قسم کے سوالات کئے۔ بلکہ حسبِ معمول جذبۂ الفت سے ملتے رہے۔ مگر اب اس جذبۂ الفت میں کسی نئی چیز کی جھلک تھی ــــ تیز تجسس کی جھلک ــــ فولاد کے پھل کی مانند تیز اور سرد۔

نانبائی نے صبح کے وقت اپنا کام شروع کرتے ہوئے کہا " دوستو! میعاد آج کے روز پوری ہوجائے گی"۔

ہمیں اس سے پیشتر ہی اس امر کا علم تھا مگر پھر بھی یہ سن کر ہم سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔

نانبائی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " وہ ابھی ابھی آئے گی ذرا غور سے دیکھنا اُسے!"

ہم میں سے ایک نے پُرسوز لہجہ میں کہا " جیسے اُس کی آنکھیں کچھ بتا سکیں گی؟"

اس پر بحث چھڑ پڑی۔ آج کے روز ہمیں معلوم ہوجانے والا تھا کہ وہ برتن جس میں ہم سب اپنے دل رکھے ہوئے تھے۔ کتنا صاف اور بے لوث ہے صرف آج کی صبح ہم کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم کوئی بڑا کھیل کھیل رہے ہوں جس میں ہمیں اپنے معبود کے کھو جانے کا اندیشہ ہو۔

گزشتہ چند دنوں سے ہم سن رہے تھے کہ سپاہی حصولِ مقصد کے لئے ٹینیا کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ہے ٹینیا حسب معمول بسکٹوں کے لئے ہر روز آتی مگر ہم اس سے سپاہی کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کرتے ــــ ہم خود متعجب تھے کہ کیوں؟

آج جنکے روز بھی ہم نے اس کی آواز سنی

" ننھے قیدیو ــــ میں آگئی ہوں . . . . . "

اس پر ہم سب آگے بڑھے اور جب وہ اندر آگئی تو ہم خلافِ معمول اُسے خاموشی سے ملے۔ گو ہماری آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ سلسلۂ کلام کیونکر شروع کریں ——— ہم خاموشی اور حسرت کی تصویر بنے اس کے سامنے کھڑے تھے۔

اس انوکھے اور خلافِ معمول استقبال کو دیکھ کر وہ سخت حیران ہوگئی ——— دفعتہً اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا بےچین و مضطر اور دھیمی آواز میں کہنے لگی "تمہیں آج کیا ہوگیا ہے؟"

نانبائی نے درد انگیز لہجہ میں کہا "تم اپنی سناؤ؟"

"اپنی؟ ——— کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ بھی نہیں! کچھ بھی نہیں!"

"تو جلدی مجھے بسکٹ دو ——— ذرا جلدی کرنا!"

اس سے قبل اُس نے آج تک اتنی پھرتی نہ دکھائی تھی۔

نانبائی نے ٹینیا سے آنکھیں جدا نہ کرتے ہوئے کہا "تم جلدی کیوں کر رہی ہو؟"

اس پر وہ دفعتہً مڑی اور دروازے سے باہر بھاگ گئی۔

نانبائی نے اپنی سلاخ پکڑی اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے دبی زبان میں کہنے لگا "اس کا مطلب ہے ——— کہ وہ اب اس کی ہے ——— آہ! یہ سپاہی ——— حرامزادہ ——— بدمعاش . . . ."

اس پر ہم بھیڑوں کے گلے کی طرح اپنے شانوں کو ہلاتے ہوئے میز کی طرف بڑھے اور خاموشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔

ہم میں سے کسی نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا "لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے . . . ."

نانبائی نے چیختے ہوئے جواب دیا "بس! بس!! اب بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہمیں معلوم تھا کہ نانبائی عقلمند ہے ——— ہم سے کہیں عقلمند۔ اس لئے اس کے چلّانے سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ وہ سپاہی کی فتح اور کامیابی کا اعتراف کر رہا ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے ہم نے اپنے آپ کو اور زیادہ مصیبت زدہ اور بےچین پایا۔

بارہ بجے یعنی دوپہر کے طعام کے وقت سپاہی آیا اور حسبِ معمول خوش و خرم، وہ ہماری نظروں سے نظریں ملا کر دیکھنے لگا اور پر فخر لہجہ میں بولا "معزز دوستو! اگر چاہتے ہو کہ میں تمہیں آج اپنی کامیابی کا نمونہ دکھاؤں تو صحن کے ساتھ والے کمرے میں جا کر کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھو ——— سمجھ گئے!"

سپاہی کے کہنے پر ہم صحن کے ملحقہ کمرے میں چلے گئے اور اپنے چہرے کھڑکیوں کے روزنوں کے ساتھ جا دیئے۔

ہمیں بہت عرصے تک انتظار نہ کرنا پڑا کیونکہ جلد ہی ٹینیا تیز قدم اٹھاتی ہوئی صحن کے گڑھوں کے پاس سے جو کیچڑ اور برف

سے بھرے ہوئے تھے گزری۔ اس کے چند منٹ بعد سپاہی نمودار ہوا اس کا رخ ٹینیا کی طرف تھا۔ بڑے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتا ہوا وہ بھی ٹینیا کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ——— اسی اثنا میں بارش شروع ہوگئی اور ہم بارش کے قطروں کو جو گڑھوں میں گر کر عجیب قسم کا شور پیدا کر رہے تھے، خاموشی سے دیکھنے لگے۔

بارش کی وجہ سے آج کا دن ابتر اداس اور مرطوب تھا۔ مکان کی چھتوں پر برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور زمین کیچڑ سے لت پت ہو رہی تھی۔ بارش سسکیاں لیتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی۔

گو ہمیں اس سردی میں اس طرح کھڑے رہنا ناگوار گزر رہا تھا مگر چونکہ ہم ٹینیا کی بے وفائی پر سخت برانگیختہ تھے کہ اس نے ایک معمولی سپاہی کی خاطر ہم سب کو چھوڑ دیا، اس لئے ہم جلادوں کی سی ہولناک خاموشی سے اس کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑے عرصے کے بعد ٹینیا واپس لوٹی۔ اس کی آنکھیں ——— ہاں اس کی آنکھیں کسی نامعلوم مسرت و انبساط سے چمک رہی تھیں، ہونٹ مسکرا رہے تھے اور جھومتی ہوئی چلی آ رہی تھی جیسے خواب میں ہو۔

ہم اس منظر کو خاموشی سے نہ دیکھ سکے۔ اس لئے دروازے سے نکل کر صحن کی طرف دیوانہ وار بھاگے ہوئے گئے اور اس پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر وہ کانپی اور ٹھہر گئی جیسے وہ کیچڑ میں گڑ گئی ہو۔ ہم سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور بغیر کچھ کہے سنے جی بھر کے لعن طعن کی اور شرمناک سے شرمناک گالیاں سنائیں۔

ہم نے ایسا کرتے وقت اپنی آوازوں کو زیادہ بلند نہ ہونے دیا۔ بلکہ اس موقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتے رہے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے درمیان گھری ہوئی وہ کہیں نہیں جا سکتی اور ہم جتنا عرصہ چاہیں اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ ہم نے اسے مارپیٹ نہ کی!

وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی، ہماری گالیوں کو خاموشی سے سن رہی تھی ——— اور ہم گالیوں اور طعنوں کے ذریعے سے اپنے جلے دل کی آگ اگل رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔ اس کی نیلگوں آنکھیں جو کچھ عرصہ پہلے فرط مسرت سے چمک رہی تھیں اب پھٹی پھٹی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی چھاتی متلاطم تھی اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

ہم اس کے گرد حلقہ بنائے اپنے انتقام کی آگ بجھا رہے تھے۔ اس لئے کہ اس نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔ وہ ہماری تھی چنانچہ ہم نے اس کی خدمت میں اپنے دل پیش کئے ——— گو وہ بھکاری کے ٹکڑے سے زیادہ قیمتی نہ تھے مگر اس نے ان بیش بہا دلوں کو سپاہی کی خاطر ٹھکرا دیا۔

ہم اسے برا بھلا کہہ رہے تھے اور وہ خاموشی سے ——— ——— اس جانور کی طرح جسے شکاریوں نے گھیر لیا ہو پھٹی ہوئی آنکھوں سے سرتاپا ارتعاش، ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس موقع پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے ——— ہم میں سے ایک نے ٹینیا کی آستین پکڑ کر کھینچ لی جس پر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی اور اپنے سر کو ذرا اوپر اٹھا کر بالوں کو سنوارتے اور ہماری طرف گھورتے ہوئے دفعۃً بولی۔ "او نہہ بے ——— جیل کے ذلیل جانور!"

یہ کہہ کر وہ ہمارے پاس سے بغیر کسی جھجک کے گذر گئی جیسے ہم اس کے راستے میں بالکل حائل ہی نہ ہوں ——— اس کی اس لڑی سے ہمیں اس بات کی جرأت نہ رہی کہ اسے روک لیں۔

ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے وہ حقارت آمیز لہجہ میں بولی "کمینے اور ناپاک انسان" یہ کہتے ہوئے وہ ہماری نظروں سے غائب ہو گئی اور ہم صحن میں، کیچڑ اور برف کے تودوں کے درمیان، موسلادھار بارش میں، سورج سے محروم آسمان تلے کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم خاموشی سے اپنے سنگین قفس میں چلے آئے۔ سورج کی جان بخش شعاعیں حسب معمول ہم تک کبھی نہ پہنچیں۔ ——— ٹینیا پھر کبھی نہ آئی۔

(گورکی)

سعادت حسن

سوغات

تم کشمیر گئے تھے،
جو سرزمینِ گل و بلبل ہے،
جو حُسن کی بستی ہے،
جہاں دلکشی بستی ہے ———
وہاں سے، میرے دوست، تم میرے لئے کیا لائے ہو؟
سرزمینِ گل و بلبل سے،
حسن و دلکشی کی بستی سے،
میرے دوست، میں تیرے لئے دل لایا ہوں۔
جو ہمیشہ تیری یاد میں تڑپا کیا!

اسحٰق

بیوی یا بیسوا

کمرے کے اندر آتشدان میں آگ روشن ہے۔ چائے کی میز پر دو آدمیوں کے لئے چائے رکھی ہے۔ کونٹ ڈی سلیور اور اُن کی بیوی ابھی سینما دیکھکر واپس آئے ہیں۔ کونٹ نے اپنا کوٹ اور دستانے اُتار کر میز پر رکھ دیئے ہیں۔ کونٹس نے بھی اپنا کلوک اُتار ڈالا ہے اور متبسم چہرے کے ساتھ کھڑی اپنے تئیں آئینہ میں دیکھ رہی ہے اور ایک ہاتھ سے جس پر جواہرات سے مرصع انگوٹھیاں جگمگا رہی ہیں چند بالوں کو جو اس کی کشادہ اور خوبصورت پیشانی پر بکھرے ہیں سنوار رہی ہے۔ کونٹ چند منٹ تک خوشی سے کونٹس کی طرف دیکھتا رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کسی وجہ سے کہہ نہیں سکتا۔ آخر وہ یوں گویا ہوا:۔

"تم نے آج ایک غیر مرد کے ساتھ بہت بے تکلفی کا اظہار کیا۔ یہ نہایت ہی معیوب تھا اور مجھے بہت ناگوار گزرا۔"

کونٹس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"بیشک! مگر اس میں بُرائی کی کیا بات ہوئی؟"

یہ کہہ کر کونٹس میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور پیالیوں میں چائے ڈالنے میں مصروف ہو گئی۔ کرسی پر کونٹ بیٹھ گیا۔ کونٹ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں مارے شرم کے ڈوبا جاتا تھا۔"

کونٹس نے تیوری چڑھا کر کہا "کیا آپ آج لڑائی کی طرح ڈالنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو کوئی حق ہے کہ آپ میرے کسی فعل پر اس قسم کی نکتہ چینی کریں؟"

کونٹ: "نہیں نہیں۔ میں نکتہ چینی نہیں کر رہا۔ میرا یہ کہنے سے صرف یہ مطلب ہے کہ ایم بیودل کا تمہارے ساتھ اس طرح باتیں کرنا بہت ناپسندیدہ امر تھا اور اگر میرا بس چلتا تو میں اس حرکت کو کبھی گوارا نہ کرتا۔"

کونٹس: "معلوم ہوتا ہے اب آپ کے خیالات میں ہوا تغیر آگیا ہے۔ پہلے تو آپ کو اس بات کی پروا بھی نہ تھی کہ میں کس سے بولتی ہوں یا کس سے نہیں بولتی۔۔۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے ایک سال قبل جب مجھے علم ہوا کہ آپ کے ایک غیر عورت کے ساتھ تعلقات ہیں تو میں نے آپ کو اسی طرح سمجھانے کی کوشش کی جس طرح آج آپ مجھے سمجھا رہے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ غیر شریفانہ طریق ہے۔ اور لوگوں میں آپ کی بدنامی ہوگی اور آپ کی عزت پر حرف آئیگا اور ساتھ ہی میری بھی اس میں بدنامی ہوگی وغیرہ وغیرہ آپ نے مجھے کیا جواب دیا تھا؟ آپ نے فرمایا تھا

کہ مہذب لوگوں کے نزدیک میاں بیوی کا باہم تعلق صرف
تمدنی ہوتا ہے۔ اخلاقی پہلو کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے
سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور یہ کہ دونوں کو ہر وقت کُلی
اختیار حاصل ہے کہ جہاں چاہیں اپنے تعلقات پیدا کر
لیں۔ نہ خاوند کا حق ہے کہ بیوی کے معاملات میں
دخل دے اور نہ بیوی خاوند کے معاملات میں خلل انداز
ہونے کی مجاز ہے۔ آپ کی اس ساری گفتگو کا صاف
مطلب یہ تھا کہ اگر میں کسی جگہ تعلقات پیدا کرنا چاہوں تو کر
سکتی ہوں۔ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ الگ سوال
ہے میں نے اس بات پر عمل کیا یا نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے
کہ اُسی دن سے ہمارے باہمی تعلقات کی نوعیت بالکل
بدل چکی ہے۔ موجودہ کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر ہم ایک
ہی مکان میں رہتے ہیں مگر عملی طور پر ہمارا ایک دوسرے
سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ایک بچہ پیدا ہو جانے
کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ ظاہرداری کو قائم رکھیں مگر جنسی
تعلقات کے لحاظ سے ہم آپس میں بالکل اجنبیوں کی طرح
ہیں۔ آپ کی طرف سے مجھے اجازت ہے کہ میں دوسری
جگہ تعلقات قائم کروں گو تاحال میں نے اس اجازت
سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن اب گذشتہ چند ماہ سے میں
دیکھتی ہوں کہ جب بھی میں کسی سے بات کرتی ہوں آپ
رقابت سے جل جاتے ہیں اور بہت بُرا مانتے ہیں۔ میں
سخت متعجب ہوں کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

کونٹ: "نہیں، نہیں۔ رقابت وغیرہ کا اس میں کوئی سوال
نہیں۔ حاصلِ مطلب یہ ہے کہ تم نوجوان اور ناتجربہ کار ہو
اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو خواہ مخواہ بدنام
ہو جاؤ اور لوگوں کی انگشت نمائی کا نشانہ بنو۔"

کونٹس: "آپ کی باتوں پر مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ آپ
کے قول اور فعل میں کوئی مطابقت نہیں۔ انسان کو چاہئے
کہ ایسی بات دوسروں سے نہ کہے جس پر خود اس کا عمل
نہیں۔"

کونٹ: "دیکھو میری بات کا مذاق نہ اُڑاؤ۔ یہ کوئی ہنسی
مذاق کی بات نہیں بلکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ ایک سچے
اور مخلص دوست اور حقیقی خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے
کہہ رہا ہوں۔ باقی جو باتیں تم میری طرف منسوب کر رہی
ہو کہ میں نے تم سے کہی تھیں ان میں تم بہت کچھ مبالغہ
سے کام لے رہی ہو۔"

کونٹس: "ہرگز نہیں۔ جب آپ نے میرے سامنے میڈم
ڈی سروی کے ساتھ اپنے تعلقات کا اقبال کیا تھا تو
میں نے اسے آپ کی طرف سے اپنے لئے اجازت تصور
کیا تھا کہ میں بھی آپ کی تقلید میں دوسری جگہ
تعلق پیدا کر سکتی ہوں۔ میں نے ابھی تک ایسا کیا نہیں
. . . . . ."

کونٹ: "مہربانی کر کے . . . . . ."

کونٹس: "میری بات قطع نہ کیجئے۔ میں نے ابھی تک آپ
کی تقلید نہیں کی۔ تاحال میرا کسی غیر مرد سے تعلق نہیں
البتہ میں اس جستجو میں ضرور ہوں کہ کوئی مناسب آدمی

مل جائے جس شخص کو میں شرفِ قبولیت دونگی اس کے لئے
ضروری ہے کہ وہ آپ سے زیادہ اچھا ہو اور آپ سے
زیادہ خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہو ظاہر ہے کہ ایسے گوہرِ
مقصود کا دستیاب ہونا ذرا دقت طلب ہے۔ یہ بات میں
آپ کی تعریف میں کہہ رہی ہوں کہ آپ سے اچھے آدمی کا
ملنا دقت طلب ہے۔ مگر افسوس آپ کا چہرہ میری اس تعریف
پر کچھ زیادہ مسرت کا اظہار کرتا نظر نہیں آتا"

کونٹ: "یہ ہنسی مذاق بالکل بے محل ہے"

کونٹس: "میں تو مذاق نہیں کر رہی ہوں بلکہ نہایت سنجیدگی سے
بات کر رہی ہوں۔ آپ کی گذشتہ سال کی گفتگو مجھے لفظ بلفظ
یاد ہے۔ اب میں واقعی فیصلہ کر چکی ہیں کہ خواہ آپ کو
پسند ہو یا نہ ہو جب مجھے کوئی مناسب آدمی مل جائے گا
میں ضرور اس کے ساتھ تعلق پیدا کرلوں گی اور آپ کو
علم تک بھی نہ ہوگا"

کونٹ: "میں حیران ہوں تم اس قسم کی باتیں کیسے زبان پر
لاسکتی ہو۔"

کونٹس: "میں اس قسم کی باتیں کیسے زبان پر لاسکتی ہوں؟
آپ کو یاد نہیں کہ جب میڈم ڈی گارڈ بیچارے بیخبر
ایم ڈی سروی کا مذاق اُڑا رہی تھی تو اس کے مذاق پر
سب سے پہلے ہنسنے والے آپ ہی تھے"

کونٹ: "یہ ٹھیک ہوگا مگر اس قسم کی باتوں کا تمہارے
منہ سے نکلنا بالکل غیر موزون ہے"

کونٹس: "واہ صاحب! واہ! جب بیچارے ایم ڈی سروی
کا معاملہ ہو تب تو آپ خوب ہنستے ہیں مگر جب آپ کا اپنا
معاملہ ہو تو وہی بات آپ کو ناگوار ہوتی ہے۔ مرد بھی کیا
عجیب ہوتے ہیں! خیر اس قسم کی باتیں کرنے کا مجھے کوئی
خاص شوق نہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ
آپ تیار ہو چکے ہیں یا نہیں"

کونٹ: "تیار؟ ---- کس بات کیلئے تیار؟"

کونٹس: "دھوکے میں رہنے والا خاوند ہونے کے لئے۔
جب کوئی آدمی ایسے ذکر پر ناراض ہوتا ہے تو وہ اس قسم
کے دھوکے میں پڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا مگر آپ
یقین جانیں کہ آج کی تاریخ سے ابھی دو ماہ گزرنے نہیں
پائیں گے کہ دھوکے میں رہنے والے خاوندوں کے خیال
کی آپ خود ہنسی اُڑائیں گے اور کبھی باور نہیں کرینگے
کہ کوئی عورت اپنے خاوند کو دھوکا دے سکتی ہے۔ جب
کوئی خاوند فریب خوردہ ہوتا ہے تو اس کی یہی کیفیت
ہوتی ہے۔ یہ ایک شرطیہ علامت ہے"۔

کونٹ: "خدا کی قسم تم تو آج بڑی بداخلاقی دکھا رہی ہو۔ میں
نے پہلے کبھی یہ رنگ تم میں نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں
تمہیں کیا ہوا۔"

کونٹس: "بے شک مجھ میں بڑی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے مگر
اس تبدیلی کی تمام ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے"

کونٹ: "اس طریق کو چھوڑو۔ آؤ سنجیدگی سے بات کریں
میں تم سے بڑی منت اور عاجزی سے کہتا ہوں کہ اس
کے بعد پھر کبھی ایم ہورسل کو اس قسم کی بے تکلفی کی جرأت

سنڈولانا:

کونٹس: "آپ یقیناً رقابت کے جذبے سے مغلوب ہو رہے ہیں ـــــ مجھے یہ پہلے ہی معلوم تھا:"

کونٹ: "نہیں۔ یہ بات ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ میں لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنوں لہٰذا اگر آئندہ میں نے اس شخص کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہاری طرف دیکھتے ہوئے پایا تو میں اس کی بری طرح گوشمالی کروں گا:"

کونٹس: "کیا اس ساری گفتگو سے آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کے دل میں میرے ساتھ از سر نو تعشق کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے؛"

کونٹ: "کیوں نہیں؛"

کونٹس: "بڑی نوازش۔ مگر معاف رکھئے میرے دل میں اب آپ کے لئے کوئی محبت نہیں:"

اس کے بعد کونٹ کرسی سے اٹھکر میز کے گرد گھوم کر کونٹس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اور جلدی سے اس کی گردن پر بوسہ دیا۔ اس پر کونٹس جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی اور پلٹ کر بڑی غضب آلود آنکھوں سے کونٹ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"خبردار! ہمارا آپس میں کوئی تعلق نہیں:"

کونٹ: "خدا کے لئے ناراض نہ ہو۔ تمہاری صورت اسقدر دلربا معلوم ہو رہی ہے کہ میرا دل بے قابو ہو گیا:"

کونٹس: "پھر تو معلوم ہوتا ہے میری شکل میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی ہے؛"

کونٹ: "فی الواقع تم آج غایت درجہ دلربا معلوم ہوتی ہو۔ تمہارے بازو اور تمہارے شانے نہایت ہی خوبصورت ہیں اور تمہارا رنگ . . . . ."

کونٹس: "ایم بیوریل کا دل لبھا سکے گا:"

کونٹ: "کیا لغویت کرتی ہو! فی الواقع تم اس درجہ دلکش ہو کہ میں نے کبھی اس سے پہلے کسی عورت کو ایسا دلکش نہیں پایا:"

کونٹس: "معلوم ہوتا ہے اب یاروں کی آپ پر وہ نظر نہیں رہی۔"

کونٹ: "کیا کہا؛"

کونٹس: "میں کہتی ہوں کہ شاید منظوران نظر نے اب بے اعتنائی اختیار کر لی ہے:"

کونٹ: "ہیں؛ ـــــ کیا مطلب؛"

کونٹس: "مطلب یہی جو میں کہہ رہی ہوں کہ معلوم ہوتا ہے اب ادھر سے جواب مل چکا ہے اور ناچاری کی حالت میں میری طرف التفات کا خیال عود کر آیا ہے:"

کونٹ: "میں حیران ہوں تم نے اس قسم کی باتیں کرنا کہاں سے سیکھ لیا؛"

کونٹس: "آپ نے خود سکھایا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے آپ کے انواع و اقسام کی عورتوں سے تعلقات رہے ہیں۔ مثلاً ایکٹرسوں سے۔ فاحشہ عورتوں سے اور دیگر آزاد خیال عورتوں سے۔ ایسی صورت میں میری طرف نظر عنایت کے معنی سوائے اس کے میں کیا سمجھوں کہ

دوا سے دل بیچنے والوں نے نرخ گراں کردیا ہوگا "

کونٹ : "جو چاہو سمجھو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں دوبارہ تم پر عاشق ہو چکا ہوں اور میرا دل تمہاری محبت میں گداز ہوا جاتا ہے "

کونٹس : "پھر کیا آپ ——— ؟"

کونٹ : "یقیناً"

کونٹس : "آج ؟"

کونٹ : "مارگریٹ! تمہیں کیا ہو گیا ؟"

کونٹس : "لو آپ پھر گھبرا گئے۔ آؤ ذرا اطمینان سے بات کریں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ؛ یہ صحیح ہے کہ میں آپ کی بیوی ہوں مگر میں ——— آزاد ہوں۔ میں دوسری جگہ تعلقات پیدا کرنے والی تھی مگر میں آپ کو ترجیح دینے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ مجھے بھی آپ مساوی معاوضہ ادا کریں "

کونٹ : "میں مطلب نہیں سمجھا۔ یعنی ؟"

کونٹس : "میں کھول کر بیان کرتی ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں میں خوبصورت ہوں ؛ اس حد تک خوبصورت جس حد تک کہ آپ کی دوسری آشنا عورتیں ہیں ؟"

کونٹ : "ہزاروں گنا بڑھ چڑھ کر "

کونٹس : "ان میں سے بہترین سے بھی بہتر ؟"

کونٹ : "بے شک ! ہزاروں گنا بہتر "

کونٹس : "بہت اچھا۔ اب یہ فرمایئے کہ ان میں بہتر سے بہتر پر ایک ماہ کے عرصے میں آپ کا کس قدر خرچ ہوا ہوگا ؟"

کونٹ : "کس قدر خرچ ہوا ہوگا ! ——— کیا مطلب تمہارا ؟"

کونٹس : "میں کہتی ہوں بہترین عورت پر ایک ماہ کے عرصے میں آپ کا زیور، کپڑوں، دعوتوں اور سواری وغیرہ کے تمام مصارف ملاکر کس قدر روپیہ خرچ ہوا ہوگا ؟"

کونٹ : "مجھے کیا معلوم ؟"

کونٹس : "آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ اچھا ہم تخمیناً پانچ ہزار روپیہ فرض کر لیتے ہیں۔ کیا اس کے لگ بھگ خرچ ہوا ہوگا ؟"

کونٹ : "ہاں اس کے لگ بھگ ہوا ہوگا "

کونٹس : "بہت اچھا۔ آپ پانچ ہزار روپیہ مجھے دیں اور میں ایک ماہ کے لئے آپ کی رہی "

کونٹ : "مارگریٹ! کیا تمہارے دماغ میں فتور تو نہیں آگیا ؟"

کونٹس : "اگر آپ کو میری شرط منظور نہیں تو آپ کی مرضی "

یہ کہکر کونٹس اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ کونٹ آکر دروازے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

کونٹ : "آہا! اس کمرے سے کیسی اچھی خوشبو آرہی ہے !"

کونٹس : "سچ ؛ ——— میں تو ہمیشہ لوڈی سپین استعمال کرتی ہوں۔ دوسری کوئی خوشبو مجھے پسند نہیں "

کونٹ : "اچھا! میں نے کبھی خیال نہیں کیا۔ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے "

کونٹس : "ہوگی۔ مگر آپ مہربانی فرماکر تشریف لے جایئے میں اب سو رہی ہوں "

کونٹ : "مارگریٹ"!

کونٹس : "آپ جاتے ہیں یا نہیں ؟"

کونٹ اندر آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے ۔

کونٹس : "آپ نہیں جاتے ؟ بہت اچھا!"

کونٹس چپ چاپ سونے کی تیاری میں لگ جاتی ہے ۔ ابھی وہ لباس بدلنے میں مصروف ہے کہ کونٹ اٹھ کر آگے کو بڑھتا ہے ۔

کونٹس : "مہربانی کرکے آگے نہ بڑھیئے گا ۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا"

کونٹ آگے بڑھ کر کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر کونٹس کو پکڑ لیتا ہے اور بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے ۔ مگر کونٹس جھٹ خوشبو والے پانی کا گلاس جو میز پر پڑا ہے اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارتی ہے ۔ کونٹ ذرا اچھل کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور بڑی برہمی سے کہتا ہے :

"کیسی فضول حرکت ہے !"

کونٹس : ہوا کرے ۔ میں شرط بتا چکی ہوں ۔ پانچ ہزار روپیہ"

کونٹ : "یہ حماقت کی بات ہے"

کونٹس : "حماقت کیوں ؟"

کونٹ : "حماقت کیوں ! بیوی اور قیمت دینا ـــــ ایسی بات کبھی دنیا میں سُنی گئی ہے ؟"

کونٹس : "کیسی تنگ خیالی ہے یہ !"

کونٹ : "تنگ خیالی ہو یا نہ ہو مگر میں اس حماقت کے لئے ہرگز تیار نہیں"

کونٹس : "کیا اس سے بھی بڑھ کر یہ حماقت نہیں کہ گھر میں بیوی کو چھوڑ کر آدمی ادھر اُدھر جھک مارتا پھرے اور فاحشہ عورتوں پر پیسہ برباد کرے ؟"

کونٹ : "کچھ بھی ہو مگر میں دنیا کی نظر میں بیوقوف بننا نہیں چاہتا"

کونٹس اپنے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ کر اپنے موزے اُتارتی ہے جس سے اس کے پاؤں کے گلابی رنگ کے تلوے نظر آنے لگتے ہیں ۔ کونٹ ذرا اور قریب ہو کر کہتا ہے :

"مارگریٹ! تمہیں بھی کیا عجیب خیال سُوجھا!"

کونٹس : "کونسا خیال ؟"

کونٹ : "یہ پانچ ہزار روپیہ کا"

کونٹس : "اس میں عجیب بات کیا ہے ؟ کیا ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی کا حکم نہیں رکھتے ؟ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو مجھ سے عشق ہو گیا ہے ۔ بہت اچھا ۔ لیکن آپ مجھ سے شادی تو نہیں کر سکتے کیونکہ میں آگے ہی آپ کی بیوی ہوں ۔ لہٰذا دوسرا طریق یہی ہے کہ آپ قیمتاً مجھے خرید لیں ۔ آخر دوسری عورتوں کے لئے بھی تو آپ قیمت ادا کرتے ہیں ۔ کیا یہ زیادہ بہتر بات نہیں کہ غیر عورت کو روپیہ دینے کی بجائے انسان اپنی بیوی کو دے جو بہرحال اپنے گھر ہی میں رہے گا علاوہ ازیں اپنی بیوی کو روپیہ دے کر حاصل کرنے میں ایک جذبِ خیال بھی پائی جاتی ہے ۔ جو آپ جیسے سمجھدار آدمی کو پسند آنی چاہئے ۔ مزید برآں یہ بات انسانی

فطرت میں داخل ہے کہ وہ مفت ہاتھ آئی ہوئی چیز کی قدر نہیں کرتا۔ کیا یہ ٹھیک نہیں؟"

اس کے بعد کونٹس گھنٹی کی طرف جاتی ہے اور گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے:

"اچھا جناب! آپ تشریف لے جاتے ہیں یا میں اپنی خادمہ کو بلاؤں؟"

کونٹ حیران اور رنجیدہ خاطر کھڑا ہے اور کچھ سوچ نہیں سکتا کہ کیا جواب دے اور کیا کرے۔ آخر جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بنڈل نکال کر کونٹس کے آگے پھینک دیتا ہے۔

"لو یہ پچاس ہزار روپیہ ہے مگر یاد رکھو ——"

کونٹس نوٹوں کو اٹھا کر گنتی ہے اور گن کر پوچھتی ہے:

"کیا یاد رکھوں؟"

کونٹ: "ہمیشہ روپیہ مانگنے کا دستور نہ بنا لینا!"

کونٹس کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے اور کہتی ہے "پانچ ہزار روپیہ ماہوار ادا کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ کو اپنی ایکٹرسوں کے پاس واپس جانا پڑے گا۔ اور اگر میں آپ کے پسند آئی تو اس سے بھی زیادہ مطالبہ کروں گی"۔

(اوپسال) ——— (مناج)

دوسرے کی لغزش پر بڑا بول بولنے والے کبھی اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال۔

ابھی کل کی بات ہے کہ تیری اکڑی ہوئی گردن خطاکار بھائی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور آج تو خود اس سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہا۔

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیری شعلہ بار زبان کس طرح کٹ گئی اور تیری رعونت سے بھری ہوئی آنکھوں کا نور کس طرح اچک لیا گیا؛

ذرا دیکھ تو سہی، تو بھی ویسا ہی خطاکار ہے جیسے تیرے اور بھائی۔ آہ اپنے دل کی تاریکی میں تجھے کچھ نہیں سوجھتا۔

"ح"

یوئنگ ہال

یہ یوئنگ[1] ہال یہ انوار کا پُرکیف کاشانہ
یہ میخانے کا میخانہ یہ بتخانے کا بت خانہ

تجلی خانہ یہ بانکے سجیلے نوجوانوں کا
امیں عشق و محبت کی سنہری داستانوں کا

یہ وہ میخانہ ہے جس میں خودی کی شمع جلتی ہے
شرابِ زندگی عشرت کے پیمانے میں ڈھلتی ہے

شبِ مہ جب تبسم ریز ہوتی ہے زمانے پر
دیا کرتا ہے بوسے آسماں اس آستانے پر

بھٹک جاتا ہے جب راتوں کو حسنِ لازوال اس کا
ستارے کانپتے ہیں دیکھ کر جاہ و جلال اس کا

اُمڈ کر بجلیوں کے ساتھ جب برسات آتی ہے
یہاں جھالوں میں برکھا راگنی ساون کی گاتی ہے

یہ ہے کاشانہ حسن و دلبری کے شاہزادوں کا
یہاں رہتا ہے مجمع پریم پیاسے نامرادوں کا

یہاں پڑتی ہے اکثر چوٹ دل کے آبگینوں پر
یہاں بھرتے ہیں آہو چوکڑی دن رات زینوں پر

ہوا میں کھڑکیوں کے سرخ پردے اُڑ کے کہتے ہیں
یہ خونخواروں کی دُنیا ہے یہاں خونخوار رہتے ہیں

یہ ہے تیرتھ رتوں کی مدبھری نیچی نگاہوں کا
یہاں چڑھتا ہے نذرانہ قیامت خیز آہوں کا

یہاں ڈھلتا ہے دردِ زندگی اُلفت کے سانچوں میں
یہاں ملتی ہے راحت غم کی ٹھنڈی ٹھنڈی آنچوں میں

یہاں برسات کا موسم ہو یا موسم ہو جاڑے کا
نظر کے سامنے منظر ہے اندر کے اکھاڑے کا

---

[1] لاہور کا ایک مشہور بورڈنگ ہاؤس

یہاں کی صبح کو صبحِ بنارس برملا کہئے
یہاں کی شام کو شامِ اودھ کا آئینہ کہئے

وہ اُٹھنا نازپروردوں کا سو کر نُور کے تڑکے
وہ اکثر مُسکرا کر بھُول جانا رات کے دکھڑے

دبا کر داتنوں کو مُنہ میں وہ اشنان کو جانا
وہ ہر کا جاپ کرنے کے بجائے "دردِ دل" گانا

وہ محویت وہ اِک وارفتگی بننے سنورنے میں
وہ مُنہ سے پھُول جھڑنا مُسکرا کر بات کرنے میں

کیا کرتا ہے کسبِ نُور سورج انکے درشن سے
اُجالا چار سُو ہوتا ہے ان کے سانولے پن سے

نگاہوں سے چلائیں تیر اگر یہ تُند خو ہو کر
گرے لے رجن کے ہاتھوں سے کماں بے آبرو ہو کر

کہیں جو گنگنانے کی صدا آتی ہے کانوں میں
تو رادھے شیام کی بنسی کی لَے اُڑتی ہے تانوں میں

سرِ شام ان دریچوں میں دیے یُوں جھلملاتے ہیں
برہمن جس طرح بُتخانے میں چندن جلاتے ہیں

سیاہی شام کی جب ڈھانپتی ہے لالہ زاروں کو
سجاتے ہیں پُجاری کبر کے اپنے دواروں کو

ہر ہوتی ہے پیدا رش ان پہندیا کے ہیولونکی
اُدھر سیجیں بچھا دیتا ہے چندا زرد پھُولوں کی

یہاں کے رہنے والے دل کی کشتی کے کھویا ہیں
اگر گوکل کا بن اِس کو کہیں تو یہ کنھیا ہیں

(سراج الدین ظفر)

صنوبر

دُور گھنے جنگل میں جہاں سورج کی گرمی اور تازہ ہوا نے مل کر عیش و آرام کی ایک شیریں جگہ بنا دی تھی، صنوبر کا ایک چھوٹا سا خوبصورت پودا اُگا تھا۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرح بہت لمبا ہونا چاہتا تھا۔ صنوبر اور شمشاد کے بڑے بڑے درختوں کی طرح جو اس کے اِرد گرد بلند ہو رہے تھے۔

سورج چمکتا، لطیف ہوا اس کے پتوں کو پھڑپھڑاتی چھوٹے چھوٹے دیہاتی بچے مسرت سے چہ میگوئیاں کرتے ہوئے پاس سے گزر جاتے لیکن صنوبر کے پودے کو ان کی پروا نہ ہوتی۔ بعض وقت بچے رس بھری یا جنگلی بیروں کی ایک بڑی سی ٹوکری لا کر پیال پر پھیلا دیتے اور صنوبر کے درخت کے پاس بیٹھ کر کہتے "کیسا چھوٹا سا خوبصورت درخت ہے" یہ بات اُسے پہلے سے بھی زیادہ ناخوش بنا دیتی — تاہم اس تمام عرصہ میں درخت کا ایک ایک بڑا سا ڈال ہر سال بنتا ہی گیا۔ صنوبر کے درخت کے تنے میں ڈالوں کو گِن کر آسانی سے اس کی عمر کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ لیکن بڑھتے رہنے کے باوجود وہ شاکی تھا "آہ مجھے کس قدر تمنا ہے کہ میں اتنا لمبا ہوتا جتنے لمبے دوسرے درخت ہیں۔ میں اپنی شاخوں کو ہر طرف پھیلا دیتا۔ میری چوٹی وسیع و فراخ دُنیا کو بلندی پر سے دیکھا کرتی۔ میری شاخوں پر پرندے اپنے گھونسلے بناتے اور جب ہوا چلتی میں اپنے رفیع الشان ساتھیوں کی طرح ایک باوقار شوکت کے ساتھ جھک جھک جاتا"۔

درخت اس قدر ناخوش تھا کہ وہ سُورج کی تابانی سے یا پرندوں سے یا بادل کے گلابی ٹکڑوں سے جو صبح و شام اس کے اُوپر تیرتے رہتے کبھی لطف نہ اُٹھاتا تھا۔

کبھی کبھی سردیوں میں جب زمین پر سفید چمکتی ہوئی برف جمی ہوتی ایک کودتا پھاندتا خرگوش آتا اور سیدھا چھوٹے درخت کے اُوپر سے پھلانگ جاتا۔ اس وقت درخت بے انتہا رنج محسوس کرتا۔

دوسرا گذر گئے اور تیسرا آ پہنچا۔ درخت اس قدر لمبا ہو گیا کہ خرگوش اُس کے اِرد گرد ہی دوڑنے پر مجبور رہتے۔ پھر بھی یہ غیر مطمئن رہا اور چلّانے لگا۔

"کاش! میں کسی طرح اُونچا اور بڑا ہو جاتا۔ آہ! دُنیا میں اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟"

موسم خزاں میں لکڑہارے حسبِ معمول آئے اور انھوں نے بے شمار بڑے بڑے درخت کاٹ ڈالے۔ جب بلند قامت درخت ایک چرچراہٹ کے ساتھ زمین پر گر پڑتے تو نوجوان صنوبر جو اب اپنی پوری بلندی پر تھا۔ تھرّا اُٹھتا — کٹے ہوئے درختوں

کی شاخیں چھید ڈالی گئیں۔ تنے اس قدر سادہ اور عریاں دکھائی دینے لگے کہ وہ مشکل سے پہچانے جا سکتے تھے۔ پھر وہ چھکڑوں پر دھر لئے گئے اور گھوڑے انہیں کھینچ کر جنگل سے باہر لے گئے۔

"یہ کہاں جا رہے ہیں؟ وہاں پر کیا گزرے گی؟" نوخیز صنوبر کو یہ جاننے کی بے انتہا خواہش تھی۔ چنانچہ موسم بہار میں جب ابابیلیں اور سارس آئے۔ اس نے پوچھا "تم جانتے ہو وہ درخت کہاں پہنچائے گئے؟ کیا تم اُن سے ملے تھے؟" ابابیلیں کچھ نہ جانتی تھیں لیکن سارس نے تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد کہا: "ہاں میرا خیال ہے میں جانتا ہوں۔ جب میں نے مصر سے پرواز کی تو مجھے بہت سے نئے جہاز ملے۔ جن کے مستول نہایت عمدہ اور صنوبر کی طرح خوشبودار تھے۔ میرا خیال ہے یقیناً وہی درخت تھے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں وہ شاندار تھے بہت شاندار!"

"اُف مجھے سمندر پر جانے کے لئے کافی لمبا ہونے کی کتنی تمنا ہے۔ یہ سمندر کیسا ہے؟ اور کس طرح کا نظر آتا ہے؟"

سارس یہ کہہ کر تیزی سے اُڑ گیا کہ "اس کے بیان کرنے میں بہت زیادہ وقت لگے گا"

سورج کی کرن نے کہا: "اپنی جوانی میں مسرور رہو! اپنے سرسبز نشوونما اور نوخیز زندگی کی مسرت میں باغ باغ ہو جا!! جو تجھے حاصل ہے"۔ ہوا نے درخت کو چوم لیا۔ شبنم نے اُسے آنسوؤں سے بھگو دیا۔ لیکن صنوبر کے درخت نے اُن سے محبت نہ کی۔

کرسمس کے دن نزدیک آ گئے اور بہت سے سرسبز درخت کاٹ ڈالے گئے۔ صنوبر کا درخت جو اپنا صحرائی گھر چھوڑنے کے جنون میں عافیت کی قدر بھول گیا تھا دیکھتا کہ اس کے مقابلے میں بعض بہت چھوٹے اور نوعمر درخت بھی کاٹ لئے گئے ہیں۔ یہ سرسبز درخت جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے چن چن کر کاٹے گئے تھے شاخوں سمیت چھکڑوں پر لاد دیئے گئے اور گھوڑے انہیں کھینچ کر جنگل سے باہر لے گئے۔

صنوبر کا درخت بولا "وہ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ مجھ سے زیادہ بڑے نہیں ہیں۔ یقیناً ایک بہت چھوٹا تھا اور ان کی شاخیں کیوں نہ کاٹی گئیں؟ وہ کہاں جا رہے ہیں؟"

چڑیاں گانے لگیں:۔ "ہم جانتی ہیں۔ ہم جانتی ہیں۔ ہم نے قصبے کے گھروں کی کھڑکیوں میں سے دیکھا ہے اور ہم جانتی ہیں اُن کا کیا ہوا ہے۔ وہ بہت شاندار طریقے سے سجائے گئے ہیں۔ ہم نے اُنہیں ایک معتدل کمرے کے درمیان ہر قسم کی خوبصورت چیزوں سے مزین کھڑے دیکھا ہے۔ شہد۔ کیک۔ چمکدار سیب کھلونوں اور سینکڑوں موم بتیوں کے ساتھ"۔ اس پر صنوبر کا درخت اپنی تمام شاخوں میں کانپتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا ہوتا ہے"؟

چڑیاں بولیں:۔ "ہم نے اور کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن ہمارے لئے یہی کافی تھا"

صنوبر کا درخت سوچنے لگا "خدا جانے ایسا دلفریب واقعہ کبھی میرے ساتھ بھی پیش آئے گا یا نہیں؟ سمندر عبور کرنے سے یہ زیادہ بہتر رہے گا۔ میں تو اس کا نہایت درد بھرے دل سے آرزومند ہوں ــــ آہ کرسمس کب آئے گا! میں اب اتنا ہی لمبا ہوگیا ہوں اور اونچا ہوگیا ہوں جتنے وہ درخت جو پچھلے سال لے لئے گئے تھے۔ اوہو! اب میں چھکڑے پر لادا جاؤں گا! تمام شان و شوکت سے سج کر معتدل کمرے کے درمیان کھڑا ہوؤں گا! اس کے بعد ضرور کوئی بہتر اور زیادہ حسین واقعہ پیش آئے گا۔ ورنہ درخت اس قدر آراستہ نہ کئے جاتے ــــ ہاں تو اس کے بعد وہ مزید جاہ و جلال اور مزید درخشانی کیا ہوگی! اسے کیا خیال کیا جائے! میں آرزو میں کرکے تھک گیا ہوں۔ خدا جانے یہ راز کس طرح معلوم ہوسکتا ہے!"

سورج کی روشنی اور ہوا نے کہا:۔ "ہمارے ساتھ مل کر لطف اٹھالے۔ تازہ ہوا میں اپنی فروزاں زندگی سے مسرور ہولے" لیکن درخت باوجود روز بروز بڑھتے جانے کے خوش نہ ہوا۔ جاڑے اور گرمیوں میں اس کے گہرے سبز پتے جنگل میں جلوہ بار ہوتے۔ پاس سے گزرنے والے کہتے "کتنا خوبصورت درخت ہے"۔

کرسمس سے تھوڑا عرصہ پیشتر مضطرب صنوبر سب سے پہلے گرایا جانے لگا۔ جونہی کلہاڑا تنے سے پار ہوا اور نسیں الگ الگ ہوگئیں درخت درد اور نقاہت سے متاثر ہو کر ایک آہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا اور اپنا جنگلی گھر چھوڑ دینے کے غم میں اس وقت وہ مسرت کی تمام خواہشوں کو بھول گیا۔ اس نے جان لیا کہ اب وہ اپنے پیارے دیرینہ ساتھیوں یعنی درختوں کو کبھی نہ دیکھے گا۔ نہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں اور رنگارنگ پھولوں ہی کو جو اس کے گرد اُگ رہے تھے دیکھ سکے گا۔ اور شاید پرندوں کو بھی نہیں دیکھے گا ــــ سفر بھی قطعاً خوشگوار نہ تھا۔

جب وہ ایک گھر کے صحن میں اُتارا گیا اس نے اپنے آپ کو بہت سے دوسرے درختوں کے ساتھ پایا۔ اس نے ایک آدمی کو کہتے سنا "ہمیں صرف ایک کی ضرورت ہے اور یہ صنوبر سب سے خوبصورت ہے"۔ بھاری وردی میں ملبوس دو نوکر آئے اور صنوبر کے درخت کو اٹھا کر ایک بڑی سی خوبصورت محلسرا میں لے گئے جس کی دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں اور بڑی انگیٹھی پر شیروں کی تصویروں کے ڈھکنوں والے بڑے بڑے چینی کے ظروف سجے تھے۔ آرام کرسیاں تھیں مخملیں صوفے تھے۔ تصویروں کتابوں اور کھلونوں سے لدی ہوئی بڑی بڑی میزیں تھیں جن پر بے انتہا روپیہ صرف ہوا تھا ــــ کم از کم بچے ایسا ہی کہتے تھے صنوبر کا درخت ایک بڑی سی ریت بھری ناند میں گاڑ دیا گیا اور اُس کے ارد گرد سبز پڑ لپیٹ دیا گیا تاکہ ناند دکھائی نہ دے۔ وہ ناند ایک بہت خوبصورت قالیچہ پر پڑی تھی۔

صنوبر کا درخت کانپ کر سوچنے لگا "اب میرے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے"۔ کچھ نوجوان خاتونیں آئیں نوکروں نے ان کو درخت کے سجانے میں مدد دی۔ ایک شاخ پر انھوں نے رنگین کاغذ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے تھیلے لٹکا دیئے۔ ہر

ٹھیلے میں مٹھائی بھری تھی۔ دوسری شاخوں کے ساتھ رنگین سیب اور اخروٹ لٹک رہے تھے۔ ایسی خوبی سے جیسے وہ وہیں لگے ہوں۔

شاخوں پر ہر طرف سینکڑوں سُرخ نیلی اور سفید رنگ کی موم بتیاں بندھی تھیں۔ پتوں میں کچھ گڑیاں بھی رکھی گئیں جو بالکل اصلی بچوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ درخت نے ایسی چیزیں پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں ——— سب سے اونچی شاخ پر کسی چمکدار چیز کا بنا ہوا ایک چمکیلا ستارہ بندھا تھا جو بے انتہا خوبصورت تھا۔

لوگ غل مچانے لگے "آہا شام کو یہ کس قدر روشن معلوم ہوگا۔"

درخت نے سوچا "جب شام ہو جائے گی اور بتیاں روشن ہونگی مجھے بھی معلوم ہو جائے گا کہ اور کیا کیا ہونے والا ہے۔ کیا جنگل کے درخت مجھے دیکھنے آئیں گے۔ مجھے حیرت ہے کیا چڑیاں اُڑتی ہوئی مجھے کھڑکیوں سے جھانکیں گی۔ کیا میں یہاں بہت تیزی سے بڑھوں گا کیا موسم گرما و سرما میں یہ تمام زیور پہنے رہوں گا؟" لیکن اندازہ لگانا بے فائدہ تھا اس سوچ سے اس کے پوست میں درد ہونے لگا۔ یہ درد ایک دُبلے پتلے صنوبر کے لئے ایسا ہی مضر تھا جیسا ہمارے لئے دردِ سر ہے ——— آخرکار بتیاں روشن ہوئیں اور درخت روشنی کے درخشاں شعلے پیش کرنے لگا۔

اس کی تمام شاخیں مسرت سے کانپنے لگیں۔ اس ارتعاش سے ایک مومی شمع نے سبز پتوں میں گر کر انہیں جلا دیا۔

نوجوان خاتونیں چلّانے لگیں "بچاؤ، بچاؤ" لیکن کچھ خطرے کی بات نہ تھی۔ لوگوں نے آگ کو جلد بجھا دیا۔ اس کے بعد درخت بالکل نہ کانپا اگرچہ آگ ڈرا رہی تھی اور زیوروں کی چمک اُسے چندھیا رہی تھی ——— اسے خوبصورت زیوروں میں سے ایک ایک کے بچانے کا بے حد خیال تھا۔

اب بند دروازے کھول دیئے گئے اور بچوں کا ایک گروہ یوں اندر کود پڑا گویا ان کا ارادہ ہے کہ درخت کو اُلٹ دیں۔ وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے آ رہے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی ہستیاں چند لمحے حیرت سے خاموش کھڑی رہیں پھر خوشی سے چلّانا شروع کیا یہاں تک کہ ہال گونج اُٹھا۔ وہ مسرت سے درخت کے گرد ناچنے لگے اور یکے بعد دیگرے تمام تحفے اس سے اُتار لئے۔

صنوبر سوچنے لگا "یہ کیا کر رہے ہیں؟ اب کیا ہوگا ——— آخرکار موم بتیاں شاخوں پر ختم ہو کر بجھ گئیں۔ بچوں کو درخت کی تاخت و تاراج کی اجازت مل گئی۔ اُف! وہ کس کس طرح اس پر جھپٹے کہ شاخیں ٹوٹ گئیں اگر وہ چمکدار ستارے کے ساتھ چھت سے نہ بندھا ہوتا تو یقیناً گر پڑتا۔ بچے خوبصورت کھلونے پا کر اِدھر اُدھر ناچنے لگے۔ درخت کی کسی نے پروا نہ کی سوائے بچوں کی دایہ کے جو آکر شاخوں میں جھانکنے لگی تاکہ کوئی فراموش شدہ سیب یا انجیر نظر پڑ جائے۔

نیچے ایک لحیم شحیم ٹھگنے آدمی کو درخت کی طرف کھینچتے ہوئے چلّائے: "ایک کہانی! ایک کہانی!" آدمی چھاؤں میں بیٹھ کر بولا "کیا گھمن وندر معاملہ ہے۔ اور درخت بھی کہانی سُن کر لطف اُٹھائے گا لیکن ہم صرف ایک کہانی سنائیں گے بتاؤ آئیوڈی ایوڈی کی کہانی سنو گے یا ہمپٹی ڈمپٹی کی جو سیڑھیوں سے گر گیا تھا لیکن پھر جلد اُٹھ بیٹھا اور آخر کار اس نے ایک شہزادی سے شادی کرلی۔"

بعض لڑکے چلّائے "آئیوڈی ایوڈی" بعض چلّائے "ہمپٹی ڈمپٹی" غرض خوب چیخ پکار مچی۔ صنوبر کا درخت بالکل خاموش رہا اور خود بخود سوچتا رہا "کیا میں بھی اس تمام ماجرے میں کچھ حصہ لوں گا" لیکن وہ پہلے ہی ان کا دل بہت زیادہ اور خاطر خواہ طور پر بہلا چکا تھا۔

پھر بڑے آدمی نے انہیں ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ سیڑھیوں سے نیچے گر کر دوبارہ اوپر چڑھ گیا تھا۔ اور اس نے ایک شاہزادی سے شادی کرلی تھی۔

بچے تالیاں بجا کر چلّانے لگے "ایک اور سناؤ ایک اور سناؤ" کیونکہ وہ آئیوڈی ایوڈی کی کہانی بھی سُننا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں صرف ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی سنائی گئی۔

صنوبر کا درخت ساکت وصامت ہو کر خیالات میں گم ہو گیا "جنگل کے پرندوں نے کبھی ایسی کہانیاں نہ کہی تھیں۔ جیسی یہ ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی تھی جو سیڑھیوں سے گر گیا اور پھر بھی ایک شاہزادی سے شادی کرلی۔"

صنوبر نے دل میں کہا "ٹھیک ہے دُنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے" اس نے کہانی پر یقین کرلیا کیونکہ یہ ایک نہایت اچھے آدمی کا بیان تھا اس نے سوچا "ٹھیک ہے کون جانتا ہے کہ شاید میں بھی گر پڑوں اور پھر ایک شاہزادی سے میری شادی ہو جائے۔"

دوسری شام کو پھر روشنیوں، کھلونوں، سونے اور پھلوں سے آراستہ ہونے کی اُمیدیں وہ فرطِ مسرت سے سنتعد دکھائی دینے لگا اس نے سوچا "میں کل کانپوں گا نہیں۔ بلکہ اپنی شان وشوکت سے لطف اُٹھاؤں گا۔ پھر ہمپٹی ڈمپٹی" کی کہانی اور شاید "آئیوڈی ایوڈی" کی کہانی بھی سُنوں گا۔"

درخت تمام رات چپ چاپ خیال دوڑاتا رہا۔ صبح جب نوکر اور گھر کی خادمہ وغیرہ آئے اس نے خیال کیا اب میری شان وشوکت دوبارہ شروع ہوگی۔ لیکن وہ اُسے کمرے سے باہر گھسیٹ لائے اور سیڑھیوں کے رستے اوپر کی منزل کو لے جا کر اُسے ایک تاریک کونے میں جہاں دن کی روشنی نہیں جاسکتی تھی پھینک دیا اور چھوڑ کر چلے گئے۔

درخت نے سوچا "اس کا مطلب کیا ہے۔ میں یہاں کیا کروں گا۔ میں ایسی جگہ میں کوئی آواز تک نہ سُن سکوں گا" وہ دیوار کے ساتھ جھک کر لگ گیا اور ختم نہ ہونے والے خیالات کے سلسلہ میں کھو گیا۔ اس کے پاس برابر سوچتے رہنے کو کافی وقت

تھا کیونکہ کئی راتیں اور کئی دن گزر گئے۔ کوئی اُس کے نزدیک تک نہ پھٹکا۔ آخر ایک شخص کچھ بڑے بڑے صندوق اس کمرے کے ایک کونے میں رکھنے آیا جس سے درخت نظر سے ایسا اوجھل ہو گیا۔ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ لیکن اس نے خیال کیا "آجکل جاڑا ہے زمین سخت اور برف سے ڈھپنی ہوئی ہے اس لئے لوگ مجھے زمین میں نہیں لگاتے۔ میرا خیال ہے جب تک بہار نہ آئے میں یقیناً یہاں محفوظ رہوں گا۔ ہر شخص کس قدر مہربان اور میرا خیال رکھنے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میری خواہش ہے کہ یہ جگہ اتنی تاریک اور اتنی تنہا نہ ہو کہ ایک ننھا خرگوش تک دکھائی نہیں دیتا۔ جنگل میں یہ بات کتنی خوشگوار تھی جب زمین پر برف پڑی ہوتی اور کوئی خرگوش نزدیک سے نکل جاتا یا کبھی مجھے پھلانگ جاتا۔ اگرچہ اس وقت میں یہ بات پسند نہ کرتا تھا ـــــ اُف! یہاں ناقابلِ برداشت تنہائی ہے۔

درخت کی جانب احتیاط سے رینگتی ہوئی ایک چوہیا چیں چیں کرنے لگی۔ پھر ایک اور آ گئی۔ دونوں صنوبر کے درخت کو گھورنے اور شاخوں میں رینگنے لگیں۔ چھوٹی چوہیا بولی "اُف! سخت سردی ہے یہاں ہم بہت آرام پائیں گے۔ ٹھیک ہے نا بڈھے صنوبر؟"

صنوبر کے درخت نے کہا "میں بڈھا نہیں ہوں بے شمار ایسے موجود ہیں جو مجھ سے بہت بڑے ہیں۔"

چوہیاں جو شوقِ تحقیقات میں فنا ہو رہی تھیں۔ پوچھنے لگیں "تم کہاں سے آئے ہو اور کیا کیا باتیں جانتے ہو؟ کیا تم نے دنیا کی خوبصورت ترین جگہیں دیکھی ہیں اور کیا تم اُن کے متعلق ہمیں کچھ سُنا سکو گے۔ کیا تم کبھی سٹور روم میں گئے ہو جہاں الماری میں پنیر رکھا ہو اور چھت سے گوشت کے ٹکڑے لٹک رہے ہوں ـــ جہاں کوئی چکنی شموں پر ادھر اُدھر دوڑ سکے۔ دُبلا پتلا جائے اور موٹا ہو کر آئے؟"

صنوبر کے درخت نے کہا "میں اس جگہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن میں جنگل کو جانتا ہوں جہاں سورج چمکتا ہے اور پرندے گاتے ہیں" پھر اُس نے چھوٹی چوہیوں کو اپنی جوانی کا تمام ماجرا سُنایا۔ چوہیوں نے اپنی زندگی میں ایسا بیان کبھی نہ سُنا تھا۔ غور سے سننے کے بعد کہنے لگیں "تم نے کس قدر بے شمار چیزیں دیکھی ہیں۔ تم یقیناً بہت خوش رہتے ہوگے" صنوبر نے چلّا کر کہا "خوش!" اور جونہی اس نے اپنی بیان کردہ باتوں پر غور کیا وہ بولا "ہاں ہاں بہرحال وہ مسرت کے دن تھے۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اُس نے کرسمس کی شام کے واقعے کے متعلق تمام حالات بیان کئے کہ کس طرح وہ کیک وغیرہ اور روشنیوں سے ملبوس ہوا تھا۔ چوہیاں چلّا اُٹھیں "بڈھے صنوبر! تم کس قدر مسرور ہوئے ہوگے؟"

درخت نے جواب دیا "میں بالکل بڈھا نہیں ہوں میں جنگل سے انہیں جاڑوں میں آیا ہوں۔ میں نشوونما سے ابھی ابھی رُکا گیا ہوں۔"

چھوٹی چوہیوں نے کہا "تم کتنی شاندار کہانیاں سناتے ہو" دوسری رات ان کے ہمراہ چار اور چوہیاں کہانی سننے آئیں جوں جوں وہ بولتا گیا اسے اور زیادہ باتیں یاد آتیں۔ اب وہ خود بخود خیال کرنے لگا "وہ اچھے دن تھے لیکن وہ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔ ہمپٹی ڈمپٹی سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا تھا تاہم اس نے شاہزادی سے شادی کرلی۔ شاید میں بھی ایک شاہزادی بیاہ سکوں" پھر وہ اس حسین چھوٹے صنوبر کا خیال کرنے لگا جو جنگل میں اُگ رہا تھا اور اس کے لئے ایک حقیقی خوبصورت شہزادی کے برابر تھا۔

چھوٹی چوہیوں نے پوچھا "ہمپٹی ڈمپٹی کون ہے" اس پر درخت نے تمام کہانی سنائی۔ اسے ایک ایک لفظ یاد تھا چھوٹی چوہیاں اس سے اتنی خوش ہوئیں کہ وہ درخت کی چوٹی تک کُودنے کو تیار تھیں۔

دوسری رات اور بہت سی چوہیوں نے وہاں نزول کیا اور اتوار کو ان کے ساتھ دو چوہے بھی آئے۔ لیکن وہ بولے "یہ کہانی ہرگز اچھی نہیں ہے"۔

چھوٹی چوہیوں کو بہت افسوس ہوا اور اس بات نے انہیں بددل کر دیا۔ چوہیوں نے کہا "کیا تم صرف ایک ہی کہانی جانتے ہو؟"

درخت نے جواب میں کہا "ہاں! صرف ایک! میں نے یہ کہانی اپنی زندگی کی مسرور ترین شام کو سنی تھی مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اس وقت اتنا خوش ہوں"۔

چوہے بولے "ہمارے خیال میں یہ نہایت بے حقیقت کہانی ہے۔ کیا تم گودام میں نمکین گوشت یا چربی کے متعلق کوئی کہانی نہیں جانتے؟"

درخت نے کہا "نہیں"۔

چوہوں نے جواب میں کہا "تو پھر تمہارا بہت بہت شکریہ" اور بھاگ گئے۔ اس کے بعد ننھی چوہیاں بھی دور دور رہنے لگیں۔ درخت نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "آہ! کیا اچھے دن تھے جب ننھی مسرور چوہیاں میرے گرد بیٹھ کر میری گفتگو سنا کرتی تھیں۔ اب یہ دن بھی گزر گئے تاہم جب کوئی شخص مجھے اس جگہ سے باہر لے جانے کو آئے گا میں اپنے آپ کو خوش نصیب خیال کروں گا۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوگا؟"

ایک صبح لوگ کمرہ صاف کرنے آئے۔ صندوق وہاں سے اٹھا دیئے گئے۔ درخت کونے سے کھینچا گیا اور بالاخانے کے فرش پر بے دردی سے گرا دیا گیا۔ نوکر سیڑھیوں پر سے کھینچ کر اُسے باہر لایا جہاں دن کی روشنی چمک رہی تھی۔

درخت نے تازہ ہوا اور سورج کی چمک سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا "زندگی اب دوبارہ شروع ہو رہی ہے"۔

اُسے سیڑھیوں کے نیچے سے اُٹھا کر صحن کی طرف اس سُرعت سے لے گئے کہ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اور بمشکل اِدھر اُدھر نظر کر سکا۔ آس پاس بہت کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

یہ محل جہاں وہ پہنچایا گیا ایک باغ کے نزدیک تھا جہاں ہر چیز سرسبز نظر آتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کٹہروں پر تازہ خوشبودار پھول کھل رہے تھے۔ ہندوستانی پیڑ پھول رہے تھے۔ ابابیلیں ہر طرف چہچہاتی ہوئی اور یہ گیت گاتی ہوئی اُڑ رہی تھیں کہ "سیر آ رہی ہے آ رہا ہے"۔ لیکن اس سے ان کا مطلب صنوبر کا درخت نہ تھا۔

صنوبر اپنی شاخیں پھیلاتے ہوئے فرطِ مسرت سے چلّایا "اب میں جی اُٹھوں گا" لیکن افسوس شاخیں تمام خشک اور زرد ہو گئی تھیں۔ وہ ایک کونے میں گھاس پھوس اور جھاڑیوں کے درمیان پڑا تھا۔ سنہرے کاغذ کا ستارہ اب تک اس کی چوٹی میں کھلا سورج کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ اس صحن میں دو خوش باش بچے جو کرسمس میں درخت کے گرد ناچ کر مسرور ہوئے تھے کھیل رہے تھے۔ چھوٹے بچے نے چمکدار ستارہ دیکھتے ہی دوڑ کر درخت پر سے کھینچ لیا۔ وہ شاخوں کو روندتے ہوئے چلّایا "دیکھو دیکھو بدشکل بڈھے صنوبر کے ساتھ یہ کیا اُلجھا ہوا تھا"۔ اس کے بوٹ کے نیچے شاخیں کڑ کڑانے لگیں۔

صنوبر کے درخت نے باغ کے تمام تازہ اور درخشاں پھولوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر اپنی طرف دیکھا اور کہا "کاش میں بالاخانے کے اندھیرے کونے ہی میں پڑا رہنے دیا جاتا"۔ اسے اپنی جنگل کے زمانے کی نوجوانی۔ کرسمس کی مسرور شام اور ننھی چوہیاں یاد آنے لگیں جو ہمپٹی ڈمپٹی کی کہانی سنا کرتی تھیں۔

بوڑھے درخت نے کہا "آہ! ماضی ماضی ——— اے کاش جب میں لطف اُٹھا سکتا تھا اُٹھا لیتا لیکن اب ——— وقت گذر چکا ہے۔

ایک لڑکے نے درخت کی چھال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اُتار کر بڑا سا انبار لگا دیا۔ وہ ٹکڑے ایک دیگچے کے نیچے جلائے گئے جو بہت جلد ایک تابش کے ساتھ بھڑک اُٹھے۔ اس وقت درخت ایسی جانگداز آہیں بھر رہا تھا کہ ایک ایک آہ ایک پستول کی گولی کے دھماکے کے مانند تھی۔ کچھ کھیلتے ہوئے بچے آ کر صنوبر کے درخت کے سامنے بیٹھ گئے اور اس کی طرف دیکھ کر چلّانے لگے "دھماکا دھماکا" لیکن ہر ایک دھماکے کے ساتھ جو ایک دردناک آہ تھا درخت جنگل میں گرمیوں کے دن اور جاڑے کی راتوں کو یاد کر رہا تھا جب ستارے آب و تاب سے چمکا کرتے تھے کرسمس کی شام اور ہمپٹی ڈمپٹی کی وہ واحد کہانی جو کبھی اُس نے سُنی تھی یا جسے وہ بیان کرنا جانتا تھا۔ یہ سب کچھ گزر چکا تھا۔

بچے اب تک باغ میں کھیل رہے تھے سب سے چھوٹے بچے کے سینے پر وہ سنہرا ستارہ جگمگا رہا تھا جس سے درخت اپنی زندگی کی دل خوش کن شام میں آراستہ کیا گیا تھا۔ اب سب کچھ گزر چکا تھا۔ درخت کی زندگی گزر چکی تھی۔ اور کہانی بھی گزر چکی تھی کیونکہ آخر کار تمام کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

(ترجمہ)

(ح - ب)

گرب پر

یہ ظلم ہوگا اگر ہم اُس کا نام بھی ٹھیک طرح نہ پکار سکیں!

GRIB PUR ——— یہ ہے اُس کے نام کا صحیح تلفظ!

یا

گِرْب پُرْ ——— وہ تو خدا بھلا کرے نئے "جامع" حیدرآبادیوں کا جنھوں نے یہ ممکن کر دیا کہ اُردو میں بھی اِس قسم کے لفظوں کا صحیح تلفظ معلوم ہو سکے لیکن جنھیں اب بھی اندازہ نہ ہوا ہو وہ خوب سمجھ لیں کہ گرب کا پہلا ہی حرف یعنی گاف ساکن ہے۔ گ اور ر بیک وقت ملفوظ ہوتے ہیں اور زبان کو اپنے جھٹکے سے ایک عجب مزا دیتے ہیں۔ گِرْب! ——— اور پُرْ تو خیر پُرْ ہے ہی!

میں جب چلا تھا اپنے . . . . . (وطن محذوف) سے یہاں پہنچا تو اُسی مکان میں آ کر ٹھہرا جس میں گرب پر مجھ سے کم از کم ایک ماہ پہلے متمکن تھا لیکن

ہم تین دن تک ایک دوسرے سے نہ ملے!

چوتھے روز میرے غرور نے سر اُٹھایا اور میں نے سوچا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا!

میں نے اُسے کہلا بھیجا۔ وہ آیا۔ میری بہت سی اُمیدیں اُس سے وابستہ تھیں:

میری اُس کی پہلی ملاقات دل شکن تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اُس نے مجھے۔ مجھ پر اُس کی صورت نے اچھا اثر نہ ڈالا اور غالباً میری صورت کا اثر بھی اُس پر کچھ اچھا نہ پڑا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہمارے چہروں پر ذرا رونق نہ آئی (اور اصل جیسا کسی تاڑنے والے کو فوراً معلوم ہو جاتا ہمارے چہرے ہی کچھ ایسے تھے۔ وہ جوانوں کی طرح اپنے پسینے کی کمائی سے روٹی کھاتا تھا لیکن فی الحقیقت بوڑھا تھا۔ میں جوان تھا لیکن دل کے بڑھاپے اور دیگر وجوہ سے عموماً مذہبی بوڑھوں کی طرح متین نظر آتا تھا)۔

میں نے کہا "تم اتنے دنوں سے ہمارے پاس نہیں آئے"۔ وہ اِس سے گھبرایا نہیں۔ کہنے لگا "ہجور کو پھرصت نہ تھی"۔

میں نے کہا: "ہم نے جو کام کہلا بھیجا تھا وہ کیا ہے؟ (در اصل تین دن سے مکان کے ارد گرد کی حالت کو دیکھ کر میں نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ اُس نے کافی کام کیا ہے۔) اُس نے کہا "گرب پر! اجنٹ" نے مجھ سے کہا تھا پر میں تو ابھی تھوڑے دن ہوئے یہاں آیا۔

میں نے جی میں سوچا۔ اِس نے تو بن پوچھے ہی میرا نام رکھ لیا اب پیشتر اس کے کہ میں کچھ اور پوچھوں یا دیکھوں پہلے اس کا نام پوچھ لوں۔

میں نے کہا تمہارا نام کیا ہے؟

اُس نے جواب دیا۔ نکھو!

ننھو اور اس کے پھول

ننھو اور شاہ بلوط

نکنو

یعنی ——— نک نوُ !
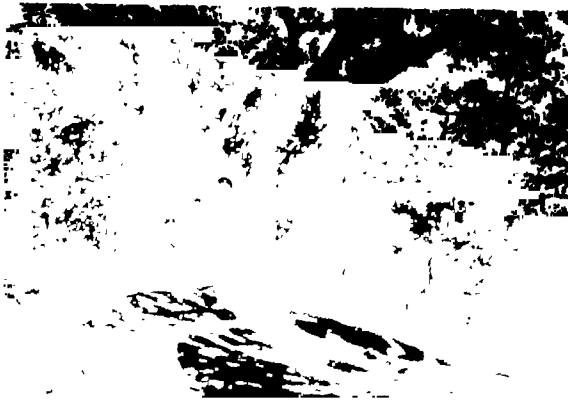
مجھ پر جو بُرا اثر اُس کی شکل صُورت کا پڑا تھا وہ اس چھینٹے سے نام سے گرد کی طرح دُھل گیا۔ پنجابی لفظ "نکّے" (چھوٹے) کی مناسبت سے ایک بوڑھے کے لئے یہ نام نہایت لطیف اور دل خوش کُن تھا!

میں نے دوبارہ پوچھا۔ اُس نے ذرا کراہے پن سے کہا: "نکنو حضور!" مجھے بڑا ہی مزا آیا۔

میں نے کہا نکنو! ہم دیکھتے ہیں تم نے باغ میں کچھ پھُول لگا رکھے ہیں!

اُس نے جواب دیا "گرب پر (غریب پرور)! ابھی آئے مجھے کے دن ہوئے؟ اور پھُول دیر سے ہی اُگتے ہیں" اور پھر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضُور مجھے مابھی (معافی) دیں۔ جنٹ (ایجنٹ) نے مجھے مُلکی لاٹ کے داکڈر (ڈاکٹر) کی کوٹھی سے اِدھر بُلایا ہے۔ میں نے حضُور کے بُجرگوں (بزرگوں) کا نام پہلے سے سُنا تھا۔ (پھر ہاتھ جوڑ کر) حضُور مجھے مابھی دیں میں نے آج تک کسی کالے آدمی کی نوکری نہیں کری!

میں نازک احساس جلد باز گھبرا کر بولا: ہاں تو نکنو تم بہت جلد اچھے اچھے پھُول تیار کرو۔ ہم مدّت کے بعد اس سال یہاں اپنی کوٹھی میں آئے ہیں۔ نہیں معلوم اگلے سال آئیں نہ آئیں!

نکنو بولا: حضُور یہ تو نہیں ہونے کا۔ میں تو پھر اس جنگل بیابان میں پہاڑوں کے بیچ ایک اکیلا نہ ٹھہروں گا۔ یہ پینجی (Pansy) اٹ ریمن (Antirrhinum) کان پھلور (Corn-flower) جری می اَن (Geranium) جپ سا پیلا (Gypsophila) لاکش پر (Larkspur) تو میں نے "تیار" کردیئے! اب حضُور جانیں!

میں نے جی میں کہا بوڑھا تجربہ کار مالی ہے اِسے ہاتھ سے نہ کھونا چاہئے۔ میں نے جواب دیا دیکھو! ہم کئی سالوں کے بعد اپنی کوٹھی میں آئے ہیں۔ جب ہم نہ ہونگے تو تم ہماری جگہ یہاں ہوگے نکنو! جب ہم یہاں نہیں تو سمجھو کوٹھی تمہاری ہی ہے۔

اُس نے ہاتھ پیشانی سے لگا کر مجھے سلام کیا اور کہا "گرب پر"! ——— ہم دونوں خوش ہوگئے!

سچ یہ ہے کہ ہماری پہلی ملاقات کا آغاز بُرا تھا لیکن انجام خاصا اچھا رہا۔

انت بھلا سو بھلا!

ب ا

"فیئرویو" شملہ جون سنہ ۱۹۳۴ء

یاد آتا ہے کوئی

طوفانِ بلا میرے لئے لاتا ہے کوئی
آتش شررِ شوق کی بھڑکاتا ہے کوئی
سینے میں دلِ سرد کو گرماتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے، یاد آتا ہے، یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

جب جوشِ محبت میں نکل جاتی ہیں آہیں
گڑ جاتی ہیں رُخ پر مری بیتاب نگاہیں
آنکھوں میں نظر بن کے سما جاتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے، یاد آتا ہے، یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

جلووں سے نظر آتی ہیں معمور فضائیں
مستانہ کیئے دیتی ہیں مستانہ ادائیں
دُنیائے تصوّر میں بھی شرماتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے، یاد آتا ہے، یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

پھر جوش میں آتی ہے مرے درد کی دُنیا
پھر حشر بپا کرتی ہے بیتاب تمنّا
سوتے ہوئے فتنوں کو جگا جاتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے، یاد آتا ہے، یاد آتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

صاحبزادہ میر محمد علیخاں (عثمانیہ)

"چھ سال بعد"

اور چھ سال بعد الائزا پھر اُس سے ملی۔ دوسری میزوں کے درمیان، وہ ایک چھوٹی سی بانس کی میز کے قریب بیٹھا تھا۔ جس پر آرائش کے لئے کاغذی پھولوں کا ایک جاپانی گلدان رکھا تھا۔ قریب ہی ایک طشتری میں کچھ پھل ایک چھوٹے سے انبار کی صورت میں پڑا تھا۔ الائزا نے غور سے اِدھر دیکھا تو اسے فوراً معلوم ہوگیا کہ نارنگی چھیلنے کا یہ "خاص" انداز اُسی کا ہے۔ اُسے پہچانتے وقت الائزا کے چہرے کی حیرت ضرور اُس نے بھی دیکھ لی ہوگی جبھی تو اُس نے نظریں پھر اوپر اُٹھا کر اس سے ملائیں۔ یا مظہر العجائب! یہ کون صورت! الائزا مسکرائی۔ البرٹ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ الائزا آگے بڑھی۔ البرٹ کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے بند ہو کر رہ گئیں۔ پھر کھلیں اور ساتھ ہی یکایک البرٹ کا چہرہ چمک اُٹھا جیسے تاریک کمرے میں دیا سلائی بھڑک کر روشن ہو جائے۔ اس نے نارنگی نیچے رکھ دی اور کرسی پیچھے کو سرکائی۔ ہلتے میں الائزا نے مصافحہ کے لئے اپنا ننھا سا گرم گرم ہاتھ کوٹ کی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ کہنے لگا "الائزا کتنی عجیب بات ہے۔ سچ مچ ایک لمحے تک تو میں تمہیں بالکل پہچان ہی نہ سکا۔ بیٹھو گی نہیں! اچھا کھانا! کافی پیو گی؟

وہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ شش و پنج میں پڑی جس سے اس کی نیم رضامندی سی ظاہر ہوئی۔ پھر وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی "ہاں میں تھوڑی سی کافی پی لوں گی"۔

البرٹ کے چہرے پر پھر پہلی سی چمک دکھائی دی اور وہ اپنی پُرشوق نگاہیں اُس پر گاڑ کر کہنے لگا "تم بہت بدل گئی ہو۔ بلکہ بالکل! ہی بدل گئی ہو۔ تمہاری صحت کتنی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ میں! نے کم از کم تمہیں کبھی اتنا صحت مند نہیں دیکھا تھا"۔

اس نے اپنے چہرے سے نقاب اُتار لی اور اپنے چوڑے سے سمور دار کالر کے بٹن کھول کر کہنے لگی "ہیں، سچ مچ! . . . . اچھا! مجھے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ اتنی سردی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تم جانتے ہی ہو!

"اچھا! مجھے معلوم نہ تھا۔ اچھا! تو تمہیں سردی بُری لگتی ہے؟ . . . ."

وہ کانپتے ہوئے کہنے لگی "بُری نہیں لگتی۔ بلکہ مجھے تو اس سے نفرت ہے۔ سب سے بڑی بُرائی تو اس میں یہ ہے کہ جوں جوں کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے . . . ."

البرٹ نے اس کی بات کاٹ کر کہا "معاف کرنا" اور خادمہ کو بُلانے کے لئے میز پر انگلیوں سے تھپکی دی۔ خادمہ آئی تو اس سے کہا "کچھ کافی اور بالائی لاؤ"! پھر الائزا کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اچھا تو سچ مچ تم کھاؤ گی کچھ نہیں؛ پھل تو شاید تم پسند ہی کرو گی۔ یہاں کا پھل بہت اچھا ہے"۔

الائزا نے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں شکریہ اور کچھ نہیں چاہئے"۔

البرٹ نے مسکرا کر پھر اپنا پرانا فقرہ دہرایا: "اچھا تو اب ایک بات طے ہو گئی"۔ یہ کہہ کر اس نے پھر نارنگی اٹھالی اور کہا "تم کہہ رہی تھیں جوں جوں کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے ——— "

وہ ہنس کر کہنے لگی "جتنا کوئی زیادہ بوڑھا ہوتا جائے اتنی ہی زیادہ سردی اُسے چمٹتی ہے"۔ اب اُسے یاد آ رہا تھا کہ وہ کس خاص طریقے سے اس کی بات کاٹا کرتا تھا اور کس طرح آج سے چھ سال پہلے وہ اس کی شرارت پر غصہ سے بظاہر شعلہ بھبوکا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے یکایک اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا کرتا اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر کوئی دوسری بات کرتا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوتے اُس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ اُٹھا کر مسکراتے ہوئے کہتا "ہاں اب کہو اب ایک بات تو طے ہو گئی"۔

البرٹ نے ہنستے ہوئے پھر اس کے یہ الفاظ دُہرائے "اچھا خوب بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ آہ تم اب بھی وہی باتیں کرتی ہو۔ ہاں تمہاری ایک بات بالکل نہیں بدلی، بالکل وہی ہے ——— تمہاری شیریں آواز، تمہارا باتیں کرنے کا حسین انداز ———
البرٹ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا جیسے معلوم نہیں ابھی کیا کیا کچھ گڑگڑا گڑگڑا کر کہہ ڈالنے والا ہے۔ وہ الائزا کی طرف جھک گیا تھا اور اُسے اس کے سنگترے کے چھلکے کی تیز تیز خوشبو آ رہی تھی۔ وہ پھر بولا "تم ایک لفظ کہو اور میں تمہاری آواز تمام آوازوں میں پہچان لوں۔ میں اکثر حیران ہوا کرتا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیا سحر ہے۔ تمہاری آواز نہیں بھول سکتی . . . . . تمہیں وہ پہلی سہ پہر یاد ہے جو ہم نے نشاط باغ میں گزاری تھی۔ تم بہت حیران ہوتی تھیں کہ مجھے پھولوں کے نام تک نہیں آتے۔ تم نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا لیکن میں اب بھی اُسی طرح کورے کا کورا ہوں۔ لیکن اب بھی کسی سہانے اور پرکیف دن کو مجھے باغ میں کچھ چمکتے ہوئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے مجھے پھر تمہاری آواز سنائی دینے لگتی ہے: "صدبرگ، شبو، موتیا" اور مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تین لفظ کسی فراموش کردہ آسمانی زبان کی صدائے بازگشت ہیں . . . . .
وہ سہ پہر تمہیں بھی یاد ہے؟"

وہ کہنے لگی "ہاں ہاں مجھے ایک ایک بات یاد ہے" یہ کہہ کر اس نے ہلکی سی اور طویل سانس کھینچی۔ جیسے میز پر کے سوکھے ہوئے کاغذی پھولوں کی شیریں خوشبو اس کی برداشت کی حد سے بڑھ گئی ہے۔ مگر اس سہانی دوپہر کی یاد تو اس

ں میں کچھ اور چٹکیاں لے رہی تھی۔ چائے کی میز کے سامنے ایک بیہودہ نظارہ تھا۔ ہوٹل میں ایک دُنیا چائے پی رہی تھی
س متحرک ہجوم سے وہی سلوک کر رہا تھا جو دیوانہ اپنے ارد گرد منڈلاتی ہوئی مکھیوں سے کرتا ہے۔ وہ اُن سے بچنے کے
ندوں کی طرح پھڑ پھڑاتا، ٹوپی ہلاتا اور انہیں اپنے سے دُور رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بات زیادہ اہم نہ تھی لیکن وہ سخت جھنجھلا
۔ چائے پینے والے کتنے بیہودہ اور خوش تھے، نہایت تکلیف دِہ قہقہے لگا رہے تھے۔ اور الائزا کو بھی تکلیف ہی ہو
ں۔ اب جو وہ بولا تو پہلی یاد تازہ ہو گئی۔ البرٹ کی باتوں کی صداقت اسے محسوس ہوئی۔ ہاں واقعی وہ ایک عجیب و غریب
تھی۔ گرم اور خوشگوار دھوپ میں باغ صد برگ، شبّو اور موتیے سے بھرا پڑا تھا۔
گرم اور خوشگوار موسم کی ایک اور یاد تازہ ہوئی: وہ گھاس کے ایک تختے پر بیٹھی تھی۔ اور وہ اس کے نزدیک لیٹا تھا
یل خاموشی کے بعد یکایک وہ گھوم کر آگے ہُوا اور اس نے اپنا سر الائزا کی گود میں رکھ دیا۔ پھر نہایت آہستہ سے بھرائی
واز میں کہا "کاش میں نے اس وقت زہر کھایا ہوتا اور مجھے یہیں مرنا ہوتا۔"
اس وقت ایک ننھی لڑکی کنول کا سفید پھول ہاتھ میں لے کر ایک جھاڑی سے دوڑ کر باہر نکلی اور گیلے پھول سے پانی
ے ٹپکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ لڑکی پھر اُسی جھاڑی میں غائب ہو گئی تھی البرٹ نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور وہ بھی
جھک گئی۔

البرٹ کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی غم انگیز چیخ نکلی اور اس نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے گالوں سے لگا لئے۔ اور
"میں تم سے لا انتہا محبت کرنے والا ہوں اتنی محبت جتنی کبھی کسی نے کسی سے نہیں کی۔ آہ الائزا میرا انجام کس قدر
ہوگا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کبھی مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔"

وہ یقیناً اب پہلے سے زیادہ باعظمت معلوم ہو رہا تھا۔ ان کی فطرت سے وہ پہلا خیالی ابہام اور تذبذب دُور ہو چکا تھا۔
ہی وضع ایک ایسے آدمی کی سی ہو گئی تھی جس نے زندگی میں اپنے لئے جگہ تلاش کر لی ہو اور ایک جگہ اطمینان اور بھروسے
ینت پذیر ہو۔ ایسی باتوں کا کس پر اثر نہ پڑتا اور اب تو ضرور اس کے پاس روپیہ بھی ہوگا۔ اس کا لباس بھی قابلِ تعریف تھا۔
نے اپنی جیب سے ایک رُوسی سگرٹ کیس نکال لیا۔
"الائزا سگرٹ پیئو گی!"
وہ سگرٹوں کو جھک کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ہاں کتنے نفیس ہیں۔"
"ہاں کافی عمدہ ہیں۔ میں نے سینٹ جیمز سٹریٹ کے ایک چھوٹے سے آدمی سے یہ اپنے لئے تیار کرائے تھے۔ میں زیادہ
نہیں پیتا۔ تمہاری طرح نہیں ہوں۔ لیکن جب پیتا ہوں تو بہترین، لطیف اور تازہ پیتا ہوں۔ لیکن سگرٹ پینا میری عادت

میں داخل نہیں یا یونہی دلچسپی کے لئے پیتا ہوں جیسے لوگ عطر کا استعمال کرتے ہیں۔ کیا اب بھی تم عطر پسند کرتی ہو؟ اور جب میں رُوس میں تھا . . . . .

وہ بات کاٹ کر بول اُٹھی "ہیں کیا سچ مچ تم روس جا چکے ہو؟"

"ہاں، ہاں۔ میں تو وہاں ایک سال سے زیادہ عرصہ رہا ہوں۔ کیا تم بھول گئی ہو جب ہم وہاں جانے کی باتیں کیا کرتے تھے"

وہ کہنے لگی "نہیں میں نہیں بھولی"

البرٹ ایک نیم قہقہہ لگا کر پیچھے کی طرف جھک گیا اور کہنے لگا "ہے نا تعجب کی بات؟ واقعی! میں اُن تمام جگہوں سے ہو آیا ہوں جہاں جانے کے متعلق ہم دونوں مل کر تجویزیں کیا کرتے تھے۔ جو جو سفر ہمیں کرنے تھے وہ سب میں کر چکا ہوں۔ درحقیقت میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ تین سال مسلسل سفر میں گزارے ہیں۔ کبھی سپین میں، کبھی کارسیکا میں، کبھی سائبیریا میں، کبھی روس میں اور کبھی مصر میں۔ اب چین باقی رہ گیا ہے میرا ارادہ ہے کہ جنگ ختم ہوتی ہے تو وہاں بھی جاؤں"

جب اس نے اس قدر ٹھنڈے دل سے اپنے سگرٹ کا جلا ہوا حصہ طشتری سے رگڑتے ہوئے اُس سے یہ باتیں کیں تو یکایک دور دراز ملکوں کی سیر کا جذبہ جو مدت سے اس کے سینے میں مردہ ہو چکا تھا بیدار ہو گیا اور تصور ہی تصور میں وہ دُور دراز ملک اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے لیکن اگر الاپرا نے زبان سے کچھ کہا تو صرف یہی کہ "میں اس وقت تم سے مل رہی ہوں"۔

وہ جواب میں مسکرا کر کہنے لگا "واقعی یہ سفر عجیب و غریب تھے خاص کر روس کا سفر ہم سب سے زیادہ باتیں رُوس ہی کی کیا کرتے تھے۔ میں دو تین دن تک دریائے والگا کی ایک ہاؤس بوٹ میں بھی رہا تھا۔ تمہیں ملاح کا وہ گیت یاد ہے جس کے سُر تم پیانو پر نکالا کرتی تھیں؟"

وہ کہنے لگی "ہاں" اور اس کے دل میں پیانو کے وہی سُر پیدا ہونے لگے۔

"کیا اب بھی تم اس گیت کو پیانو پر بجایا کرتی ہو؟"

"نہیں میرے پاس کوئی پیانو نہیں"۔

وہ حیران ہو کر کہنے لگا "وہ تمہارا خوبصورت پیانو کیا ہوا؟"

"مدتیں گزریں بک گیا"

وہ اور حیران ہوا . . . . "لیکن تمہیں تو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی؟"

"اب میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں"

یہ قضیہ یہیں چھوڑ دیا گیا اور وہ کہنے لگا "دریائی زندگی ایک خاص چیز ہے۔ ایک یا دو دن کے بعد کسی کو یاد ہی

نہیں رہتا کہ اس کی کبھی کسی اور شخص سے کبھی آشنائی تھی۔ اور ان کی زبان جاننے کی تو ضرورت ہی نہیں کشتی کی زندگی بذات خود ہی ہمارے اور اُن لوگوں کے درمیان کچھ تعلقات سے قائم کر دیتی ہے اور یگانگی سے زیادہ ہے۔ دن تو ان کے ساتھ کھاتے پیتے گزر جاتا ہے اور شام کو ان کے لامتناہی گیت شروع ہو جاتے ہیں "

وہ کانپ اٹھی" اُسے ملاح کے گیت کی بلند اور غمناک آواز پھر سُنائی دے رہی تھی۔ کشتی تاریک دریا میں چل رہی تھی جس کے دونوں طرف اُداس درخت کھڑے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساری بات سُن کر وہ کہنے لگی "کاش میں بھی وہاں جا سکتی"

وہ نہایت گرمجوشی سے کہنے لگا "تم دیکھو تو روسی طرز معاشرت کی ہر بات تمہیں بہت پسند آئے۔ کتنا آزاد، کتنا دلپذیر اور کتنا بے ضابطہ ملک ہے۔ وہاں کے کسان تک شاندار ہیں۔ اور تو اور اپنا گاڑیبان ہی لے لو۔ ناممکن ہے جو وہ ملک کے سیاسی حالات میں کوئی نہ کوئی حصہ نہ لیتا ہو۔ مجھے وہ شام اب تک یاد ہے جب میں میرے کچھ دوست اور اُن میں سے ایک کی بیوی بحیرۂ اسود کے کنارے کھانے کی چیزیں ساتھ لے کر گئے تھے۔ ہم نے شمپین پی اور شام کا کھانا اُسی گھاس پر بیٹھ کر کھایا۔ اسی دوران میں گاڑیبان ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور کہنے لگا " تو کانجی بھی پیو"۔ بات یہ تھی کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا۔ یہ بات مجھے اتنی اچھی لگی ـــــ سو تم سمجھ گئیں کہ میرا مطلب کیا ہے؟"

اس ایک ہی لمحے میں وہ پُر اسرار بحیرۂ اسود کے ساحل پر جا بیٹھی تھی۔ سمندر کے پانی کا رنگ مخمل کی طرح سیاہ تھا اور اس کی خاموش اور مخملیں لہریں آ آ کر کناروں سے چھُو رہی تھیں۔ سڑک کے ایک کنارے پر گاڑی کھڑی تھی اور ایک چھوٹی سی جماعت گھاس پر بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کے چہرے اور ہاتھ چاندنی میں سفید ہو رہے تھے۔ ایک عورت اپنا لباس پھیلا کر ایک جگہ بیٹھی تھی۔ اس کی خوبصورت چھتری گھاس پر بند پڑی تھی اور اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز مخمل کے کپڑے پر کوئی ننھا سا پھول ہو۔ اس کے علاوہ گاڑیبان اپنا شام کا کھانا کپڑے میں باندھے اسے گھٹنے پر رکھ کر بیٹھا تھا۔ آواز آئی " تو کانجی بھی پیو"۔ اُسے معلوم نہ تھا کانجی کیا ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے سامنے ہلکے سبز رنگ کا ایک جگ آ گیا۔ طوطے کی چونچ کی طرح اس میں ایک سُرخ مرچ جھلملا رہی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کانجی پی لی۔ کانجی سخت کھٹی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

وہ کہنے لگی "ہاں میں سمجھ گئی تمہارا کیا مطلب ہے"۔ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ حائل ہوا اور دونوں کی نگاہیں ملیں بالعجب وہ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھا کرتے تھے تو اُن کی رُوحیں فوراً ایک ہو جاتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ نصیب عشاق کی طرح ایک دوسرے کے گرد بازو حمائل کر کے ایک دوسرے کے خیالوں کے سمندر میں ڈوب جائیں لیکن یہی عجیب بات تھی کہ ابھی پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وُہی کہہ رہا تھا:-

"تم میری باتیں بہت توجہ سے سنتی ہو۔ جب تم میری طرف ان وحشی آنکھوں سے دیکھتی ہو تو مجھے محسوس ہوتا ہے

کہ میں تم سے وہ باتیں کر سکتا ہوں جو میں کبھی کسی اور انسان سے نہ کروں۔"

الائزا نے یکایک محسوس کیا۔ کیا یہ مجھ سے دل لگی کر رہا ہے یا میرا وہم ہے۔

وہ کہنے لگا "تمہیں ملنے سے پہلے میں نے کبھی اپنی باتیں کسی دوسرے سے نہیں کہی تھیں۔ مجھے ایک رات اب تک بہت اچھی طرح یاد ہے۔ وہ رات جب میں نے تمہیں کرسمس میں ایک چھوٹا سا درخت لاکر دیا تھا اور اپنے بچپن کی سب باتیں تمہیں سنائی تھیں۔ ایک دفعہ میری خوب گت بنی۔ میں بھاگ گیا اور اپنے صحن میں دو دن تک ایک چھکڑے کے پیچھے چھپا رہا کوئی مجھے ڈھونڈ نہ سکا۔ تم نے یہ باتیں سنیں اور تمہاری آنکھیں چمک اٹھیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ تم نے کرسمس کے درخت میں بھی سننے کی روح پھونک دی ہے جیسے کوئی پریوں کی کہانی کا واقعہ ہو۔

لیکن اس شام کے متعلق الائزا کو صرف ایک بات یاد تھی کہ اُس نے ساڑھے چھ شلنگ میں مٹھائی کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا جگ خریدا تھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا اور اُسی کے متعلق باتیں کئے جاتا تھا "اُف خیال کرو اتنا چھوٹا سا جگ اور قیمت سات شلنگ چھ پنس۔"

اور جب وہ اس جگ کو کھا رہی تھی تو وہ اسے دہشت زدہ اور خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔

"نہیں سچ کہتا ہوں کہ اتنا مہنگا جگ کھانا تو روپیہ کھانا ہے۔ اتنے چھوٹے جگ میں تو سات شلنگ آ بھی نہیں سکتے۔ ذرا سوچو تو سہی دکاندار کس قدر نفع اٹھاتے ہوں گے . . . . ."

اب اس نے جگ کی لاگت اور نفع کے متعلق پیچ در پیچ حساب لگانے شروع کر دیئے . . . . . لیکن اب برتن غائب ہو چکا تھا۔ میز پر وہی درخت پڑا تھا جو اس نے اُسے تحفۃً دیا تھا۔ ننھا لڑکا چھکڑے کے نیچے چھُپ کر لیٹا تھا اور تکئے کی جگہ اس کے سر کے نیچے صحن کا کتا تھا۔

وہ ہنس کر کہنے لگی "کتے کا نام بوزن تھا۔"

البرٹ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ کہنے لگا "کون سا کتا؟ تمہارا کوئی کتا بھی تھا؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔"

وہ کہنے لگی "نہیں نہیں۔ میری مراد اُس کتے سے ہے جو صحن میں رہا کرتا تھا۔ جب تم چھوٹے ہوتے تھے۔ وہ سن کر ہنس دیا۔"

"اچھا تھا کوئی کتا؟ مجھے تو بالکل یاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مدتیں گزر گئی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ صرف چھ سال ہی گزرے ہیں۔ آج جب تمہیں میں نے پہچانا تو مجھے پھر ایک گزری ہوئی دنیا میں واپس جانا پڑا اور مجھے اس تک پہنچنے کے لئے گزری ہوئی زندگی کے تمام سال پھلانگنے پڑے۔ کتنا ننھا تھا میں ان دنوں" یہ کہتے ہوئے اس

نے اپنی مٹھیاں میز پر دے ماریں۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میں خواہ مخواہ تمہیں دق کیا کرتا تھا۔ میں اب اُس خط کو اچھی طرح سمجھا ہوں۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ تم نے مجھے وہ کیوں لکھا تھا۔ اگرچہ اُس وقت تو میں وہ خط پڑھ کر جاں بلب ہو گیا تھا۔ اگلے دن جب یہ میری نظر پڑا تو میں اسے پڑھ کر قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنی ہنرمندی سے لکھا تھا۔ وہ تو میرے کیریکٹر کی صحیح تصویر تھا۔"

البرٹ کی نگاہیں یکایک اوپر کو اٹھ گئیں۔

"ہیں، تم جا رہی ہو؟"

الائزا نے کالر کا بٹن بند کر کے چہرے پر نقاب ڈال لی تھی۔

وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی "ہاں اب مجھے جانا ہی چاہئے"۔ اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سے دل لگی کر رہا ہے۔

البرٹ کہنے لگا "کیوں؟ کیوں جا رہی ہو؟ ایک منٹ تو اور ٹھیرو"۔ اس نے اس کا ایک دستانہ اٹھا کر زور سے مٹھی میں بند کر لیا جیسے اس کا جانا نہ جانا اسی دستانے پر منحصر ہے۔ "آج کل میں لوگوں سے اس قدر کم ملتا اور بولتا ہوں کہ بدتہذیب ہو گیا ہوں۔ کیا میں نے کوئی ایسی بات کہدی ہے جس سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے؟"

وہ جھوٹ بولتے ہوئے کہنے لگی "نہیں تم نے تو کوئی بات نہیں کہی" لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کا دستانہ اس نے اپنے ہاتھ میں پہن لیا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہونے لگا اس کے علاوہ اس ایک ہی لمحے میں البرٹ پھر البرٹ بن گیا — چھ سال پہلے کا البرٹ . . . .

وہ آہستہ سے کہنے لگا "اس وقت میری تمنا کیا تھی؛ یہی کہ تمہارے چلنے کے لئے اپنے آپ کو ایک قالین بنا لوں تاکہ تمہارے نازک پیروں کو پتھروں کی چوٹ نہ آئے اور تم کیچڑ سے بچی رہو۔ جس سے تمہیں سخت نفرت تھی۔ میری یہی خواہش تھی کہ جادو کا ایک غالیچہ بن جاؤں اور تمہیں اُن تمام مقامات کو لے جاؤں جن کی سیر کرنے کے لئے تم اس قدر بیتاب رہتی تھیں۔"

الائزا نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا جیسے اُسے کوئی بیرنی کرنشہ آگیا ہو۔ دُنیا کی سیر کے جذبہ نے پھر اس کے سینے میں ایک ہیجان برپا کر دیا۔

البرٹ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے محسوس ہوتا تھا کہ دُنیا میں تم سب سے زیادہ اکیلی ہو۔ اکیلی لیکن حقیقی معنوں میں زندہ۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تم اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی ہو۔ تمہارے لئے دُنیا کو

ذرا اور سُدھر لینا چاہئے تھا۔

"آہ اے خدا میں نے کیا کر دیا۔ میں نے کس طرح اپنی مسرت خاک میں ملا دینے کی جرأت کر دی۔ صرف یہی ایک آدمی تھا جس نے مجھے پوری طرح سمجھا تھا۔ کیا اب وقت گذر چکا ہے؟ کیا سچ مچ اب وقت نہیں؟"

الائزا کی قسمت البرٹ کے ہاتھ میں مینا دین گئی تھی اور وہ اس سے کھیل رہا تھا۔ اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ . . .

"اور پھر یہ حقیقت کہ تمہارا کوئی دوست نہیں اور تم نے کبھی کوئی دوست نہیں بنایا میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کیونکہ میرا بھی کوئی دوست نہ تھا۔ کیا اب بھی وہی بات ہے؟"

الائزا ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہنے لگی "اب بھی وہی بات ہے۔ میں ہمیشہ کی طرح اب بھی دُنیا میں اُسی طرح تنہا ہوں"

وہ آہستہ سے ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگا "میں بھی تنہا ہوں اب بھی وہی بات ہے"

یکایک ایک تیز حرکت کے ساتھ البرٹ نے دستانہ اُسے واپس دے دیا اور فرش پر اپنی کُرسی ارگرانی شروع کی اور نہایت سادگی اور صاف دلی سے اپنی پُرانی شکل اختیار کر کے یہ خوفناک الفاظ کہنے شروع کر دیئے:۔ "لیکن اس وقت جو بات مجھے عجیب اور پُرپیچ معلوم ہوتی تھی اب مجھ پر بالکل واضح ہو چکی ہے اور قدرۃً تم پر بھی۔ . . . اس کی صاف وجہ یہ تھی کہ ہم اس قدر خود پسند، مطلب پرست اور اس قدر بیزار و متکبر ہو چکے تھے کہ ہمارے دل میں کسی اور کے لئے بالکل جگہ ہی نہ تھی۔ تمہیں یاد ہے نا! جب میں روس میں تھا اور میں نے نفسیات کے متعلق ایک کتاب پڑھنی شروع کی تو مجھے پتہ چلا کہ ہم دونوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور یہ تو نفسیات کی۔ . . . . . "

الائزا جا چکی تھی۔ . . . . . وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کے تحیّر کی کوئی حد نہ رہی۔ . . . . . اس کے بعد اس نے منتظر خادم سے بل لانے کے لئے کہا:۔

"دیکھو بالائی کی پلیٹ نہیں چھوئی گئی۔ اس کے دام نہ لگانا۔"

مہدی علی خاں۔ کریم آباد ـــــ (کیتھرین مینسفیلڈ)

محفلِ ادب

محبّت

محبّت رُوحِ جسمِ عارضی ہے
محبّت زندگی کی زندگی ہے
محبّت غایت الغایاتِ ہستی
محبّت حق نما ہے حق رسی ہے

کبھی بھولے سے بھی مجھ کو نہ بھولے
وہ ساعت جس کی یادِ دلرُبا سے
غذا ملتی ہے اِس رُوحِ حزیں کو
مزے لیتا ہے یہ دل انتہا کے

سرِ کوہسار میں لیٹا ہوا تھا
سُہانی شام تھی اور چاند نا تھا
مری پیاری، مرے دل کی تمنّا
وہیں بیٹھی تھی اور مَیں گا رہا تھا

نہیں ہے آشنائے سوزِ پنہاں   مری امید کا مرکز، مری جاں
وہ مجھ پر مہرباں ہوتی ہے سُن کر   وہ گانے جن سے دل ہو وقفِ حرماں

پُرانا راگ اب اک مَیں نے گایا   اُسے اِک قصّۂ حرماں سنایا
مرے ذوقِ نظر کا بھید پا کر   حیا نے اُس کی آنکھوں کو جھکایا

یہ تھا افسانہ اِک دردآشنا کا   اور اِک محبُوبۂ سنگیں ادا کا
محبّت میں گھُلا وہ سالہا سال   مگر پگھلا نہ دل اِس بے وفا کا

مری دھیمی، مری غمگیں صدائیں   مری افسردہ و محزوں نوائیں
سفارش اپنی اُلفت کی چھپی تھی   ہر اک انداز میں ہر اک ادا میں

کہا میں نے بہ اندوہِ محبّت   ہُوا دیوانہ وہ برگشتہ قسمت

یا اُس نے مسکن جنگلوں میں   ہُوئی ہر روز بدتر اُس کی حالت

امت لیکن اب بھی ڈھارہا تھا   تصوّر ہر طرف اُس بے وفا کا
نے سابوں میں، غاروں میں، ہر اک سمت   وہی تھی، جس طرف وہ دیکھتا تھا

رِل دن اتفاقِ ناسزا سے   پڑی وہ ظالموں کے ہاتھ آکے
نی جان پر کھیلا اور اُس کو   بچایا موت سے بدتر جفا سے

چتائی مگر بے کار تھا اب   بنی غمخوار لیکن بے اثر سب
بڑھتا گیا جُوں جوں دوا کی   گئی جاں بھی جنوں رخصت ہُوا جب

ت روئی بہت تڑپی، مگر کیا   علاج اک کشتۂ تیرِ قضا کا؟
ا پیاری، مری شیریں ادا پر   اثر اس گیت کا جانے ہُوا کیا!

مَلا اک غازۂ سُرخ اُس کے رُخ پر — حیا اور جذبۂ اُلفت نے مل کر
پھر اک دھیمی سی، خوابیدہ صدا میں — مرا نام آگیا اُس کے لبوں پر

محبّت رحم بن کر رو رہی تھی — وہ جانِ حسن تمکیں کھو رہی تھی
مرے پاس اُٹھ کے آئی اور اچانک — وہ ہم آغوش مُجھ سے ہو رہی تھی

غرورِ حسن و اظہارِ محبّت! — حضورِ عشق اقرارِ محبّت!
بنے اس طرح ہم دونوں تن و جان
بنا یُوں حسن غمخوارِ محبّت

حامد علی خاں
ماخوذ از کالرج

(ہمایوں سالنامہ ۱۹۳۲ء)

رعایتی اعلانات

ہمایوں چار روپے چھ آنے میں

اردو کے ایک بہی خواہ نے ہمیں اس غرض سے پچاس روپے بھیجے ہیں کہ ان سے پچاس طلبہ یا غیر مستطیع حضرات کے نام ایک روپے کی رعایت سے "ہمایوں" جاری کر دیا جائے مستحق حضرات اور طلبہ فرمائشیں بھیج کر پانچ روپے چھ آنے کے بجائے چار روپے چھ آنے ادا کر کے "ہمایوں" کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں فرمائشیں جلد بھیجئے ورنہ موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا۔

طلسم زندگی چار روپے میں

اگست ۱۹۳۲ء کے آخر تک "ہمایوں" کے خریداروں کیلئے یہ خاص رعایت منظور کی گئی ہے کہ میاں بشیر احمد صاحب کی عدیم المثال کتاب طلسم زندگی ان کو پانچ روپے کے بجائے چار روپے میں دی جائیگی۔ وقت گزرنے سے پہلے فرمائشیں بھیج دیجئے ورنہ ہمیشہ افسوس رہے گا۔

"افسانہائے عشق" صرف ایک روپے میں

اردو ادبیات میں افسانوں کی یہ بہترین کتاب ہے جو جناب حامد علی خاں صاحب جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کی بارہ سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اس کا سرورق، جلد، تصاویر، کاغذ اور طباعت بھی نہایت نفیس ہے اگست ۱۹۳۲ء کے آخر تک ہمایوں کے خریداروں سے اس کی رعایتی قیمت صرف ایک روپیہ مع محصول لی جائے گی +

مینجر ہمایوں ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

تصانیف نیاز فتحپوری اڈیٹر نگار لکھنؤ

(انشاء لطیف کے وہ بے مثل نمونے جو آپ کو کہیں اور نہیں مل سکتے)

جمالستان

حضرت نیاز کے ادبی مقالات اور افسانوں کا بالکل جدید مجموعہ جو سال گزشتہ شائع ہوا ہے نگارستان کے بعد جتنے افسانے حضرت نیاز نے لکھے وہ سب اس میں شامل ہیں، ضخامت ۵۰۰ صفحات، قیمت مجلد کاپی للعہ غیر مجلد للعہ علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان، اسکی تخئیل اسکی نزاکت بیان ہلکی بلندی مضمون اور اعلیٰ انشاء عالم سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی۔ قیمت ۱۰ر علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

تین افسانوں کا مجموعہ جن میں بتایا گیا ہے کہ سہو وہ چیز جو کچھ ہے سونا نہیں زبان و پلاٹ انشاء و تخئیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت ۵ر علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دیا آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

شہوانیات ترغیبات جنسی

(حضرت نیاز کی سالہا سال کی کاوش و تحقیق کا نتیجہ)

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہونگے۔ مجلد کاپی ہے، غیر مجلد ہے ر علاوہ محصول ۔

مجموعۂ استفسار و جواب

نگار کا باب الاستفسار جس قدر اہم چیز ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اس لئے پبلک کے اصرار پر شروع سے اسوقت تک کے تمام استفسارات و جوابات کتابی صورت میں شایع کئے جا رہے ہیں۔ پہلی جلد جس کی ضخامت ۱۲۰ صفحات ہے طیار ہو گئی ہے۔ اس میں تمام علمی، تاریخی، ادبی، و مذہبی سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے باقی دو جلدیں سال آئندہ شایع ہوں گی۔ قیمت تین روپیہ ۳ر علاوہ محصول۔

رسالہ نگار

ہندوستان کا واحد رسالہ جو اپنی آزادانہ ادبی و مذہبی تنقید و بلند پایہ علمی تحریروں اور معیاری انشاء کے لحاظ سے مسلسل بارہ سال سے ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ سائز بڑا حجم ۸۰ صفحات۔ سالانہ چندہ ۵ر ششماہی ۳ر۔ نمونہ مفت ــــ منیجر نگار لکھنؤ

لنڈی کوتل سے جلال آباد

یہ بڑے اطمینان کی بات ہے۔ کہ ہندوستان کی بنی ہوئی ادویہ اب باہر بھی جانے لگی ہیں۔ سرحد اور سرحد پار افغانستان سے لوگ ہندوستانی علاقہ میں آکر امرت دھارا کو ڈھونڈتے ہوئے پائے گئے۔ ایک تھانیدار لکھا کہ ایک افغان امرت دھارا کی شیشیاں اپنے ملک میں لے جا کر ایک ایک شیشی سے پچاس پچاس روپیہ کماتا ہے۔ آہستہ آہستہ اور ادویات کی بھی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب سید محمود شاہ لنڈی کوتل والے اطلاع دیتے ہیں۔ کہ پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدٌ کی قبض کشا گولیاں بنام وت دیپکن جو کہ تقریباً ہر ایک آدمی پر مختلف مزاج پر مفید ثابت ہوئی ہیں۔ دور دور تک پہنچ چکی ہیں۔ جلال آباد تک کے لوگ مانگ کرتے گئے ہیں۔ اور بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ایسے ہی پنڈت جی کی دوائی بواسیرٹ جو کہ خونی بواسیر کے لئے ہے۔ اس کے استعمال سے میری والدہ صاحبہ کی خونی بواسیر کو بہت ہی فائدہ ہوا ہے۔ سارسا رشٹ مرکب کی ایک شیشی دو روپے والی منگوائی تھی جس کو استعمال کرائی ہے۔ نہایت مفید ثابت ہوئی ہے۔ خون صاف کرنے کے واسطے بے نظیر دوائی ہے۔

ہر بیت یعنی دوائی نکسیر دس سال کی مریضہ پر استعمال سے آج تک دورہ نکسیر نہیں ہوا ہے: جو بھی ادویات وقتاً فوقتاً امرت دھارا کارخانہ سے منگوائی جاتی ہیں۔ خدا کے فضل سے تقریباً تمام کی تمام مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ہم پنڈت ٹھاکر دت صاحب شرما ویدٌ مالک امرت دھارا کے بے حد مشکور ہیں۔ جنہوں نے ایسی ایسی مجرب اور آزمودہ ادویات تیار کر کے خلق خدا پر احسان کیا ہے۔ اور جو دوسرے ممالک میں ہندوستان کا نام روشن کرتی ہیں

سب ادویات

منیجر امرت دھارا ۱۳۸ لاہور کے پتہ سے منگوا سکتے ہیں

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۴۲- لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرستِ مضامین

جلد (۲۶)

نمبر (۳)
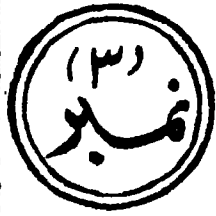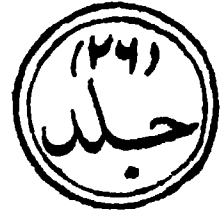
"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۴ء

تصاویر:- (۱) کٹار دھار ہوشیار پور (۲) کوہ شوالک کے جنگلوں کی بُری حالت

چندہ سالانہ صہ مع محصول ششماہی تےمع محصول قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

ہنڈن برگ

مسٹر عطاء اللہ کلیم کا یہ مضمون ہمیں دیر سے موصول ہوا۔ ہنڈن برگ کی موت کا واقعہ ہنوز تازہ ہے اس لئے اس کی اشاعت ہم اسی مہینے جہاں نما کے زیر عنوان مناسب سمجھتے ہیں۔

"آہ! مرنے والے، کتنے خیالاتِ عالی تیرے دماغ سے نکلے تھے، تیری ذات کن جذبات کا مرکز تھی، تو شرافتِ نفس کا نمونہ تھا، وطنِ عزیز اور بادشاہ کی بے غرض خدمت تیرا کام تھا، تیرے بعد جرمنی میں ذہانت اور اخلاق میں تیرا کوئی ہمسر نہیں،"

جن الفاظ میں ہنڈن برگ نے جرمنی کے بہترین سپہ سالار فان مالٹکے فاتح فرانس کی موت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، آج اس کی عظمت خود اس کے متعلق وہی الفاظ ہم سے کہلوا رہی ہے۔ تاریخ میں نپولین اور مالٹکے کے بعد جو درجہ ہنڈن برگ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا، اس نے سپہگری کی تاریخ میں بھی ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جس طرح بیسویں صدی کے آغاز تک تمام سپہ سالار نپولین کے طریق جنگ کی پیروی کرتے رہے ہیں، اسی طرح نئے دور کے جرنیل فوجوں کی نقل و حرکت میں ہنڈن برگ کو اپنا اُستاد مانیں گے، اگرچہ جنگِ عظیم کا نتیجہ جرمنی کے حق میں ہزیمت اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوا لیکن اس سے ہنڈن برگ کی قابلیت پر کوئی حرف نہیں آتا، اس کی شجاعت، بیدار مغزی اور اولوالعزمی کے اوصاف اس کے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں، اس کے عسکری کارنامے اس قدر شاندار اور اہم ہیں کہ انہوں نے اس کی سیاسی سرگرمیوں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، صدرِ جمہوریہ جرمنی کی حیثیت سے اس کی خدمات چنداں حقیر نہیں لیکن آنے والی نسلیں اسے اس کے فوجی کمالات کی وجہ سے یاد کریں گی، اس کا راز اس کی ابتدائی تربیت میں مضمر ہے، اس کی اٹھان ہی اس طرح ہوئی کہ وہ ہر معاملے کو صرف سپاہیانہ نقطۂ نظر ہی سے دیکھ سکتا تھا، اس کی زندگی کا خواہ کسی شعبہ میں مطالعہ کیا جائے اس کی فوجی تعلیم کا اثر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خواہ ہمارا مطمح نظر صدر جمہوریہ جرمنی ہو لیکن ہمیں سپہ سالار ہنڈن برگ کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہئے۔ اس کی حقیقت آگے چل کر کھلے گی۔

۱۸۵۹ء میں پال فان ہنڈن برگ گیارہ برس کی عمر میں حربی مدرسہ میں داخل ہوا، ۱۸۶۵ء میں نصاب تعلیم مکمل کر کے

باقاعدہ فوج میں داخل ہو گیا، ۱۸۶۵ء سے ۱۹۱۱ء تک جب وہ فوجی خدمات سے سبکدوش ہوا، اس نے آسٹریا اور فرانس کی جنگوں میں حصہ لیا لیکن کوئی نمایاں خدمت سرانجام نہ دے سکا، البتہ فوجی تعلیم اور دورانِ ملازمت میں اسے زندگی کے چند ایسے گُر دستیاب ہوئے جن سے یورپ کے مستقبل پر کافی اثر پڑا،

جنگ جرمن قوم کے اخلاق کا لازمی عنصر ہے، جرمنوں کے لئے زندگی ایک جنگ کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسی رنگ میں زندگی کے ہر شعبہ کی تشریح کرتے ہیں، مہذب دُنیا کی نظروں میں جنگ کتنی ہی مذموم کیوں نہ ہو، امن پسند افراد خواہ فوج کو قوم کے لئے ایک غیر ضروری بار سمجھیں، اور معلمانِ اخلاق جنگ کو اضطراری گناہ سے تعبیر کریں لیکن جرمنوں کی نظر میں جنگی تعلیم زندگی کا جزوِ لازمی ہے، ہنڈن برگ اس کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہر وہ شخص جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں اور جو محض ہٹ دھرمی سے فوج کے خلاف زہر نہیں اُگلتا یہ تسلیم کرے گا کہ فوج عزم و عمل کی تربیت کے لئے بہترین جگہ ہے، ہزاروں اشخاص نے اس میں رہ کر ایسی دلی قوت حاصل کی ہے جو تمام عمر ان کے لئے کار آمد ثابت ہوئی، ہماری قومی فوج ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں مساوات اور اتفاق کا عملی سبق دیا جاتا ہے، ہمارے عسکری نظام کا مُدعا یہ ہے کہ خود غرضی اور حبِ ذات کا جو مادہ انسان میں مضمر ہوتا ہے اور جو حکومت اور سماج کو کھوکھلا کر دیتا ہے، اس کا قلع قمع کرے، فوج میں رہ کر فرد کو ذاتی خواہشات پر قابو حاصل کرنے کی مشق ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنے ذاتی مفاد پر ملک و قوم کی اغراض کو ترجیح دینے کا عادی ہو جاتا ہے :

ان دعووں کے امتحان کا وقت آ گیا، جب ۱۹۱۴ء میں جنگ عمومی چھڑ گئی تو ہنڈن برگ کو اپنے فوجی تجربہ سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع ملا، اسے مشرقی محاذ پر روسی حملہ کے دفاع کے لئے مامور کیا گیا، قدرت نے جس گھڑی کے لئے اسے پیدا کیا تھا، وہ آپہنچی قیصر ولیم کی نظرِ انتخاب کی داد دینی چاہیئے جس نے ہنڈن برگ کو اس کام کے لئے چُنا جو اس کے لئے موزوں ترین تھا اور جس کے لئے وہ موزوں ترین تھا، پرانے زمانے میں اس کے آبا جن میدانوں میں صدیوں تک روسیوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے انہی میدانوں میں اسے اپنے قدیم دشمن سے دوچار ہونا پڑا، خود اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی خطہ میں گذرا تھا اور سالانہ مصنوعی جنگوں میں بھی وہ اسی علاقہ میں فوج کی کمان کیا کرتا تھا، ٹینن برگ اور مسوری جھیلوں کی لڑائیوں میں اس نے دو رُوسی فوجوں کو ملیا میٹ کر کے جرمنی کو غیر ملکی دشمن کی لعنت سے پاک کر دیا، ان جنگوں میں اور ان کے بعد جب وہ مغربی محاذ پر مامور کیا گیا، جنگ کے خاتمہ تک جنرل لیوڈنڈارف اس کا رفیق کار اور معاون تھا، اس لئے ہنڈن برگ کے نکتہ چین کہا کرتے ہیں کہ جنگ کی تجویزیں تو لیوڈنڈارف کے دماغ سے نکلتی تھیں لیکن سہرا ہنڈن برگ کے سر رہتا تھا، ہنڈن برگ کی سوانح نگار مس مارگرٹ گولڈسمتھ نے اس بات پر بہت حاشیے چڑھائے ہیں اور اس کی شخصیت کو گھٹانے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس عظیم الشان شخصیت کے کمالات کا اندازہ کرنے سے پہلے اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے، لیوڈنڈارف کی خداداد ذہانت اور اس کے سپاہیانہ ملکہ سے انکار کرنا انصاف کا خون کرنا ہے، ہنڈن برگ نے نہایت فراخدلی سے اس کے گراں قدر مشوروں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے "میں نے بارہا لیوڈنڈارف اور اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کی نوعیت ایک کامیاب شادی کی سی تھی، ایسے معاملے میں ایک تیسرا شخص کس طرح دونوں کے انفرادی اوصاف کا صحیح اندازہ کرسکتا ہے، وہ قولاً اور فعلاً ایک ہوتے ہیں جو بات ایک کہتا ہے وہ دوسرے کی خواہشات اور جذبات کا نتیجہ ہوتی ہے"

جب جرمنی کی شکست کے بعد لیوڈنڈارف اپنے عہدہ سے سبکدوش کیا گیا اور اس کی شہرت اس کے لئے عذابِ جان بن گئی، اس نے اپنے ہموطنوں کے طعنوں کی تاب نہ لاکر مونچھیں منڈادیں اور ہالینڈ چلا گیا، اس وقت بھی ہنڈن برگ نے رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلانِ حق کو اپنا فرض سمجھا اور ان شاندار الفاظ میں اپنے رفیقِ جنگ کا تذکرہ کیا: "ایک دن ایسا ہوگا جب دنیا کے بہترین آدمیوں کی طرح لوگ اس کی قدر بھی کریں گے، اس وقت تمام ملک اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگا، میری دعا ہے کہ جب آزمائش کا وقت آئے تو وطنِ عزیز کو اس جیسا آدمی مل سکے جس کا رواں رواں اس کے کمالِ انسانیت کا گواہ ہو، جو اکیلا لشکروں پر بھاری ہو، اگر کوئی آدمی بھی کسی عظیم کام کے لئے پیدا ہوتا ہے تو لیوڈنڈارف ضرور ایسا شخص تھا۔

اس کے دشمنوں کو اس سے بڑی نفرت تھی! یہ اس لئے کہ وہ اس کی قابلیت سے اچھی طرح واقف تھے"

ہنڈن برگ نے جس طرح لیوڈنڈارف کی دوستی کا حق ادا کیا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے، یہ امر ہمیشہ خوشی سے یاد کیا جائے گا کہ اس نے اپنے رفقائے جنگ سے نباہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، جرمنی کے حلیف اس کے لئے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ثابت ہو رہے تھے لیکن ہنڈن برگ کبھی ان کا بری طرح ذکر نہیں کرتا، آسٹریا جو جنگ کی ابتدا کا ذمہ دار تھا ہر ایک قدم پر جرمنی کا سہارا ڈھونڈتا تھا، بلغاریہ بھی مدافعت اور مجادلت کے لئے جرمنی کا محتاج تھا، اس پر بھی جرمنی کے یہ نامرد حلیف شوخ چشمی اور ڈھٹائی سے بڑھ بڑھ کر مطالبات کرتے تھے اور ان کی جوع الارض ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ صرف ترکی نمائندے طلعت پاشا اور انور پاشا جرمنی کے ساتھ معاملہ کرنے میں فراخدلی اور انصاف سے کام لیتے تھے، ہنڈن برگ ان کی فیاضی اور وفاداری کا بڑا مداح تھا اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا کرتا تھا۔

جرمنی کی شکست اٹل تھی، جنگ کے پہلے مہینوں میں ہی ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کا مقابلہ جن حوصلہ شکن اور زہرہ گداز قوتوں سے ہے وہ اس کی کمر توڑ کر رہیں گی لیکن یہ ہنڈن برگ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کئی بار یہ طاقتیں نیست و نابود ہونے کے قریب پہنچ گئیں، اور اگر حوادث جرمنی کے خلاف نہ ہوتے تو اس کی کوششیں ضرور بار آور ہوتیں۔

لیکن تقدیر نے ساری دنیا کو اس کے مخالفین کی صف میں کھڑا کر دیا اور اسے ناچار ہار ماننی پڑی، ۱۰ر اگست ۱۹۱۸ء کو جرمنی

کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا، فاش، ہیگ اور پرشنگ کے متفقہ اقدام نے جرمنی کی بلکی ماندی فوج کو ایسی زک پہنچائی کہ اس کا پنپنا ناممکن ہو گیا اور ہنڈن برگ نے دیکھا کہ اتحادیوں کی فوج کا مقابلہ اس کی ہمت سے باہر ہے، ناچار جرمنی کو صلح کرنی پڑی۔ اب شکست خوردہ فوج کو صحیح و سالم واپس لے جانا بھی جان جوکھوں کا کام تھا، سپاہ بددل ہو گئی تھی، ملک میں انقلاب برپا ہو گیا تھا، اگر فوج قابو میں نہ رہتی تو جرمنی کی تباہی یقینی تھی مگر ہنڈن برگ نے دل شکستہ سپاہیوں کی ڈھارس بندھائی، ناموسِ وطن اور قومیت کے نام پر ان سے حفظِ امن کی درخواست کی اور انہیں واپس برلن پہنچا کر منتشر کر دیا۔

اس کارنامہ کی اہمیت کا احساس جب ہو گا کہ تاریخ کے بڑے سے بڑے جرنیلوں کے حالات سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ نپولین نے تین شکستیں کھائیں، اول مصر، دوم ماسکو، سوم واٹرلو، ان لڑائیوں کے بعد اس کی فوجوں کا ڈھونڈے سے پتہ نہیں ملتا، نپولین کو شہرت اور فتح اپنے سپاہیوں کی زندگی سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جنگ کا رخ بدلتا دیکھتا تھا تو اپنی فوج کو دشمن کے رحم پر چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا، برخلاف اس کے ہنڈن برگ کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جہاں تک ہو سکے کسی سپاہی کا خون رائگاں نہ جائے، جنگ کی ابتدا سے آخر تک وہ مٹھی بھر فوج سے کثیر التعداد دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اور اس نے مدافعت کا ایسا طریقہ ایجاد کیا کہ چین کی دیوار کے مقابلے میں ہنڈن برگ لائن کا نام رہتی دنیا تک پیش کیا جائے گا۔

ہنڈن برگ کا مقابلہ تقدیر سے تھا جس کے سامنے انسان کی بہترین مساعی بیکار رہیں، لیکن شکست کے بعد بھی وہ دنیا کی نظروں میں سرخرو ہو گیا، کیونکہ ہجوم ناامیدی کے باوجود اس کی سعی پیہم میں فرق نہ آیا اور وہ تاریک ترین لمحوں میں بھی اپنا فرض پوری تندہی سے ادا کرتا رہا، اس نے ہمہ تن فلسفی کانٹ کا یہ مقولہ عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا کہ "ادائے فرض ہی بہترین خوشی ہے" صلح کے بعد بہت سے دردمند جرمن اپنے ملک کی خستہ حالی نہ دیکھ سکے اور ترکِ وطن کر گئے لیکن ہنڈن برگ نے نہایت بے جگری سے مصائب کا مقابلہ کیا اور اپنے وطن کی حالت سدھارنے میں مصروف ہو گیا، اس نے نازک ترین اوقات میں بھی آس نہ چھوڑی، اسے یقین تھا کہ ایک دن جرمن قومیت کی روح پھر بیدار ہو گی، جرمنی کی رگ رگ میں خونِ زندگی دوڑے گا اور وطن پرستوں کی سعی کامیاب ہو گی، اس کا الٹا ہوا تخت پھر قائم ہو گا، وہ دول یورپ میں پھر باعزت جگہ پائے گا۔

ہنڈن برگ کی سیرت دو لفظوں میں ختم ہو سکتی ہے وہ بہترین محب وطن اور کامل ترین جرمن تھا اور وہ مرتے دم تک اپنے قیصر کا وفادار رہا، لیکن اس نے مفادِ وطن کو قیصر کی دوستی پر بھی ترجیح دی اور اس کی دوستی کا علانیہ دم بھرتے ہوئے بھی جمہوریت کے استحکام میں مصروف رہا حتیٰ کہ اس نے اپنی صحت، سکون اور زندگی کو بھی اس کی نذر کر دیا۔

(عطاء اللہ کلیم)

جنگل کی حفاظت

(تصویری مضمون)

تمام مخلوق کا دارومدار نباتات پر ہے۔ جنگل بادرکھیت انسان وحیوان کے لئے زندگی کی کل ضروریات بہم پہنچاتے ہیں۔ جنگل سے عمارت و آرائش کے واسطے لکڑی، ایندھن، کوئلہ، طرح طرح کی جڑی بوٹیاں، پھل، گوند، لاکھ، گھاس پھوس، بانس اور مویشیوں کے لئے چارہ پیدا ہوتا ہے۔ جنگل کی حفاظت کی اہمیت ظاہر ہے۔ انسانی ضروریات کے علاوہ بھی جنگل کا ہونا اور بہت سی وجوہ سے ضروری اور فائدہ مند ہے۔ مثلاً جنگلی علاقے کے دریاؤں اور چشموں میں بارہ مہینے پانی جاری رہتا ہے۔ جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کے قریب کے نچلے میدانی حصے تباہ کن سیلابوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ جنگل میں ہر قسم کے شکار کی پرورش ہوتی رہتی ہے جس سے سینکڑوں آدمیوں کا دل بہلتا ہے۔

جنگل کے برباد ہو جانے سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ بارش میں کمی ہو جاتی ہے۔ پانی کی سطح گر جاتی ہے اور باغوں اور کھیتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ پہاڑی جنگلوں کے برباد ہو جانے سے نہ صرف دولت برباد ہو جاتی ہے بلکہ پہاڑ بھی کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ایسے نالوں کے ذریعہ سے ریت بہ بہ کر نچلے میدانی حصہ کے کھیتوں میں پڑنے لگتی ہے جس سے وہ بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ یہ ریت نہروں اور نالوں کو بھی پاٹ دیتی ہے۔ جنگل کے برباد ہو جانے سے دریاؤں اور چشموں میں پانی کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے موسم سرما میں آبپاشی پوری نہیں ہونے پاتی۔

جنگل کے تباہ ہونے کا آب و ہوا سے کچھ تعلق نہیں بلکہ انسان خود اس کو کاٹ کر مٹا دینے اور نیز آتش زدگی اور چرائی کے ذریعہ سے اس کو برباد کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ جنگل کے قریب کے میدانی حصہ میں کاشتکاری کی کثرت کی وجہ سے یا ایسی پہاڑی ڈھلانوں پر کاشت کرنے سے جن کی مٹی بکھرنے والی ہو جنگل بہت برباد ہوتا ہے۔

آگ زمین کے قدرتی حفاظت کے ذرائع یعنی گھاس پھوس جڑی بوٹی وغیرہ کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اور جب اس کے بعد ننگی زمین پر تیز بارش پڑتی ہے تو یہ سب مٹی کو بہا لے جاتی ہے اور ننگی چٹانیں رہ جاتی ہیں۔ جو پہاڑی علاقہ میں اکثر کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ درختوں اور اُن کی پود کو بھی آگ سے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ جوں جوں جنگل اس طرح سے کم ہوتے جاتے ہیں اُن کی ضمنی

کٹار دھار ہوشیار پور
جنگل برباد ہو جانے کی وجہ سے پہاڑ اس طرح کٹتا جارہا ھے

پیداوار میں بھی کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور ان کے قریب کی آبادی کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ جس کی وجہ سے یہ حصہ اُجڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

بلا کسی انتظام و بندش کے مویشیوں کو چرانا خواہ شاملات میں ہو یا جنگل میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ گھاس کا عین اسی وقت چر جانا جبکہ وہ بڑھنی شروع ہی ہوئی ہو پودوں کو بہت کمزور کر دیتا ہے اور بار بار چرے جانے سے یہ پودے کمزور ہوتے ہوتے آخر کار مر جاتے ہیں اور ان کے بجائے خراب قسم کی گھاس اُگ آتی ہے۔ اس طرح چارہ کی کمی ہوتے ہوتے آخر کار شاملات کا رقبہ گاؤں کے واسطے بالکل ناکافی ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جنگل پر چرائی کا بوجھ زیادہ ہوتے ہوتے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جو حال شاملات کا ہوا تھا وہی حال جنگل کا ہو جاتا ہے۔ مویشیوں کے چرنے کے علاوہ جنگلوں میں چرواہے پہلے شاخیں تراش تراش کر کھلا دیتے ہیں۔ پھر جب شاخیں کم ہو جاتی ہیں تو اُن تھانوں پر سے جو قریب قریب ننگے ہو چکے ہیں درختوں کو بھی کاٹ کر اپنے مویشیوں اور بکریوں کو کھلا دیتے ہیں۔ اس طرح چرائی سے درختوں اور گھاس پھوس کے برباد ہو جانے پر زمین بارش سے کٹ کٹ کر نالوں کی شکل میں تبدیل ہونے لگتی ہے جس سے اس ملک کی دولت کی تباہی ہوتی ہے جب پہاڑی جنگلوں کی اس طرح بربادی ہوتی ہے تو ان نالوں کے ذریعہ سے نیچے کے ملک کی زمین پر ریت کے پڑ جانے سے بہت نقصان ہوتا ہے۔ انبالہ و ہوشیار پور کے ضلع کے چو اس امر کی مثال ہیں۔ انبالہ و ہوشیار پور کے کوہ سوالک کے جنگلوں کی بربادی سے جو ۱۵۵ مواضع کے ہاتھوں سے وقوع میں آئی ہے ایک ہزار سے زاید مواضع کی زمین ریت پڑ جانے سے تباہ ہو گئی ہے۔

یہ بڑی ناانصافی ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے دیہات کے باشندوں کو اپنا پیٹ پالنے کے واسطے جنگل کو اس طرح برباد کرنے دیا جائے اور اس کی وجہ سے سینکڑوں بڑے بڑے مواضع کی زمین کو نقصان پہنچے۔

کسی ملک کے جنگل برباد ہو جانے سے اسکی کاشت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے یہی نہیں بلکہ اُس کی ترقی اور تہذیب پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ یونیریا میں جنگل کی تباہی کی وجہ سے حالت اتنی بدل گئی کہ باوجود زمین کی زرخیزی کے انگور کی کاشت جو پہلے بہت زیادہ ہوتی تھی بالکل فنا ہو گئی پھر زراعت تباہ ہو گئی اور آخر کار چراگاہ بھی نہ رہی۔

قانون حقوق کا منشا یہ ہے کہ حقوق اس طریقے سے نہ حاصل کئے جائیں جس سے حقوق ہی مٹ جائیں یا کسی دوسرے کی ملکیت کو نقصان پہنچے۔ پس یہ لازم ہے کہ:-

(۱) شاملات میں چرائی خاص نظام کے ماتحت کی جائے۔

(۲) جنگلوں کی حفاظت کی جائے اور اُن میں چرائی کا صحیح بندوبست ہو۔

(۳) اُن زمینوں کو جو ریت پڑ جانے سے تباہ و برباد ہو گئی ہیں اور اُن پہاڑوں کو جو جنگل کے برباد ہو جانے سے ویران چٹان بن گئے ہیں از سرِ نو جنگل لگا کر کارآمد اور آباد کیا جائے۔

منظور احمد سگھنی

جمہوریت

جمہوریت کی مشہور ترین تعریف ابراہیم لنکن کے وہ الفاظ ہیں۔ جو اس نے اپنی گیٹس برگ والی تقریر کے دوران میں کہے۔ یعنی عامۃ الناس کی حکومت۔ جو عامۃ الناس کے ذریعے سے عامۃ الناس کے فائدے کے لئے کی جائے۔ اس تعریف کے تین حصے ہیں:۔

اوّل۔ عامۃ الناس کی حکومت۔ یعنی یہ کہ سیاسی قوت نظام سیاسی کے کسی خاص فرقے یا گروہ یا فردِ واحد پر محدود نہ ہو۔ بلکہ اسے اس قوم یا آبادی کا حق سمجھا جائے جو نظام سیاسی سے متعلق ہو۔ اس عقیدے کی ابتدا دورِ حاضر میں مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے کی۔

دوم۔ عامۃ الناس کے ذریعے سے۔ یعنی ہر فرد کو ذاتی طور پر دوسروں کی نمایندگی کرنے کا یا دوسری صورت میں کسی اور نمایندے کے حق میں یا اس کے خلاف رائے دینے کا اختیار ہو۔ اگر کسی نظام سیاسی میں کوئی فرقہ اس حق سے محروم کر دیا جائے تو اسے جمہوری نظام نہیں کہا جا سکتا۔ خواہ یہ محرومی تھوڑے عرصے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ ایک دو باتوں کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔

اوّل۔ موجودہ حالات میں چونکہ اکثر حکومتوں کی بنیاد جغرافیائی اور نسلی خصوصیات پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے غیر ملکی باشندوں پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ یہ امتیاز درست ہو یا نہ ہو۔ موجودہ حالات میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

دوم۔ نابالغ یا مخبوط الحواس افراد کو سیاسی حقوق سے محروم کر دینا چاہئے۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔

میرے خیال میں ان دو باتوں کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی فرد کو سیاسی حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہو۔ اگر ہم لوگ اپنی مشرقیت کے زور میں یہ کہیں کہ عورتیں ناقص العقل اور مخبوط الحواس ہیں۔ انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دو۔ تو یہ بات خالص جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے ناقابلِ قبول ہوگی۔ یا ایسے ہی اگر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی جائیں اور آمدنی کا ایک خاص معیار مقرر کر کے جو لوگ اس معیار سے نیچے ہوں انہیں سیاسی حقوق سے محروم کر دیا جائے تو یہ بات بھی اسی نقطۂ نگاہ سے نادرست معلوم ہوتی ہے۔

سوم۔ عامۃ الناس کے فائدے کے لئے۔ ہر ایک جمہوری حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنی توجہ اور اپنے روپے کو ایسے کاموں پر صرف کرے۔ جن سے اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ آبادی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ متصور ہو۔ یعنی ان کے اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

لنکن کی تعریف "جمہوریت" کا ایک دُھندلا سا خاکہ ہے۔ اس میں نظامِ جمہوری کی عملی خصوصیات سے بحث نہیں کی گئی۔ مثلاً

قانونی مجالس۔ دستور اساسی۔ حلقہ ہائے انتخاب وغیرہ جن کے بغیر جمہوریت سوائے ایک خیالِ خام کے اور کچھ نہیں۔ خالص جمہوری نقطۂ نظر کا تقاضا تو یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کی رائے ہر معاملے میں لی جائے۔ مگر چونکہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستوں مثلاً سوئٹزرلینڈ میں بھی اس اصول پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عملی طور پر جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے ہر فرد کو قوم کی نمائندگی کی کوشش کرنے کا یا کسی اور اُمیدوار کے حق میں رائے دینے کا اختیار دیا جائے۔ جو نمائندے اس طریق سے منتخب کئے جاتے ہیں وہ انتخاب کے بعد بڑی حد تک اپنے حلقۂ انتخاب سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ان کی رائے ہر معاملے میں ان کے حلقۂ انتخاب کی اکثریت کی رائے کے مطابق ہو۔ یہ درست ہے کہ بعض اوقات ایک آدھ نمائندہ اپنے حلقۂ انتخاب سے کسی مسئلے پر استصوابِ رائے کر لیتا ہے۔ یا کبھی کبھی کسی اہم مسئلے پر ملک کے سب رائے دہندوں کی رائے لی جاتی ہے (اسے انگریزی میں Referendum کہتے ہیں) مگر اس سے جمہوریت کے عام حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک قانون ساز مجلس اپنی اکثریت کے ذریعے سے ایک قانون پاس کر دیتی ہے اور بعد میں اگر یہ خیال ہو کہ ملک کے کسی حصے میں اس قانون سے اتفاق نہیں کیا جائے گا تو پروپیگنڈا کر کے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ جادو چل جاتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ 'جمہوریت' کی عملی صورتوں میں بجائے اس کے کہ انتخابی حلقوں کی حکومت ان کے نمائندوں پر ہو زیادہ تر نمائندوں کی حکومت انتخابی حلقوں پر ہوتی ہے۔

اور جمہوری حکومتوں کے عام شہریوں کا یہ احساس کہ ہم حکومت کے حصہ دار ہیں بڑی حد تک ایک دھوکا ہے اور اسی دھوکے کا نام جمہوریت ہے۔ آج کل کے اکثر جمہوری لیڈروں اور پُرانے زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں میں فرق یہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے رعایا کے سامنے تقریریں کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور آج کل تقریروں کے بغیر کام نہیں نکل سکتا۔ یہ فرق معمولی ہو یا غیر معمولی اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ تقریر بازی جمہوریت کا بنیادی اصول ہے اور ہر جمہوری لیڈر کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں صحیح طور پر یا غلط طور پر یہ خیال پیدا کر دے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری مرضی سے ہو رہا ہے۔

'جمہوریت' کا تصور یہ ہے کہ سیاسی قوت کو جہاں تک ہو سکے تقسیم کر دیا جائے اس کی عملی صورت خواہ کچھ ہی ہو۔ ہر ایک جمہوری حکومت کا نظام اسی اصول پر مبنی ہوتا ہے اور ہونا چاہئے۔ ہر ایک قانون ساز مجلس میں مختلف الخیال گروہوں کا وجود لازم ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی مسئلے کے ہر ایک پہلو پر غور نہیں ہو سکتا۔ پھر جو گروہ برسر حکومت ہو اس کے لئے لازم ہے کہ چیدہ افراد کو مختلف چھوٹے گروہوں یعنی سب کمیٹیوں میں تقسیم کرے جن کو مختلف شعبوں کا کام سپرد ہو۔ قبل اس کے کہ کوئی قانون وضع کیا جائے ضروری ہے کہ مجلس قانون ساز میں اس کے مختلف پہلوؤں پر زیادہ سے زیادہ غور کیا جائے۔ اور اس کے قانون بننے کی راہ میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں پیدا کی جائیں مثلاً انگلستان کی پارلیمنٹ میں جو مسودۂ قانون پیش ہوتا ہے اس پر سب سے پہلے دارالعوام یعنی ہاؤس آف کامنز

میں بحث ہوتی ہے۔ پھر اگر اکثریت کی رائے ہو تو معاملہ ایک سب کمیٹی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جو اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس کے متعلق کچھ سفارشات پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد مسوّدے میں پارلیمنٹ کی رائے سے مناسب ترمیم ہوتی ہے اور اسے اجلاس میں تین مرتبہ پڑھا' یا پاس کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ قانون دارالامرا یعنی ہاؤس آف لارڈز کے سامنے پیش ہوتا ہے اور وہاں بھی اسی طرح تین دفعہ پڑھا جاتا ہے۔ جب تک یہ سب مرحلے طے نہ ہو چکیں۔ اس پر بادشاہ کے دستخط نہیں ہوتے۔ اور اسے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

"جمہوریت' اکثریتوں کی حکومت ہے۔ ہر ایک انتخاب پر ہر ایک قانون ساز مجلس میں ہر ایک سب کمیٹی میں ہر معاملے کا فیصلہ اکثریت سے ہوتا ہے۔ اور اقلیت کو یہ فیصلہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کسی جمہوری حکومت کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اکثریتوں اور اقلیتوں کی کشمکش آئینی حدود سے باہر نہ نکلے یعنی جو گروہ ایک دوسرے کے مدِمقابل ہوں وہ قانون ساز مجلس میں زیادہ سے زیادہ رائیں اپنے لئے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک دوسرے کی مخالفت کے سلسلے میں ملک میں بدنظمی یا انقلاب پیدا کرنے اور ایک دوسرے کی آزادیٔ رائے کو سلب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اپنے خیالات کو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں حلقہ ہائے انتخاب میں پھیلائیں اور اس کے نتیجے کا آئندہ انتخاب تک انتظار کریں۔ یہ بات جبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ قوم کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کی رائے کو عزت کی نظر سے دیکھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور اس کی وجہ سے قوم میں ایک سیاسی توازن پیدا ہو جائے۔ جس میں انقلابی تحریکات اور غیر آئینی جدوجہد کی گنجائش نہ ہو۔

اس توازن کو پیدا کرنے کے لئے اچھے معلّموں کی ضرورت ہے۔ جو قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو اُن کی ذمّہ داری کے لئے تیار کر سکیں۔ قبل اس کے کہ کوئی قوم جمہوریت کا خیال دل میں لائے اور اسے نباہ سکے۔ لازم ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھ میں تعلیمی نظم و نسق ہے صحیح دماغ اور صحیح احساس کے لوگ ہوں۔ اس امر کو جتنی اہمیت بھی دی جائے کم ہے۔ پُرانے زمانے کے شاہزادوں کو بھی اچھے اتالیقوں کی ضرورت تھی۔ مگر ایک اچھے اتالیق کے باوجود بھی ان میں سے اکثر کورے رہتے تھے۔ قوموں کے متعلق یہ بات صحیح نہیں۔ اگر معلّم اچھے ہوں تو قوم کے ایک معقول حصّے پر ان کا ضرور اثر ہوگا۔ کیونکہ سب لوگ غبی اور نالائق نہیں ہو سکتے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انگلستان کا سیاسی توازن وہاں کی یونیورسٹیوں اور پبلک سکولوں کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر یہ تعلیمی مرکز صحیح خیالات اور صحیح تربیت کے حامل نہ ہوتے تو آج جمہوریت کو انگلستان میں وہ شاندار کامیابی نہ ہوتی جو ہے۔ اب تک جو نقائص نظامِ جمہوری میں موجود ہیں۔ ان کا علاج تعلیم کے سوا کچھ نہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ ان نقائص میں سے اکثر ایسے ہیں۔ جو انسانی طبیعت کی خصوصیات سے وابستہ ہیں مگر تعلیم فطرتِ انسانی کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور بدل دیتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عامۃ النّاس کو خواہ کتنی ہی تعلیم دی جائے اِن میں بڑے بڑے سیاسی مسائل کو سوچنے اور سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہو سکتی اور انہیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں آ کر ایک خاص رائے دینے اور تقریر باز لیڈروں کے ذریعے سے ورغلائے جانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ کم از کم اتنا تو ضرور ہے کہ تعلیم کے ذریعے سے اِن

نقائص کو بتدریج کم کیا جاسکتا ہے۔

اب اگر جمہوریت کے عملی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو چند اہم حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ جمہوریت بظاہر اکثریتوں کی حکومت ہے لیکن اصل میں قوت چند افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ بہترین قسم کے افراد ہوں۔ اس کا مشاہدہ خصوصاً اس وقت کیا جاسکتا ہے۔ جب کسی مسئلے پر دو مخالف گروہوں کے رائوں کا فرق قلیل ہو۔ مثلاً باؤن رائیں ایک طرف ہوں اور اڑتالیس دوسری طرف۔ یہاں فیصلہ صرف چار رائوں کی کثرت سے ہوگا۔ اور یہ رائیں غالباً ایسے لوگوں کی ہونگی جو خود کوئی رائے نہیں رکھتے اور مصلحت کی وجہ سے یا لاعلمی کی وجہ سے اِدھر یا اُدھر رائے دے دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سارے کے سارے جمہوری نظام کی باگ چند آدمیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو اپنی شخصیت کی وجہ سے دوسروں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے ۔ یا ایسے جوڑ توڑ جانتے ہیں کہ کبھی اور کو ان کے مقابلے میں قوت میسر نہیں ہوتی اور بار بار وہی لوگ برسرِ اقتدار آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈسریلی اور گلیڈسٹون دونوں چار مرتبہ وزیر اعظم انگلستان ہوئے۔ موسیو بری آں گیارہ مرتبہ فرانس کے وزیر اعظم بنے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ایک اور قباحت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری نظام کے ذریعے سے برسرِ اقتدار آتے ہیں وہ دماغی قابلیت یا طبیعت کی لطافت کے لحاظ سے قوم کے بہترین افراد نہیں کہے جاسکتے۔ جمہوریت بہترین افراد کی قدر کرنے سے قاصر ہے۔ وہ ان آدمیوں کو چاہتی ہے جو دوم درجہ کی قابلیت رکھتے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر شیکسپیئر اور گوئٹے یا نیوٹن آج کسی جمہوری حلقۂ انتخاب کی طرف سے اُمیدوار ہوتے تو کبھی منتخب نہ ہوتے۔ مسٹر بونرلا کے بعد لارڈ کرزن کی بجائے مسٹر بالڈون کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ لارڈ کرزن کی قابلیت مسلمہ تھی مگر لوگ انہیں نہیں چاہتے تھے۔

"جمہوریت" کو فنونِ لطیفہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یورپ میں فنونِ لطیفہ نے جو ترقی پندرھویں اور سولھویں صدی کے بادشاہوں، پاپاؤں اور رئیسوں کی مربیانہ توجہ کے زیر اثر کی اس کا عشرِ عشیر بھی آج جمہوری ملکوں میں نہیں دیکھا جاتا۔ امریکہ کی مثال زبان زد ہے۔ لیکن اور ریاستوں کی بھی یہی حالت ہے۔ سوائے فرانس کے دُنیا کے کسی اور ملک میں فنونِ لطیفہ کا کوئی محکمہ نہیں ہے اور فرانس میں بھی اس محکمے کا کام زیادہ تر پرانے شاہکاروں کی حفاظت کرنا ہے۔ مگر فنونِ لطیفہ کو بہت زیادہ اہمیت دینا غلطی ہے۔ کیونکہ اگر جمہوریت کو ان فنون سے لگاؤ نہیں تو سائنس سے یقیناً گہرا تعلق ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو سائنس خود حقائق کی جمہوریت کا نام ہے۔ سائنس کی کوئی حقیقت قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ جب تک اس کی تصدیق ان لوگوں کے مشاہدے سے جو مشاہدے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ نہ ہوسکے۔ سائنس کے لئے آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی ضرورت ہے اور یہ بات بہترین طور پر جمہوری فضا میں میسر آسکتی ہے۔ آئن سٹائن کا خیال ہے کہ جن ملکوں میں آج کل مختارانِ مطلق یعنی ڈکٹیٹروں کی حکومت ہے وہاں سائنس کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ میرے خیال میں یہ خطرہ سب سے زیادہ ان سائنسوں کو ہے جن کا موضوع انسان ہے۔

مثلاً اگر آج کوئی جرمن سائنسدان اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ کہے کہ یہودیوں کا دماغ جرمنوں سے اچھا ہے تو یقیناً جرمنی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ سائنس اور جمہوریت کے باہمی تعلق پر بہت زیادہ زور دینا بھی درست نہیں کیونکہ امریکہ جیسے جمہوری ملک میں نظریۂ ارتقا کی تعلیم پر جتنی پابندیاں عائد کی جاچکی ہیں اور کہیں نہیں کی گئیں۔

جمہوری طرزِ حکومت جس کی بنیاد تقسیمِ قوت پر ہو اور جس کا اصول نئے قانونوں کے بننے میں رکاوٹیں پیدا کرنا ہو۔ حالتِ جنگ میں یا ایسے وقت میں جب قوم کسی نازک صورتِ حالات سے گزر رہی ہو، کبھی اپنے عام رنگ میں قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسے موقع پر سیاسی قوت کو پراگندہ کرنے کی بجائے ایک دو آدمیوں کے ہاتھوں میں جمع کر دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں تمام جمہوری ممالک کے وزرا مختارِ کل تھے۔ اور اکثر کوئی خاص فیصلہ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ سے پوچھنے کے پابند نہیں تھے۔ اس سے قطع نظر کرکے بھی دیکھا جائے تو جمہوری طرزِ حکومت ان ملکوں کے لئے جو تہذیب کی دوڑ میں پیچھے ہیں، بہت موزوں نہیں۔ ایسے وقتوں میں ملک کی سیاسی قسمت ایک آدھ مضبوط آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ مثلاً جنگِ عظیم کے بعد اگر ٹرکی میں خالص جمہوری نظام قائم ہوجاتا اور آبادی کے کسی طبقے پر کوئی پابندی نہ ہوتی تو یقیناً ٹرکی کی حالت وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔ اگرچہ بحوالہ خالدہ ادیب خانم کمال پاشا کا یہ قول کہ قوت تقسیم نہیں ہوسکتی۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا مگر اس میں شک نہیں کہ جو کام اس نے کیا ہے وہ ایک جمہوری حکومت سے اتنے عرصے میں اس کامیابی کے ساتھ نہ ہوسکتا۔

آج کل دنیا کے مختلف ممالک میں مختارانِ مطلق کی حکومت ہے۔ جرمنی، آسٹریا، اٹلی، پولینڈ، ہنگری، ٹرکی، روس سب ان لوگوں کے زیرِ اثر ہیں۔ اور آج کل تو امریکہ کے صدر روزولٹ کا نام بھی اسی فہرست میں ہونا چاہئے۔ اس حکومت سے ان ممالک کو ایک حد تک ضرور فائدہ ہوا ہے۔ اور ان کی بین الاقوامی حیثیت بہتر ہوگئی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایسی حکومت کا فائدہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکومت عارضی ہو۔ اگر اسے دائمی طریقِ حکومت بنانے کی کوشش کی جائے تو نتائج اچھے نہیں ہوسکتے۔

اوّل تو مختارِ مطلق یا ڈکٹیٹر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جسے سب سے پہلے اپنی عظمت کی تمنا ہوتی ہے اور اس کے بعد کسی اور چیز کی۔

دوسرے مختارِ مطلق کی حکومت سے قوم کے افراد کی شخصیت محو ہوجاتی ہے اور وہ محض ایک مشین کے پرزے دکھائی دیتے ہیں جو انسانیت کی معراجِ کمال نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ جو لوگ مختارِ مطلق سے اختلافِ رائے رکھتے ہیں اُن کو اپنے ملک کے باہر پناہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ مثلاً روس جرمنی اور اٹلی کے حالات۔

چوتھے مختارِ مطلق کی حکومت کے بعد ملک میں وہ سیاسی توازن باقی نہیں رہتا جو کسی قوم کے ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے لئے ضروری

ہے سپین کی مثال لیجئے۔ جنرل پرائمو ریویرا کے عہد کے بعد ملک اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور انقلاب برپا ہو گیا جس سے کوئی مستقل صورت حالات پیدا ہونے کی فی الحال توقع نہیں۔

جمہوری نظامِ حکومت پر شاید ایک اعتراض یہ بھی کیا جائے کہ اس کے انصرام میں ملک پر نسبتاً بہت زیادہ مصارف کا بار پڑتا ہے۔ مگر جب تک اس کے ثبوت میں کافی اعداد و شمار بہم نہ پہنچائے جائیں۔ اس مسئلے پر صحیح اور قطعی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے۔ کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ قدیم شاہی طرزِ حکومت میں ملک کو اُتنے ہی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا تھا جتنا آج کل کی جمہوری حکومتوں کو ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ بادشاہ جو اس قدیم نظامِ حکومت کا مرکز ہوتا تھا وہ اپنی کارکردگی کی اُجرت ضرورت سے بہت زیادہ وصول کرتا تھا۔

اس مضمون میں جمہوری نظامِ حکومت پر دونوں پہلوؤں سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اُمید ہے کہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اس نظام کی خوبیاں اس کے نقائص کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

اختیارِ مطلق سیاسی ادارات کی نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہے لیکن اگر اقوامِ عالم کے تاریخی ارتقا پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہو گا کہ چند پسماندہ ملکوں کے علاوہ دُنیا بڑی حد تک اس منزل سے آگے نکل چکی ہے جس میں سیاسی نظم و نسق کے لئے کسی فردِ واحد کی رہنمائی کی ضرورت ہو۔ اگر انسان بحیثیت فرد کے کوئی آخری اور انتہائی قیمت رکھتا ہے تو باوجود اس کے کہ اس کی عقلی سطح چند خاص افراد سے پست ہو یہ ضروری ہے کہ اسے جماعت کا محض ایک رُکن ہونے کی وجہ سے جماعت کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں دخل حاصل ہو اگرچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمے آید

لیکن عرض یہ ہے کہ اوّل تو ان دو صد خروں کو اگر مسلسل طور پر تعلیم دی جائے تو ان کی ذہنی سطح کا "حماریت" کے درجہ سے بلند ہو جانا ایک حد تک ممکن ہے۔ اس کے علاوہ "پختہ کار" کے دل میں نفس پرستی کا جذبہ اگر غالب ہو جائے تو وہ سارے سیاسی نظام کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں رائے دہندوں کا تعلیم یافتہ اور صحیح الدماغ ہونا جمہوریت کی کامیابی کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور اگر یہ شرط پوری کر دی جائے تو فردوسی کا یہ شعر بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ؎

شنیدم ز دانا کہ دانش بسے است
و لیکن پراگندہ با ہر کسے است

ممتاز حسن

گریۂ مسرّت

آج تڑکے، الحفیظ والاماں
دوستو! عثمان[۱] ساگر کا سماں

دیدنی تھی نرم پودوں کی لچک
بدلیاں چھائی ہوئی تھیں دُور تک

ظلمتیں تھیں نور سے گرمِ ستیز
ولولوں پر تھی ہوائے تُندوتیز

سامنے تھیں پتھروں کی حسرتیں
نرم ونازک جھاڑیوں کی شکل میں

جزرومد میں تھی بفرطِ اضطراب
ساغرِ عثمان ساگر کی شراب

روحِ طوفاں دربغل، کف در دہاں
لو سنو! کس طرح تھیں موجیں رواں

جھاگ اُڑاتی، پھاندتی، اُڑتی ہوئی
کپکپاتی، لوٹتی، مُڑتی ہوئی

چُلبلی، اُبھری ہوئی، نکھری ہوئی
چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی

بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی
دمبدم آتی ہوئی جاتی ہوئی

اِس طرف سے اُس طرف ہوتی ہوئی
پتھروں کو چھانٹتی دھوتی ہوئی

گِرتی پڑتی مست سُر دُھنتی ہوئی
مرتعش قالین سا بُنتی ہوئی

[۱] حیدرآباد کا روح پرور تالاب

زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی
اُٹھ کے بڑھتی، گِر کے چکراتی ہوئی

گنگناتی صف بصف آتی ہوئی
لڑتی بھڑتی، گونجتی، گاتی ہوئی

مچھلیوں کو درسِ غم دیتی ہوئی
ہچکیوں پر ہچکیاں لیتی ہوئی

ساحلِ رنگیں سے ٹکراتی ہوئی
اینڈتی، اِٹھلاتی، بل کھاتی ہوئی

دمبدم ہنستی ہوئی روتی ہوئی
ملتی، کتراتی، جُدا ہوتی ہوئی

جابجا دلدل میں کاجل پارتی
چوکڑی بھرتی، چھلانگیں مارتی

پَے بہ پَے غاروں کے اندر گھومتی
ناچتی، حلقے بناتی، جھومتی

بلبلاتی، بھاگتی، مُنہ موڑتی
مُڑ کے پھر ساحل پہ سر کو توڑتی

گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی
دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی

یہ سماں تھا اور اِک رنگیں پرند
رُوح شاعر کی طرح بے قید و بند

بیخودی کے جام چھلکاتا ہُوا
گذرا میرے پاس سے گاتا ہُوا

نغمہ سُنکر اس قدر دل خوش ہُوا
ہچکیاں لے لے کے مَیں رونے لگا

(جوشؔ ملیح آبادی)

خُدا کی دین

(۱)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور منظفر آباد کا شہر اس کی خوفناک تاریکی اور خموشی میں بے خبر سویا ہوا تھا۔ تاریخ کی رو سے چاند کو چاہیے تھا کہ اپنی روشنی سے اس سوتی ہوئی دنیا کو منور کرتا لیکن وہ بادلوں کی یورش میں روپوش ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کی تیز اور خیرہ کُن چمک اس تاریکی کا اور بادلوں کی کڑک اس خموشی کا سینہ چاک کرتی ہوئی فضا میں گم ہو جاتی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی لیکن اس طرح بند جیسے کسی غضب ناک وحشی کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو، جیسے طوفان نے کسی مجبوری سے اپنے سانس کو سینے میں روک لیا ہو کہ ذرا سی چھیڑ ملی تو ابھی آفت برپا ہو جائے گی۔ رات کے دو بجے کا عمل ہو گا یعنی وہ وقت جب دُنیا دار اپنی تگ و دَو سے، اپنی ناکام کوششوں سے تھک کر نیند کی آغوش میں پناہ گزیں ہوتے ہیں اور صبح خیز پجاری اور تہجد گزار عابد کی جبین نیاز تک بیدار نہیں ہوتی۔ جب سارا سنسار سوتا ہے اور صرف رات کا چوکیدار اور شب بیدار چور اپنے اپنے کام میں مشغول اس اندھیر نگری میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔

اس ہُو کے عالم میں ایک شخص بہت ہوشیاری کے ساتھ درختوں اور دیواروں کی آڑ لیتا، کسی دھن میں لگا چلا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں اس کی صورت دیکھنا ممکن نہیں لیکن اگر روشنی بھی ہوتی تو اس کے چہرے کی زیارت نہ ہو سکتی کیونکہ ایک دفعہ بجلی کوندی تو صرف اتنا دکھائی دیا کہ اس نے اپنے سر پر ایک بڑی سی پگڑی لپیٹ رکھی ہے اور اس پر غالباً ایک ٹاٹ کی بوری اس طرح ڈال لی ہے کہ اس کا چہرہ بالکل چھپ گیا ہے۔ وہ دبے پاؤں مگر بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا اور بار بار ٹھیر کر اِدھر اُدھر نظر ڈال لیتا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ پتہ بھی کھڑکتا تو وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا لیکن پھر اطمینان کر کے تیزی کے ساتھ آگے روانہ ہو جاتا۔ اس طرح کئی گلیوں اور بازاروں میں سے ہوتا ہوا، شہر کے زیادہ آباد حصّے میں سے گزر کر وہ ایک ایسے حصّے میں پہنچا جہاں کشادہ اور فراخ باغوں میں خوشنما اور عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں جن میں سے چند دو منزلہ تھیں اور باقی تین یا چار منزلوں کی۔ اس نے بہت احتیاط سے مکانوں کا جائزہ لیا اور ایک سہ منزلہ مکان کو پہچان کر اس کے احاطے میں داخل ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کی پشت پر جا پہنچا اور بلی کی سی چستی اور مستعدی سے اینٹوں کی نوکوں پر پاؤں کی انگلیاں جماتا ہوا اوپر چڑھ گیا اور چھت پر پہنچتے ہی منڈیر کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تاکہ رات کے اُلو تک کی نظر سے محفوظ رہے۔ اس کا دِل دھڑک رہا

تھا، خوف سے زیادہ اس محنت کی وجہ سے جو اس نے سانس روک کر چھت پر چڑھنے میں کی تھی جس طرح گھوڑا کان کھڑے کر کے آوازوں کو سنتا ہے اسی طرح کان لگا کر اس نے اپنے گرد و پیش کی خاموشی کو سُنا اور اس میں اسے بہت سی وہ آوازیں سنائی دیں جو رات کے وقت فطرت کے عضو عضو سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ان میں ایسی ہم آہنگی اور تسلسل پیدا ہوتا ہے کہ وہ خموشی کو نہیں توڑتیں۔ لیکن ان میں بظاہر کوئی اندیشہ پیدا کرنے والی آواز نہ تھی لہذا مطمئن ہو کر وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ مکان کی دوسری منزل پر تھا جہاں ہر طرف تاریکی اور خاموشی طاری تھی۔ وہ آگے کی طرف بڑھا کہ اسے اس ہنگامہ بھرے سکوت میں ایک ایسی دھیمی آواز سنائی دی جو دوسری تمام آوازوں سے مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کے گانے کی آواز ہو جو دور سے بند دروازوں میں سے آ رہی تھی، ایسی ہلکی، ایسی نرم جیسے چاندی کی کٹوریوں میں پانی کی باریک پھوار پڑ رہی ہو۔ کبھی کبھی آواز بند ہو جاتی اور اس کے بجائے آواز سے بھی زیادہ دھیمی گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دیتی تھی۔

دو تین روز کا فاقہ زدہ چور جو جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چوری کرنے آیا ہو، اسے کیا کرنا چاہئے تھا؛ عقل اور مصلحت اور منطق کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا لیکن اچھے سمجھدار آدمی بھی منطق کے اصول پر کام نہیں کرتے اور بے چارہ جمّن تو ایک دنیا کا دھتکارا ہوا، جاہل، نیم وحشی شخص تھا۔ اسے یہ کرید پیدا ہوئی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ اس نے دبے پاؤں چھت کا چکر لگایا معلوم ہوا اس سے اوپر کی منزل پر کسی کمرے میں سے ایسی آواز آ رہی ہے جیسے ناچ اور گانا ہو رہا ہو۔ بہت آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچا۔ وہاں صرف دو بڑے بڑے کمرے تھے جن میں سے ایک خالی اور تاریک تھا اور دوسرا بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں اسے یہ اندیشہ ہوا کہ شاید کسی کی نظر پڑ جائے۔ اس لئے اس نے پھر ہمت کی اور خالی کمرے کی چھت پر چڑھا اور روشن دان میں سے جھانک کر اس کمرے کے اندر نظر ڈالی جہاں محفلِ رقص و سرود گرم تھی۔ نظر ڈالی اور یہ سماں دیکھا۔

(۲)

ایک خوبصورت، فراخ کمرے میں نہایت صاف سفید فرش اور اس پر جا بجا مناسب فاصلہ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خوش رنگ قالین بچھے تھے۔ دروازوں پر سفید کامدار پردے پڑے تھے اور کھڑکیوں پر ایک سفید جالی۔ مشرقی وضع کے فانوسوں میں نہایت کاریگری کے ساتھ بجلی کے قمقمے لگے تھے جن کی روشنی ہونٹے اور منقش شیشوں میں سے گزر کر کمرے کو اس طرح روشن کئے ہوئے تھی کہ آنکھوں کو خیرہ نہ کرے۔ کارچوبی گاؤ تکیوں کے سہارے پندرہ بیس آدمی قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے ہر ایک کے سامنے چھوٹی چھوٹی نقشیں میزیں لگی ہوئی تھیں جن پر چاندی کی طشتریوں اور گلاسوں میں کھانے پینے کی مختلف چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ایک طرف چاندی کے خوبصورت پیک دان رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ کمرے کی دیواروں کے برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے اور بیچ کی جگہ خالی تھی جہاں۔۔

۔۔۔ ایک فتنۂ دوراں، ایک رہزنِ عقل و ایماں سفید، ملائم ساری میں ملبوس، اپنے سیاہ بالوں میں موتیوں کا ایک ہار لپیٹے

قامت میں دل فریبی سروِ چمن نژاد — سروِ چمن میں دولتِ بستاں لئے ہوئے

ج رہی تھی۔ اس کے قدموں کی ہر ٹھوکر پر حاضرین کے دل پامال تھے اور ان کی حرکت بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے رقص کی ہوا میں ج تھا، ترنم تھی، جادو تھا جس کا اندازہ ان لوگوں کے چہروں سے ہوتا تھا جو آنکھیں کھولے اس کو اس طرح بے اختیار دیکھ رہے ے گویا جسم کی تمام قوت سمٹ کر آنکھوں میں آگئی ہو۔ ایک صاحب اپنی سیاہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور اس کے قدم کی جھنکار پر اپنے سر کو اس زور سے جنبش دیتے تھے جیسے کسی چھپے ہوئے ہاتھ نے اس کو زور سے جھٹکا دیا ہو۔ ایک صاحبزادے نے اد دینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کو بڑھایا تھا لیکن عالمِ بےخودی میں ہاتھ اسی طرح رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رقاصہ کے سامنے دستِ سوال دراز کیا ہے۔ ایک تیسرے صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے ایک طرح کا ساکن رقص کر رہے تھے یعنی ان کی حرکات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جسم اٹھ کر رقص کرنا چاہتا ہے لیکن اس بدہوشی کے عالم میں بھی آدابِ محفل کا احساس مانع ہے۔ ہر شخص ایک علیحدہ کیفیت طاری تھی اور وہ حسین متحرک اپنے اثر سے بےخبر اپنے رقص میں کھوئی ہوئی ناچ رہی تھی ناچے جا رہی تھی . . .

جمن نے یہ طلعتِ نیلہ کا سا سماں دیکھا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک آوارہ، بے خانماں ہوتا زمانہ ہوا پورے جس کو کبھی روٹی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا جس نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے فطرت کا یہ کھیل کھیلا ہے۔ اس نے کبھی خواب میں بھی عیش و عشرت کا یہ سامان، یہ دولتِ فراواں نہ دیکھی تھی، نہ ایسا بے پناہ حسن جس نے اپنی انتہائی سادگی اور بےخودی کی کیفیت میں اس کے مجرم اور بےحس دل کو بھی اسی طرح تہ و بالا کر دیا تھا جس طرح ان عیش نصیب لوگوں کو جو کمرے میں آرام سے بیٹھے اس نظارۂ جمال سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی مبہوت اور بےتاب نظریں کبھی پانوں کی خوشنما طشتریوں پر پڑتیں جن میں قسم قسم کی مٹھائیاں اور پھل اس کی بھوک کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ کبھی اس ایوانِ دولت کے ساز و سامان کا جائزہ لیتیں جن کی قیمت کا اندازہ اس کے محدود اور ناکارہ تخیل کی حدود سے باہر تھا۔ اور پھر پلٹ پلٹ کر رہ رہ کر اس کی بھوکی اور بےتاب نظریں اس حسینہ کے چہرے پر گڑ جاتیں جو اپنے دونوں مرمریں بازوؤں کو سر سے بلند کئے جسم کو لچکاتی ہوئی ناچ رہی تھی اور ناچے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں یہ رقص ختم ہو گیا اور وہ سروِ رقصاں ایک صاحب کے پاس جا بیٹھی جو کمرے کے صدر مقام پر بیٹھے ہوئے تھے اور جن کی ہیئتِ ظاہری سے معلوم ہوتا تھا گویا تو وہ خود میزبان ہیں یا جلسے کے سب سے معزز مہمان۔ حاضرین نے بےاختیار ہو کر اس کے کمالِ فن کی داد دینا شروع کی۔

"ستارہ بائی آپ نے تو غضب ہی کر دیا۔ عمر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے سینکڑوں مرتبہ جلسوں میں شریک ہوا۔ کئی دفعہ آپ کا ناچ بھی دیکھا لیکن آج آپ نے جو کمال دکھایا ہے وہ تو خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔"

ایک اور صاحب "جی ہاں سیٹھ صاحب" رقاصہ کے ہم نشین کی طرف اشارہ کر کے "یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے

جلسے میں ان کا رقص اس قدر شباب پر ہے"۔

(ایک تیسرے صاحب جو ظاہری وضع قطع سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور بھاری بھرکم آواز میں بولتے تھے) "خدا کی شان
اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ خدا جمیل ہے اور جمال کو دوست رکھتا ہے اور آپ کی ہر حرکت میں شانِ جمال کا اظہار ہوتا ہے"
(ایک چوتھے صاحب جن کے بالوں کی پریشانی اور صورت کی خود ساختہ وحشت سے یہ خواہش ظاہر ہوتی تھی کہ انہیں شاعر سمجھا جائے)
"جناب میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ کے حسین رقص میں نسیمِ صبح کی سبک خرامی ہے، دریا کی موجوں کا اُتار چڑھاؤ ہے، ابھرتے صبح
کی بے تابی ہے، سرو کی...... (ایک پانچویں صاحب جو شاعری کی تشبیہوں کی خوبصورتی سے زیادہ ان کے سلسلہ وارانہ سے متوحش
معلوم ہوتے تھے) "قطع کلام معاف! سیٹھ صاحب ان سے درخواست کیجئے کہ ایک غزل اور سُنا دیں تا کہ جنت نگاہ کے ساتھ
فردوسِ گوش کا لطف بھی نصیب میں آئے:

سیٹھ صاحب نے جھک کر مغنیہ کے کان میں کچھ فرمائش کی اس نے ذرا سی دیر تک اپنے گلے کے نازک تاروں کو چھیڑا جیسے
کوئی ستار کے خوابیدہ نغموں کو جگاتا ہو اور یہ غزل شروع کی:-

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

غالب کے جوش سے بھرے ہوئے مترنم الفاظ اور اس کی درد بھری آواز نے مل کر ایسا سماں باندھا کہ کمرے میں بالکل سناٹا
ہو گیا۔ وہ گا رہی تھی اور سننے والوں کے تخیل کے سامنے پیہم دلکش سے دلکش تصویریں آتی جاتی تھیں۔ اس کی آواز کا زور اور گداز بڑھتا
جا رہا تھا جیسے بجائے فرمائشی غزل گانے کے وہ کوئی آپ بیتی بیان کر رہی ہو...... اور حتی ہمہ تن گوش آواز کے اس دھارے
پر بہا جا رہا تھا، اپنے سے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر۔ الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے لیکن موسیقی اور شاعری کا اثر الفاظ
کا محتاج نہیں۔ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ لوچ میں ڈوبی ہوئی، احساس سے بھرائی ہوئی

(۳)

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

غزل کو سنتے سنتے دفعتہً جمن کے شعور کی گہرائیوں میں کوئی چیز عجیب اور بے جوڑ سی محسوس ہوئی۔ بدن میں ایک خفیف سی
تھرتھری جس کا مطلب وہ نہ سمجھ سکا۔ ابھی وہ اپنی توجہ کو رقص اور نغمے کی اس دنیا سے ہٹانے نہیں پایا تھا کہ بارش کی چند بوندیں اُ
کے جسم پر پڑیں اور قبل اس کے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلے موسلا دھار مینہ برسنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ایک عجیب قسم کی گڑگڑاہٹ سنا
دی جو بادلوں کی گونج سے ملتی اور اس سے بالکل مختلف تھی، ایک غصے سے بھری ہوئی آواز جو زمین کے پیٹ سے نکلتی معلوم ہوتی:
جیسے کوئی خوفناک قوت جو صدیوں سے قید ہو مادرِ گیتی کا سینہ چاک کر کے باہر آنا چاہتی ہو اس کے پاؤں کے نیچے کی چھت سے

لگی جس دیوار سے سہارا لگائے وہ بیٹھا تھا ہلنے لگی۔ زمین اور آسمان میں تزلزل پڑ گیا۔ کمرے سے دہشت ناک چیخوں کی آوازیں سنائی دیں "ارے بھاگو، زلزلہ ہے زلزلہ، الٰہی خیر" پر میشور بچائیو" اور چشم زدن میں زلزلے نے سارے شہر کو آلیا۔ زمین کے بطن میں جو خوفناک عفریتی قوتیں پنہاں ہیں انہیں کس طرح آزادی مل گئی کہ رات کی تاریکی میں دنیا کو غافل پا کر انسانوں کے آرام پر، ان کی چین کی نیند پر چھاپا ماریں اور چند لمحوں میں دیکھتے دیکھتے ان تمام تعمیروں اور مصنوعات کو تباہ و برباد کر دیں جو برخود غلط انسان نے صدیوں کی کوشش سے تیار کی تھیں اس امید میں کہ انہیں استقلال نصیب ہو گا! سارا شہر جو شہر خموشاں کی طرح سو رہا تھا اس طرح جاگ اٹھا جیسے کسی نے روز حشر صور پھونک دیا ہو، بدحواس، نیم بیدار، بے بس۔ عمارتوں کے گرنے کا شور اور بچوں، بڑوں، مردوں، عورتوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ ان کے واویلا میں ایک جنون کی سی کیفیت تھی۔ وہ چوہوں کی طرح ایک ایسے پنجرے میں گرفتار تھے جس سے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ زمین، وہ در و دیوار جن کو وہ بالکل مستقل اور پائدار سمجھتے تھے کیوں مٹی کے گھروندوں کی طرح ان کی نظروں کے سامنے ڈھیر ہوئے جاتے ہیں۔ جمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا تمام جسم اور حواس بالکل سن ہو گئے ہوں۔ وہ نہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا تھا نہ منہ سے آواز نکال سکتا تھا۔ البتہ اس کی قوت سامعہ ابھی کام کر رہی تھی اور اس کے دل و دماغ کو بے بسی اور خوف کی چیخوں سے پاش پاش کر رہی تھی۔ اس کی نظر بھی ابھی بیکار نہ ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر روشن دان میں سے اس کمرے پر نظر ڈالی جہاں ابھی چند لمحے پیشتر عیش و عشرت اور رقص و سرود کی محفل گرم تھی۔ چند لمحے پیشتر؛ نہ معلوم اس محفل کو برہم ہوئے چند سیکنڈ گذرے تھے یا چند صدیاں، کیونکہ اس قیامت کی گھڑی میں وقت کا معمولی تصور جو دنوں اور گھنٹوں کے ساتھ وابستہ ہے بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس نے یہ ضرور دیکھا کہ ان چند لمحوں یا صدیوں میں ان خوش پوش، خوش گفتار، وضعدار لوگوں کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ مدتوں کی تعلیم و تربیت نے حیوانی جبلتوں پر جو سطحی جلا کر دی تھی وہ آناً فاناً زائل ہو گئی تھی اور اس کے نیچے کی اصلی صورت اور رنگ روپ نکل آیا تھا۔ اطمینان سے سوئے ہوئے حیوان اور درندے پریشان ہو گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اپنے ان عزیز دوستوں اور ساتھیوں کو روندتا ہوا، اگر ممکن ہو تو ان کی لاشوں کا پل بنا کر کسی طرح اس خطرے کے مقام سے نکل کر کسی جائے امن میں پہنچ جائے۔ اور ستارہ بائی، وہ رقص اور موسیقی کی جان، وہ حسن کی دیوی کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی اور اس کی باختہ آنکھیں پھٹی ہوئی۔ جو لوگ ذرا دیر پہلے اس کے کمال فن اور اس کی رعنائیوں پر دل قربان کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے وہ اس وقت اس کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور وہ بھی خود کو فراموش کر چکی تھی۔ اس ان دیکھے خوف نے اس کے سیماب آسا جسم کو بالکل معطل اور بے حس کر دیا تھا۔ جمن نے دیکھا کہ اس کے سر کے اوپر بجلی کا فانوس بہت زور سے حرکت کر رہا ہے اور قریب ہے کہ چھت سے ٹوٹ کر اس کے اوپر گر پڑے۔ اس نے بے اختیار ہو کر ایک چیخ ماری جس نے ستارہ کو ذرا ہوشیار کر دیا اور وہ دروازہ کی طرف

جھپٹی۔ اتنے میں بجلی زور سے کڑکی اور کمرے کی تمام روشنیاں غائب ہوگئیں اور جمن کے سر پر کوئی چیز بہت زور سے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر نہ معلوم کہاں جا گرا۔

(۴)

اگلے روز جب آفتاب اس شہر پر طلوع ہوا تو اس نے بار بار اپنی آنکھیں مل کر نیچے کی طرف دیکھا مگر جو کچھ اسے نظر آیا اس کا یقین نہ ہوا۔ اس نے سوچا کہ کہیں میں ابھی تک نیند میں تو نہیں ہوں، کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ لیکن کہاں تک اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دیتا جو اس کا مشاہدہ خواہش پر غالب آیا اور اسے چار و ناچار یہ ماننا پڑا کہ رات کے چند گھنٹوں میں جب وہ دور دراز مغرب کی کسی گھاٹی میں بے خبر سویا ہوا تھا کسی زبردست ہلاکت آفرین قوت نے سر سبز میدانوں، لہلہاتے کھیتوں اور متبسم باغات کو تباہ کر دیا ہے، سر بفلک عمارتوں کو خاک میں ملا دیا ہے، اور اس کے بہت سے جانے بوجھے نشانات کو ہمیشہ کیلئے مٹا دیا ہے۔ اگر، اپنی آنکھ سے اس دہشت ناک منظر کو دیکھتا جب فطرت کی تمام مجنونانہ قوتیں بے بضاعت انسان کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی تھیں تو اس کا دل خون ہو جاتا۔ زلزلے کی شدت نے عمارتوں کو اس طرح جھنجوڑا تھا کہ وہی گھر جنہیں لوگ امن اور عافیت کا مرادف سمجھے تھے ان کی خون آشام قبریں بن گئے تھے اور انسانوں کے ساتھ ساتھ ان کی دولت، ان کے کاروبار، ان کے ادبی اور علمی کارنامے بھی مدفون ہو گئے تھے۔ عمارتوں کے گرنے سے جابجا بجلی کے تاروں میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک طرف تو بارش کا طوفان عمارتیں گرا رہا تھا اور دوسری طرف اندر ہی اندر آگ سلگ رہی تھی جس نے گھروں کے ساز و سامان بلکہ ان کے مکینوں کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ زمین سے جابجا گرم پانی کے کھولتے ہوئے چشمے نکل پڑے تھے۔ دریا کی جگہ ریت اور کھیتوں کی جگہ دریا نے لے لی تھی۔ آسمان تو بیشک اپنی جگہ قائم تھا لیکن زمین کی تمام کائنات تہ و بالا ہو گئی تھی۔۔ ۔ ۔ ۔ سورج نے بدحواس ہو کر اس منظر کو دیکھا اور دل کا اضطراب کم کرنے کے لئے بادل کے ایک ٹکڑے کے پیچھے جا چھپا۔

اس وقت تک دن کافی چڑھ چکا تھا۔ جمن کو ہوش آیا مگر نہ حواس کام کرتے تھے نہ حافظہ کام کرتا تھا۔ وہ ایک کھنڈر میں پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں زخمی تھے۔ سر میں سخت چوٹ آئی تھی اور خون بالوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ بدن بالکل سُن تھا اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے وہ کسی قدیم اور تباہ شدہ تہذیب کے کھنڈروں میں پہنچ گیا ہو جہاں کوئی جاندار نظر نہ آتا تھا۔ زمین و آسمان تک پہچانے نہ جاتے تھے۔ وہ بہت کوشش کر کے اٹھا اور پھر ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے ہائے کر کے بیٹھ گیا۔ پھر بہت ہمت کر کے کھڑا ہوا اور لنگڑاتا ہوا چلا۔ آنکھیں پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ہر طرف اینٹ، چونے، مٹی کے ڈھیر تھے، جن میں جابجا ٹوٹا ہوا فرنیچر اور سامان دبا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک کمرے کی دو دیواریں کھڑی تھیں اور باقی دو دیواریں اور چھت شق ہو گئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں ایک لوہے کی صندوقچی پڑی تھی جس کا ڈھکنا کسی سخت ضرب کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ پیشے کے رجحان نے زور کیا اور

اس نے صندوقچی کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں بیش قیمت زیورات اور اشرفیاں نظر پڑیں۔ منہ میں پانی بھر آیا اور فوراً صندوقچی کو بغل میں
مار کر وہاں سے بھاگنے کا قصد کیا لیکن معاً خیال آیا کہ نہ معلوم اس کھنڈر میں اور کیا کیا خزانے مدفون ہوں۔ انہیں تلاش کرنا چاہئے
لہٰذا اسی طرح لنگڑاتا ہوا آگے کو روانہ ہوا اور مالِ غنیمت کی تلاش میں اس وسیع کھنڈر کے کونے کونے کو دیکھ ڈالا۔ ہر جگہ طرح طرح
کی قیمتی چیزیں پڑی ہوئی تھیں بعض ٹوٹی پھوٹی بعض سلامت۔ ایسی چیزیں جن کو اس نے آج تک کبھی ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔ اپنے
خیال میں ان تمام چیزوں کو جمع کرتا چلا جا رہا تھا کہ دفعتہً ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دروازے کی چوکھٹ پر کسی عورت کی لاش پڑی ہوئی
تھی۔ ایک شہتیر جس کا ایک سرا دیوار میں اٹکا ہوا تھا اس کے اوپر سپر بن گیا تھا اور اس کی وجہ سے بہت کچھ اینٹ اور پتھر کا ملبا اس
کے اوپر نہیں گرا تھا۔ وہ اس ذرا سی صاف جگہ میں چاروں طرف کی تباہی سے بے خبر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈرتے
ڈرتے اس کے پاس آیا اور جھک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک گہرا زخم لگا تھا جس نے پیشانی سے ٹھوڑی تک
فگار کر دیا تھا۔ وہ ایک سفید گرد آلود ساری میں ملفوف دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھے پڑی تھی۔ اس نے غور سے اس کو دیکھا بہت
غور سے۔ اس کے حافظے میں ایک کھٹک پیدا ہوئی۔ یہ سفید ملائم ساری۔ یہ خوبصورت کتابی چہرہ، یہ سیاہ لانبے بال ان میں لپٹا ہوا موتیوں
کا ہار جو اس وقت گردن میں ٹنکا ہوا تھا، اس نے یہ سب چیزیں کب اور کہاں دیکھی تھیں؟ . . . . . کسی خوشگوار خواب کا سا
دھندلا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ خوبصورت اور متناسب اعضا جو اب بے جان تھے اس نے کہیں متحرک دیکھے
تھے۔ یہ موتیوں کا ہار روشنی میں چمکتا دیکھا تھا۔ کہاں؟ دفعتہً اس کے حافظے کے سامنے ایک بجلی سی چمک گئی اور رات کا تمام واقعہ یاد
آ گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں رات گلستانِ رنگ و بو کی یہ تیتری رقص کر رہی تھی جس کے ہر ہر قدم پر حاضرین کے دل پامال تھے۔ اور
اس کے بعد زلزلہ اور بارش کا طوفان اور روشنی کے فانوسوں کا خطرناک طریقے سے اس کے سر پر جھولنا اور خود اس کا چوٹ کھا
کر بے ہوش ہونا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کہاں ہے، اس پر کیا گذری ہے اور اس کے چاروں طرف جو کھنڈر ہیں وہ اس
بارونق شہر کی یادگار ہیں جو چند گھنٹے پہلے اطمینان کی نیند سو رہا تھا . . . . . . وہ آگے بڑھا اور اس کے جسم کو چھوا، اس میں ابھی
تک گرمی تھی سینے پر ہاتھ رکھا، اس میں خفیف سی حرکت تھی، اس کے بے جان جسم میں زندگی کے یہ آثار پاکر اسے ایسا محسوس ہوا،
جیسے کسی مُردے میں جان پڑ گئی ہو، کوئی معجزہ وقوع میں آیا ہو۔ اس نے پھر ایک امید افزا نظر اس پر ڈالی۔ اس بے ہوشی کے
عالم میں بھی اس کے چہرے پر سکون کی ایک شان تھی وہ خون بہنے کی وجہ سے سفید پڑ گیا تھا اور سیاہ بالوں کے حلقے میں اور کمرے
کی دھندلی روشنی میں اور زیادہ سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس پر ایک بچوں کی سی سادگی اور بے بسی اور اعتبار کی کیفیت تھی جس نے
جن کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگا دیا۔ اس کے دل میں جس کو زمانے کی ٹھوکروں اور بدسلوکیوں نے پتھر کا بنا دیا تھا رحم اور ہمدردی
کے سوتے جوش میں آئے۔ وہ بھول گیا کہ وہ ایک بدنصیب اور آوارہ شخص ہے جس کو سوسائٹی کی بے رحمی اور بے اعتنائی نے

چور بنا کر قانون کی حد حدود سے باہر نکال دیا ہے۔ رات اس تمام عیش و عشرت کے سامان دیکھ کر اس کے دل میں حسد اور نفرت کی جو آگ بھڑکی تھی وہ بجھ گئی اور اس کا دھواں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے نکل گیا۔ زیوروں کی صندوقچی، برتن، کپڑوں کے بکس وہ تمام چیزیں جو اس نے وہاں سے جمع کر کے لے جانے کا ارادہ کیا تھا اس کی یاد اور نظر سے گر گئیں سارے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ وہ ایک انسان ہے اور یہ ایک بے بس اور مجروح عورت جو اس کی ہمدردی اور تیمارداری کی محتاج ہے.....

جب کچھ دیر کے بعد سورج کا اختلاج قلب کم ہوا اور اس نے بادلوں کی نقاب میں سے اپنا منہ نکالا تو یہ تماشا دیکھا کہ شہر کے باہر ایک زخمی آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے لنگڑاتا ہوا چل رہا ہے اور اپنی کمر پر ایک عورت کو اٹھائے ہوئے ہے جس کی پیشانی پر ایک میلی پٹی بندھی ہے اور سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ایک چھوٹی سی فلاکت زدہ جھونپڑی میں داخل ہوا مگر اس کے چہرے پر ایک ایسا اطمینان اور پاک تبسم تھا کہ سورج بھی اپنی پریشانیوں کو بھول کر مسکرانے لگا اور اس کی روشنی کی لہر اس تمام خرابے میں اُمید کی کرن بن کر پھیل گئی۔

(۵)

اگلے روز صبح کلکتہ کے ایک اخبار میں کسی مقامی خبر نویس کی مندرجہ ذیل رپورٹ چھپی جو اس مستعد صحافی نے ایک دن پہلے ہی اخبار کو بھیج دی تھی:۔

"شب گذشتہ سیٹھ لچھمن داس کی عالیشان کوٹھی شانتی نواس میں ایک محفل رقص منعقد ہوئی جس میں شہر کے تمام بامذاق ماہرین فن اور رؤسا جمع تھے۔ تمام کوٹھی اس قدر نفاست اور خوبصورتی سے سجائی گئی تھی کہ الفاظ اس کی تصویر کھینچنے سے عاجز ہیں۔ اس موقع کے لئے سیٹھ صاحب نے کلکتہ کی مشہور و معروف مغنیہ مس ستارہ بائی کو باصرار مدعو کیا تھا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ وہ کلکتہ سے باہر کہیں تشریف لائی ہوں۔ محفل رات کے تین بجے تک گرم رہی اور مس ستارہ بائی نے اپنے ملائک فریب حسن، اپنے کمالِ رقص اور اپنے اعجازِ سرود سے حاضرین کو بالکل بے خود بنا دیا۔ ان تمام معزز حضرات کی متفقہ رائے یہ تھی کہ وہ پہلے کبھی ایسی بامذاق اور پُرلطف صحبت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ خدا سیٹھ صاحب کو عرصۂ دراز تک سلامت رکھے کہ ان کی ذات ہمارے شہر کی رونق ہے۔"

خواجہ غلام السیدین

واہ رے مَیں!

(۱)

کہتے ہیں آثارِ محبت مجھ کو محبت راس نہیں ۔۔۔ جس سے محبت کرتا ہوں مَیں آہ وہی حسّاس نہیں
جانتا ہوں مَیں آگے ہی سے اُس کو کسی کا پاس نہیں
مانتا ہوں ہیں مہر و وفا کی اُس گل میں بُو باس نہیں ۔۔۔ واہ رے مَیں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۲)

سلسلۂ سعیٔ بے حاصل آہ نہ اب تک ٹوٹ سکا ۔۔۔ خواب میں بھی ایمانِ خیالِ دوست نہ مجھ سے چھوٹ سکا
لُوٹ لیا ایک آن میں اس نے جتنا مجھ کو لوٹ سکا
غیر کے ہاتھوں لُٹ جانے کا کس دل میں وسواس نہیں ۔۔۔ واہ رے مَیں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۳)

آہ ہجومِ یاس نے میرے دل پر دھاوے کب نہ کئے ۔۔۔ سینکڑوں چکر ناکامی نے اس کی راہ میں کب نہ دیئے
جمع کئے سامان نہ کیا کیا اُس کی جفا نے میرے لئے
اس کی نگاہِ فتنہ اثر سے صلح کی بالکل آس نہیں ۔۔۔ واہ رے مَیں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

(۴)

جذب مرے دل میں ہے کتنا راز یہ اُس پر فاش نہ ہو ۔۔۔ مہرِ محبت وقت پہ چمکے بے موقع ضَو پاش نہ ہو
آئے وہ خود آنے کا سبب معلوم اُسے اے کاش نہ ہو
آہ محبت! تجھ کو اس دُنیا کی ہوا ہی راس نہیں ۔۔۔ واہ رے مَیں اس پر بھی مجھے ناکامی کا احساس نہیں

علی منظور حیدرآبادی

سوامی رام تیرتھ[۱] کا پیام

اور

اردو ادب

جس طرح چراغ کی روشنی، شعلے کی گرمی، پھول کی خوشبو اور نغمہ کی لہر ہیل کے اپنے گرد و نواح کو اپنی خصوصیت اور کیفیت سے معمور کر لیتی ہے اسی طرح خدا کے وہ بندے جو اپنی زندگی کو ہم آہنگِ فطرت کر دیتے ہیں اپنے دل کی کیفیت اور روح کی وسعت کو اپنے وجود کے ذریعے آس پاس پھیلاتے ہیں اور اس حالت میں ایک غیر معمولی خصوصیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی خصیص کو عوام الناس معجزہ یا کرامت کہا کرتے ہیں۔

---

[۱] سوامی رام تیرتھ (پیدائش سمبت ۱۹۳۰ بکرمی وفات سمبت ۱۹۶۳ بکرمی) آپ نے قصبہ مرالی والا ضلع گجرات صوبہ پنجاب میں ایک غریب برہمن کے یہاں جنم لیا۔ آپ کا نسبی سلسلہ بابا تلسی داس جی سے ملتا ہے۔ مرالی والا پرائمری اسکول سے سلسلہ تعلیم شروع کیا۔ انٹرنس گوجرانوالہ اسکول سے پاس کیا اس کے بعد لاہور مشن کالج میں آ کر ۲۲ سال کی عمر میں ایم اے پاس کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سیالکوٹ مشن اسکول میں کچھ عرصہ تک ملازم رہے اور وہاں سے لاہور مشن کالج میں پروفیسر ہو کر آ گئے۔ بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر ہو گئے۔ آپ کو علم ریاضی سے خاص شغف تھا۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں آپ تارک الدنیا ہوئے اور ہمالیہ پہاڑوں میں جرم سادھن کے لئے چلے گئے۔ گڑھوال کی پہاڑیوں میں آپ نے ٹہری کو پسند کیا۔ اس طرح آخر وقت تک آپ یو۔پی ہی میں رہے۔ ۔ ۷ اکتوبر سنہ ۱۳۹۱۶ء کو آپ دریائے گنگا میں اشنان کرتے ہوئے غرق دریا ہو کر معرفت ہوئے۔ مصرعہ تاریخِ وفات یہ ہے:۔

"واہ واہ رام تیرتھ رام میں جا رم گئے"

علامہ اقبال نے آپ کی وفات سے متعلق ایک پُر معنی نظم لکھی ہے جو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ یہ اشعار قابلِ غور ہیں:۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تُو	پہلے گوہر تھا بنا اب گوہرِ نایاب تُو
نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا	لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا
چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے	تھم گئی جس دم تڑپ سیلابِ سیمِ خام ہے

کیا کہوں رندوں سے میں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سزا منصور کی

سوامی رام تیرتھ نے دنیا کے تمام مہذب ممالک کا سفر کیا۔ اہلِ امریکہ آپ کے خاص طور پر مداح تھے۔ اہلِ جاپان آپ کی عزت کرتے تھے اور اہلِ مصر کو آپ سے محبت تھی۔

انسان کا دل اور اس پر روح کی قوت کا اثر ایک ایسی غیرفانی شکتی ہے جو جاندار تو کیا بےجان اشیاء کو بھی اپنی کہربائی کیفیت سے اپنی طرف کھینچ لے۔ کوئی تعجب نہیں اگر آر فیس اپنی بانسری سے بہتے پانی کو محو کر دیتا ہو یا تان سین کی موسمی ملہار سے موسلادھار پانی برسنے لگتا ہو۔ اب بھی ایک نہایت عام مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شریف خصلت بھلا مانس کسی عام صحبت میں آ جائے تو آناً فاناً اس صحبت کا رنگ بدل جاتا ہے اور ایک دم اہلِ محفل اس کی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں جس کی وجہ اس کے کیریکٹر کی کہربائی قوت ہے جو اہلِ محفل کی پست اور رکیک ہستی کو اپنی شکتی سے دبا دیتی ہے اور ہر شخص کا دل اس ایک کی طرف کھینچ کر ایک حد تک اس سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ دنیا میں پیغمبر، پیشوا، ولی، ریفارمر، فاتح اور ہیرو یا لیڈر کہلاتے ہیں۔ غرض کسی شخص میں کوئی ایک ایسی تخصیص نمایاں طور پر عیاں ہو جائے جو ایک حد تک اپنا اثر دوست و دشمن ہر ایک پر ڈال سکے وہی اس فرد میں انسانیت کا جزو اعلیٰ ہے بشرطیکہ وہ تخصیص شرف انسانیت سے بخوبی ہم آہنگ ہو۔

اس تخصیص کو عام کرنے کا ذریعہ کہیں صنعت ہے کہیں کیفیت، کہیں رنگ کہیں آہنگ، کہیں نقش کہیں نغمہ۔ ادب و انشا میں اس کو نظم و نثر کی نوعیت اپنانا چاہئے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ادیب یا انشا پرداز بلا شرکت غیرے کبھی ایجاد کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ متقدمین و متاخرین کا کچھ نہ کچھ اثر اس کے خیالات پر ضرور پڑتا ہے۔ ہاں تھوڑی بہت تجدید ضرور ہوتی ہے اور وہی اس تخصیص کی بنیاد ہے۔

بنی نوع انسان میں کون ایسا ہوگا جس کی زندگی میں چند ایسے لمحے بھی نہ ہوتے ہوں جو اس کی روح کو دامِ خیال کی پیچیدگیوں اور مایا کے جال سے بالکل آزاد کر کے مبدء روح کے سامنے نہ لا کھڑا کرتے ہوں۔ چنانچہ وہ لمحے ایسے ہیں جب کہ آتما پرم آتما کے روبرو ہوتی ہے اور جب ذرہ آفتاب کے عکس سے چمک اٹھتا ہے، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ خیالات سرمدی نور سے معمور ہو کر تمام عالم کو اپنی پاکیزگی سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی کوشش اس برگزیدہ فرد کا پیام کہلاتی ہے۔ خدا کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس پیام کو لبیک کہتے ہیں اور خدا کے ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ ضروری نہیں کہ تمام دنیا اس پر کاربند ہو۔

ہندوستان میں (خصوصاً طبقۂ ہنود میں) کوئی شخص اس پائے کا آج تک نہیں ہوا جس نے اردو زبان کے ذریعے سے اپنے اس پیام کو اس خلوص نیت کے ساتھ عام کیا ہو جس طرح کہ غریق دریائے حقیقت و معرفت سوامی رام تیرتھ نے کیا۔ شیخ و برہمن میں بہتیرے ایسے ہوئے جنہوں نے اپنی زندگی کو بنی نوع انسان کی روحانی خدمت میں وقف کر دیا مگر سوامی رام تیرتھ کا نام ان سب میں پیش پیش نظر آتا ہے۔

چونکہ یہاں ہم سوامی رام تیرتھ مرحوم کی تاریخ حیات نہیں لکھنا چاہتے اس لئے ان کے زمانۂ تعلیم، ملازمت کے حالات، ممالک غیر کے سفر کے واقعات اور ایک تارک الدنیا سنیاسی کی حیثیت سے پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے کے حالات کی بابت کوئی بحث نہ کریں گے[1]۔ البتہ یہ کہنا ضروری ہے کہ سوامی رام ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور اپنی محنت سے تعلیم حاصل کر کے ایم اے تک پڑھ گئے۔ ریاضی آپ کا خاص مضمون تھا۔ ہندی، فارسی، انگریزی اور اردو میں آپ ملکہ رکھتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ان زبانوں میں متعدد تصانیف

[1] اس قسم کی بحث ایک مضمون میں ہو چکی ہے جو سوامی رام تیرتھ کے عنوان سے غالباً رسالہ ادب لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔

چھوڑی ہیں خصوصاً انگریزی اور اردو زبانوں میں تو آپ کو بدرجۂ اتم دستگاہ تھی۔ ان زبانوں میں سے بھی اردو زبان کو آپ زیادہ پسند کرتے تھے چنانچہ نظم و نثر کا ایک ضخیم ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے جس کو "رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ" کوشش کر کے جمع کر رہی ہے۔ سوامی جی کے پیام پر جو کچھ یہاں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کو ایک مزید اضافہ سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ تمام و کمال ان کے اردو مواعظ و کلام کا نتیجہ ہے جو مختلف رسائل (مثلاً ست اپدیش اور رسالہ الف وغیرہ) اور چند ہندو احباب کی کرم فرمائیوں کی بدولت یہاں ایک باقاعدہ تبصرے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سوامی جی کے پیام کی اہمیت ان پیغمبروں اور رشیوں کے پیام کی طرح نہیں جنہوں نے نئے نئے پنتھ قائم کئے۔ ان کے نصائح تو بالکل عام تھے جو روحانیت کا رنگ لئے ہوئے معاشرت اور سوسائٹی سے متعلق ہیں۔ سوامی جی کوئی نیا مذہب یا پنتھ قائم کرنے کے مخالف ہی نہ تھے بلکہ وہ کہتے تھے کہ "محبت خود ایک عالمگیر مذہب ہے جو ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اس کو خواہ مخواہ کسی قسم کے رنگ تعین سے پابند کر کے پیش کرنا اس کو محدود کرنا ہے اس لئے ان کا پیام قدیم صوفیائے کرام کے اس کلام پر مبنی تھا کہ جس نے خود کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا" وغیرہ۔ سوامی جی موصوف اپنے ان عقائد کا حوالہ ذیل کے فارسی اشعار سے دیا کرتے تھے۔

رفتم بہ طبیب و گفتم از دردِ نہاں　　گفتا کہ ز غیر دوست بربند زباں
گفتم کہ غذا گفت ہمیں خونِ جگر　　گفتم پرہیز گفت از ہر دو جہاں

اسی پیام کو بہ مقتضائے معاشرتِ وقت وہ ایک خاص انداز سے دُنیا کے سامنے پیش کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کو چاہئے کہ پہلے خود اپنے آپ کو پوجے۔ اس طرح وہ اپنے وقت کے مہاتما بدھ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُن پر اسلامی تصوف زیادہ غالب تھا اس لئے وہ کہتے تھے کہ ؎

کریں ہم کس کی پوجا اور لگائیں کس کو چندن ہم　　صنم ہم، دیر ہم، بتخانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم

وہ یہ خوبی سمجھتے تھے کہ مذہب ان کے زمانہ ہی میں دیوالیہ ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کا کہیں نام تک نہیں لیتے اور اپنے پیام کو سلطنت مغلیہ کے ہردلعزیز فرمانروا جلال الدین محمد اکبر کی کوشش سے مقابلہ کر کے فرماتے ہیں کہ:۔

"بظاہر ہندوپن، مسلمان پن، عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں جن میں پاکیزہ عشق عالمگیر پلانے کی وقتاً فوقتاً کوشش ہوتی رہی...... ان پُرانے پیالوں کی طرح اکبر نے بھی ایک نیا جام گھڑا ــــ یعنی دینِ الٰہی ــــ ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دینا اس کا مقصد تھا"۔

یہ پاکیزہ عشق عالمگیر کبھی دیوالیہ نہیں ہو سکتا یعنی انسان کی روح پر حرف نہیں آ سکتا یہ دوسری بات ہے کہ ظلمت کا احساس اور جہالتِ نفس اُسے عرصے تک تعینات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رکھے اور اس کی سرمدی تابانی کو مدھم کر دے۔ خدا خود ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک

بندے اس سے اتنے متنفر ہو جائیں اس لئے وہ ہر زمانے کے مراق ایسے برگزیدہ افراد کو بھیجتا رہتا ہے جو اس الٰہی امانت کو جہالت کی خیانت سے بچائیں۔ خود سوامی جی ایک جگہ اس طرح فرماتے ہیں :۔

"آدمی اپنی قسمت اپنے ہاتھوں بناتا ہے۔ اور بقول ہربرٹ اسپنسر ملکی حالات ہی خود اپنے مطابق آدمی پیدا کر لیا کرتے ہیں"

سوامی جی اس بات کے قائل تھے کہ انسان اگر کوشش کرے تو مقصد براری لازمی ہے اس لئے ان کی کوشش بھی قدیم مہارشیوں کی سی کوشش تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مغرب کا اثر لے کر اہل مشرق اور خصوصاً اہل ہند اپنی قدیم روحانیت کو بالکل کھو نہ بیٹھیں۔ اس لئے وہ بعض اوقات ایک دکھے ہوئے دل کی صدا بن کر اپنے احباب اور شاگردوں سے اس طرح مخاطب ہوتے :۔

"ہائے گردل چند! میرے لال! او گوبر اور مٹی (خواہشات نفسانی) میں کیوں ہاتھ رگڑ رہا ہے۔ یہ لیلا (کھیل) خوب نہیں۔ مکھن جیسا بدن تم نے میلا کچیلا کر لیا ہے۔ گوبر مٹی میں تو بچھو (ڈنک) ہوتے ہیں کہیں کاٹ نہ کھائیں۔ پھر ہونٹ بسور کر رونا شروع کرو گے۔ تمہارا رونا تمہارا واویلا مجھ سے نہیں سہہ سکتا۔ میرے ننھے آؤ تمہیں نہلاؤں۔ دھلاؤں۔ سو دودھ پلاؤں۔ تم گڈریئے تو نہیں۔ تم دوارکا دھیش (مالک بحر و بر) ہو۔ چھوڑو گندا پن"۔

استعارہ کنہیا جی کے بچپن سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس سے وہ جذبہ ظاہر ہے جو سوامی رام تیرتھ کو ان کی اصلی صورت میں پیش کرتا ہے۔ سادہ۔ اس زمانے کے آج کل کے تعلیم یافتہ طبقہ پر ان میٹھی باتوں کا اثر بھلا کیوں ہونے لگا۔ ان کے سخت دلوں پر کوئی پھول کھینچ مارے تو پھول ہی کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ایسے سخت دلوں پر تو ایک بڑے ہتھوڑے کی ضرب چاہئے۔ لیکن سوامی جی اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہتھوڑے کو بھی کسی نرم مخمل میں لپیٹ کر لگائیں۔ اس لئے وہ اس طرح کہتے تھے :۔

"پیارے تم منتخب ہو چکے ہو۔ تمہارے لئے لنگڑا ور چھپنے کا زمانہ گزر چکا۔ خونخوار ناخنوں، دانتوں اور سینگ کا صدمہ بیت چکا۔ پچھاڑ کھانے یا دم ہلانے کا وقت نہیں رہا۔ تم اب دقیانوس کی طرح آفتاب، ماہتاب اور سب ستاروں کو چھوٹی سی دنیا کے جسم کے گرد مت گھماؤ۔ خود غرضی سے باز آؤ بلکہ اس ذرہ جسم کو آفتاب حقیقت پر نثار کر دو۔ وار کے پھینک دو"

لیکن پھر بھی ضرب کاری نہ ہوتی تھی اور بہ تقاضائے بشریت آزردہ و عاجز آ جاتے اور اس روحانی ظلمت سے نالاں ہو کر کہتے :۔

"اے آنند پرشید لوگو۔ . . . وہ رام کے ولاس ہی کی ایک جھلک ہے اور بس۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ کیمسٹ کے مجوزہ (شراب) سے مصنوعی مستی مانگتے ہو۔ . . . . آؤ شاہنشاہِ زماں کو جو مستی نصیب نہیں ہے رام مفت عطا کرتا ہے"

روحانیت کا احساس تازہ رکھنے کے لئے سوامی جی نے وحدت الوجود کو جو اسلامی فلسفۂ تصوف سے ماخوذ ہے فلسفۂ ویدانت سے اس طرح شیر و شکر کیا ہے کہ بظاہر شکل سے کوئی فرق نظر آتا ہے مگر در اصل ایک دوسرے میں بہت فرق ہے۔ بنیادی اصول ایک ہوں تو البتہ فرق نظر نہ آئے لیکن مشکل تو یہی ہے کہ جب جڑیں مختلف ہیں تو شاخوں، پتیوں پھولوں اور پھلوں میں اختلاف ہونا ہی چاہئے۔ اور چونکہ

اس اختلاف کی بنیاد عقائد پر ہے اس لئے ہم اس کو یہاں دیدہ و دانستہ نظر انداز کریں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک کا مقصود ایک ہی ہے اس لئے سوامی جی کا مقولہ تھا کہ اس کی تلاش چاہئے راہ کوئی بھی ہو۔ زندگی کا حسن تو دل کی اس آرزو میں ہے جو اس کی جستجو سے متعلق ہو۔ اس کے وسائل ہر مذہب و ملت میں ہیں مثلاً:۔

"سنسکرت میں ویدانت (توحید) کے ازمد متاد نسخے ہیں۔ وتاتریہ کی ابدھوت گیتا، اشٹاوکر گیتا، سنکراچاریہ کے استوترنیا۔ بعض حصے یوگ باسسٹھ کے۔ فارسی میں سب سے بڑھ کر توحید کا کلام شمس تبریز[1] کا ہے اس سے اُتر کر مثنوی شریف، شیخ عطا مغربی وغیرہ، امریکہ میں والٹ وہٹ من کے اوراق گیاہ۔"

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوامی جی کا فلسفہ تصوف بالکل اقتضائے وقت کے مطابق ہے کیونکہ اس میں دُنیا کے ہر بڑے مذہب کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور موجود ہے جو گھوم پھر کر "ہمہ اوست" کی تشریح و تفسیر ہو جاتا ہے۔ فارسی شعرا کے کلام سے جو اقتباسات سوامی جی نے اپنے لیکچروں میں بطور تمثیل و حوالہ پیش کئے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ بغیر کافی مطالعہ کے کوئی شخص اس قدر معلومات بہم نہیں پہنچا سکتا۔ جو شعر وہ لکھتے ہیں بسوط لٹریچر کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اکثر تیر دلنشیں کا کام کرتا ہے۔ مثلاً ؎

دوش آں صنم بیگانہ وش بگذشت از من چوں پری — کردم سلامش لیکن او داد جواب سرسری
گفتم چرا بیگانۂ؟ گفتا کہ تو دیوانۂ! — من کیستم؛ تو کیستی؛ در خود چرا می ننگری
تو قاصدی و مقصدی تو باطنی و ظاہری — تو اولی و آخری تو ناظری و منظری!

سوامی جی نے فلسفۂ ویدانت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے کمال انشا پردازی سے کیفِ محبت میں شرابور کر کے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر قسم کے احساس کو مغلوب کرتا ہوا سیدھا دل پر آ لگتا ہے مگر بنیادی تعلیم عموماً اُپنشدوں پر مبنی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ تعلیم روحانیت کی عام شکل تعلیم اخلاق ہے جو برتاؤ کے ذریعہ سے عملی صورت میں نمایاں ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیرو نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

ہے بُرائیی پریت کر جیسی برچھ کرے — دھوپ سے سر آپنے اور ن چھاؤں کرے

وہ کہتے تھے کہ جب تک رُوح کا تعلق جسم سے ہے انسان کو اپنے کردار پر قدرت حاصل ہے لیکن اس کو خودی اور انانیت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ مؤخر الذکر تو مایا کا ایک پھندا ہے۔ جسم و جان کے تعلق سے جو قدرت انسان کو حاصل ہے وہ بھی در اصل قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ اس مسئلے کو وہ نہایت سُلجھے طریقے پر اس طرح حل کرتے ہیں:۔

"یہ خیال کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یا پرمارتھ سے سب کچھ ہوتا ہے اس میں کچھ فرق نہیں بلکہ فرق صرف ان نگاہوں کا ہے

---

[1] جو در اصل مولانا روم کا کلام ہے۔ حضرت شمس تبریز کے آپ مُرید تھے۔ اس لئے ان کے نام سے بہت کچھ لکھا۔

جو حقیقت کو نہیں دیکھتیں سو دیانت تو اُن تمام لوگوں کی خدمت میں جو یہ کہتے ہیں کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یہ کہتا ہے کہ پہلے ذرا اتنا بتا دو کہ آپ ایشور کا سروپ کیا مانتے ہیں۔ آیا وہ نراکار ہے یعنی بےصورت ہے یا ساکار ہے یا باصورت۔ آیا وہ فاعل کرتا ہے یا صرف اکرتا۔ وہ باتعلق یعنی سنگ دان ہے یا بےتعلق اسنگ ؟ . . . . . جو لوگ نپولین وغیرہ کی ہمت کا حوالہ دیتے رہتے ہیں اگر وہ اس کی سوانح عمری کو غور سے پڑھیں تو ضرور یہ بات پائیں گے کہ جس وقت نپولین کامیابی حاصل کر رہا تھا اس وقت اس کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ میں کام کر رہا ہوں بلکہ جس وقت جوشِ مستی میں بےخبر ہو کر لڑتا تھا اس وقت کامیابی حاصل ہوتی تھی"۔

یہی وہ کیفِ بےخودی تھا جو قدیم ہندوستان کو تمام دنیا پر روحانیت کے اعتبار سے برتری عطا کئے ہوئے تھا۔ اب نہ وہ کیفِ بےخودی ہے نہ روحانیت اب وہ ہندوستان ہی نہیں کیونکہ :۔

"وہ ہندوستان جنت نشان جس کے گنجان درختوں کے جھنڈوں میں پاکویل کے میٹھے سُر سنائی دیتے تھے یا شانتی برساتی ہوئی ویدوھنی . . . . جس کے شیشے کی طرح صاف و شفاف چشمے اُن مہاپرشوں کے انتہ کرن سے زیادہ نرمل تھے جو وہاں رہا کرتے تھے . . . . آج اُن رشیوں والے بھارت ورش میں اس سرے سے اُس سرے تک کتنے آدمی ایسے ملیں گے جو سروپ میں اروڑھ ہوں . . . . جس سے پوچھو سوار ندارد گھوڑے ہی کا پتہ دے گا . . . . فلاں دفتر میں ملازم ہوں۔ یہ تنخواہ۔ فلاں قوم۔ فلاں شخص کا بیٹا۔ یہ جائے سکونت۔ یہ عمر۔ خوبصورت ہوں۔ میں مرد ہوں۔ میں ایم اے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پیارے یہ سب تو جسم کا حلیہ و پتہ ہے"۔

حقیقت میں یہ سب مایا کا جال ہے بقول امریکن محقق ایمرسن (Emerson) کے :۔

In changing moon and tidial wave,
Glows the fend of want and have.

اس انقلابی مدوجزر پر سوامی جی نے ایک نہایت ستھرے انداز میں اس طرح خیال آرائی کی ہے :۔

"ہندوستان اور امریکہ میں کیا فرق ہے! یہاں دن ہے تو وہاں رات ہے۔ وہاں دن ہے تو یہاں رات ہے۔ جس وقت ہندوستان کا ستارا بالا تر تھا امریکہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ آج امریکہ عروج پر ہے تو ہندوستان کی پوچھ نہیں"۔

سوامی جی جب کیفِ جذبات میں ہمہ تن محو ہو جاتے ہیں اس وقت جو کچھ کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابرِ رحمت ہے جو موسلا دھار مینہ کی طرح برس رہا ہے۔ دیکھئے روحانی تعلیم کا حسب ذیل انداز خود ثابت کر رہا ہے کہ میں ایک ایسے دل کی صدا ہوں جس سے محبت کا دریا اُمنڈ رہا ہے :۔

"او بنگڑی کے کنگن پہنے ہوئے مجرم اگر اس وقت بھی تو ایک لمحہ بھر کے لئے یاد حقیقت میں جسم و جہان کو تیاگ کر محمل ہو جائے ۔ اپنی

سے خود ذات میں جاگ پڑے تو سوا کا فتوے دینے والے جج کا دماغ رُک جائے ۔ اظہار لکھنے والے مثل خواں کا قلم رُک جائے ۔
پکڑنے والے کوتوال کا قلم رُک جائے ۔ جرح کرنے والے وکیل کی زبان رُک جائے ۔ کون دماغ ہے جو تیرے بغیر سوچ سکتا ہے ۔
کون زبان ہے جو تیری مدد بغیر بول سکتی ہے ۔ کون ہاتھ ہے جو تیری قوت بغیر چل سکتا ہے ؟ میری جان سب قصوروں کا قصور اِس
پاپوں کی جڑ اپنی ذات پاک کو غلط یا اُلٹا سمجھ لینا ہی تھا "

اور اس ہمہ اوست جذبہ کا پہلو دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا گیا ہے :-

" چھپ کر رونے والی ہندوستان کی عورت کی آنکھ سے ٹپکتا ہوا آنسو کا موتی جو کسی نے بھی گرتے نہیں دیکھا اُسی قانون کشش
ثقل کا مظہر ہے جس کا آسمان میں ٹوٹتا ہوا اور دوڑتا ہوا تارا جو سب کو نظر آنے والا شہاب ہے ۔ شاہی محلوں میں اور اندھی بڑھیا
کے جھونپڑے میں دل کی خواہشیں تو ایک جیسی ہیں اور اندرونی رنج و راحت بھی ایک جیسے اور قانون کامیابی بھی ایک ہی ہے
اس ایک قانون کو جان لیا تو تم گویا تاریخ عالم کو جان گئے "

اور اس کی مزید تشریح خلاصہ کی شکل میں اس طرح کی جاتی ہے :-

" جہاں غیریت دکھائی دیتی ہے وہاں ایک دوسرے کو دیکھتا ہے ، وہاں ایک دوسرے کو سونگھتا ہے وہاں ایک دوسرے کو سنتا
ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کا ذکر کرتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کی بابت فکر کرتا ہے ۔ وہاں ایک دوسرے کو جانتا ہے ۔ لیکن
جہاں سب کچھ ایک ہی آتما ہو وہاں کس کو کس سے دیکھے ۔ کس کو کس سے سونگھے ۔ کس کو کس سے سنے ۔ اس کا کس سے ذکر
کرے ۔ کس کا فکر کرے ۔ کس کو جانے جس سے یہ کل اشیا جانی جاتی ہیں ۔ وہ عین علم کس سے جانا جائے ؂

اے خدا جویان خدا گم کردہ اید   گم درین امواج قلزم کردہ اید "

یہ منتہائے اخلاقِ روحانی اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تعینات کی تمام دیواریں ڈھے جائیں ۔ دُنیاوی علائق کے ساتھ
ساتھ یہ غیر ممکن ہے مگر دراصل انسان کی ہمت کے آگے کوئی چیز غیر ممکن نہیں ۔ بھوکے پیٹ کے لئے جس طرح محنت کر کے غذا بہم
پہنچائی جاتی ہے اسی طرح بھوکی روح کو ریاضت کر کے سیر کیا جا سکتا ہے لیکن ہر ایک کے بس کی بات نہیں " قسمت کیا ہر ایک
کو قسام ازل نے " ـــــ اس لحاظ سے جس کے بھاگ بڑا نے وہی بھگوان کو جانے ۔ لیکن پیغام پہنچانے والے کا تو فرض یہی ہے
کہ ہر ایک کے پاس اپنا پیغام پہنچا دے ۔ اس وقت میرا بائی کا ایک نہایت مشہور مگر سہانا گیت یاد آیا ۔ تفریح طبع کے علاوہ اگر غور سے
دیکھا جائے تو دراصل عام زبان میں یہ اُسی تعلیم کا حامل ہے جس کو سوامی جی نے اپنے جذبات سے رنگین کر کے فلسفہ ویدانت کی صورت
میں پیش کیا ہے ۔ وہ نغمہ یہ ہے :-

رام نام رس پی لے رے منوان   رام نام رس پی لے

تج کے کسنگ ست سنگ بیٹھ نت ہری چرچا سن لے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان رام نام رس پی لے
کام کرودھ مد لوبھ موہ کو چت سے بہائی دیجئے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان رام نام رس پی لے
میرا کے پربھو گردھر ناگر تاہی کے رنگ میں بھیجے رے منوان
رام نام رس پی لے رے منوان رام نام رس پی لے

"رام نام کا رس" یا عشق حقیقی کی کیفیت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو دل سے غصہ گرمی اور حرص و ہوس کے نشے کو دور کر سکے۔ یہ "کام کرودھ اور مد لوبھ" ہی تو تعینات کی نہ گرنے والی دیواروں کا سبب ہیں۔ بظاہر آج کل کی زندگی میں اس سے چارۂ کار نہیں۔ پہلے بھی بڑے بڑے صوفیائے کرام اور پرم ہنس پیشوا زمانے کی رفتار کے موافق اپنے اپنے رنگ میں اس کے خلاف پرچار کرتے رہے۔ کچھ لوگوں پر ان کی سعی کارگر بھی ہوئی مگر اس پروپیگنڈے کو عمومیت کبھی نہ حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ اب وہ زمانہ آیا کہ ہمارشیوں نے تعینات کے پردوں ہی پر روحانی تعلیم کے نقش و نگار بنانے شروع کئے۔ صرف اسلئے کہ مغرب کی مادیت مشرق کی روحانیت کو بالکل ہڑپ نہ کر لے۔ اس میں شک نہیں کہ سوامی رام تیرتھ کے مشن نے اہلِ مغرب کے من کو بھی موہ لیا۔ آج کل ہمارشی ٹیگور کا "پیام سکون" نوجوان طبقے پر اعجاز ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن ہمارشی موصوف نے روحانیت کو نیچر کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ایک دوسرے میں تمیز کرنا سخت مشکل ہے اور چونکہ ان میں یہ رنگ مجاز زیادہ غالب ہے اس لئے بادی النظر میں ٹیگور کے پیام سکون پر روحانیت کا اطلاق ہی نہیں ہوتا تاوقتیکہ ہر موضوع پر مزید تشریح نہ کی جائے۔ سوامی رام تیرتھ آرائش و زیبائش کی طرف زیادہ رجوع نہیں ہوتے وہ تو پھول کی خوشبو سے عطر بناتے اور زندگی کو اس سے معطر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں روحانی تعلیم پیش پیش ہے۔ وہ اس جذبہ کو شاعرانہ جذبات اور تخئیل سے شیر و شکر کر کے اس طرح دکھاتے ہیں کہ دل کو اس سے ایک قسم کا سکون ہی نہیں محسوس ہوتا بلکہ وہ ان کے پیام کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور خود بخود رُو بہ اصلاح ہونے کا خواہاں ہو جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کے لکچر کا ایک دلچسپ حصہ ہے جو اپنی دلفریبی کے لحاظ سے ہمارشی ٹیگور کے افسانوں کی طرح ایک پیام سکون ہی نہیں بلکہ مصلح شیراز (سعدی) کی حکایتوں کی طرح تعلیم اخلاق ہونے کے علاوہ کسی بڑے پرم ہنس پیشوا کی روحانی تعلیم بھی ہے اور عہد جدید کے کسی بڑے نقاد کی طرح مغربی تعلیم اخلاق پر ایک دلچسپ تنقید بھی ہے۔

"ظلمتِ شب کی کالی چادر چھا رہی ہے۔ ستارے جگمگا رہے ہیں۔ کسی کی مجال کیا کہ ان کی تعداد کا اندازہ لگا سکے۔ بل بے کثرت۔

ایک ہی پلنگ پر ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے دولہا دلہن آرام میں پڑے ہیں۔ لیکن دولہا تو نا خوں بال ہو رہے ہیں

امتحان کے پرچے لکھ رہا ہے اور دلہن اپنی دیورانی یا جٹھانی سے گلہ اُلاہنا کی لین دین میں مصروف ہے۔ اے لو جنگ وجدل شروع ہو گئی۔ چپ رہ بی بی چپ رہ۔ تیرا شوہر امتحان کا پرچہ لکھ رہا ہے۔ اس کو ڈسٹرب مت کر۔ اے لو وہ چونک پڑا۔ نیند اُچاٹ ہو گئی۔ کیسا امتحان؟ کس کا ٹاؤن ہال؟ یہاں تو نہ زمین ہے اور آپ ہے۔ کمرے کے باہر آکر دیکھا تو کہیں کہیں کے تڑمے لگ رہے ہیں۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا۔ صبح کا پیش خیمہ ابھی نظر نہیں آتا۔ ارے زہرہ تیرا سرود و رقص کیا ہوا! تمہارے ہمدم و ہمساز ستارے خوشی کو بھول گئے۔

دولہا میاں نے نوکر کو آواز دی۔ جواب ندارد۔ پاس جا کر دیکھا تو خواب خرگوش کے خرّاٹے بھر رہا ہے۔ ہمارے نوجوان کے چھوٹے سے سینے میں طوفان برپا ہو گیا۔ طبیعت میں ایک فوری جوش پیدا ہوا۔ چہرہ ڈراؤنی رات سے بھی زیادہ مہیب ہو گیا۔ نوکر کو بُری طرح جگایا۔ اور کان کھینچ کر تاکید کی کہ اب آنکھ نہ جھپکے۔ ہشیار رہے۔ رات بڑی ہولناک و بھیانک ہے۔ سب طرح کا ڈر ہے وغیرہ۔ اِدھر نوکر بیدار و بیزار ہوا اُدھر آقا صاحب پڑھنے کے کمرے میں گھُسے لیمپ روشن کر کے بَین کا علمِ اخلاق پڑھنے لگے۔ کوئی ایک آدھ صفحہ پڑھا ہوگا کہ آنکھ لگ گئی۔ پیر فرش پر۔ کمر کرسی پر اور سر کتاب کے اُوپر میز پر دھرے بیہوش پڑے ہیں۔ ان کو تو نیند کی گرم گود میں چھوڑو۔ اب باہر ٹھٹھرتے ہوئے ملازم کی خبر لو۔ وہ بیچارہ سخت جدوجہد میں پڑا ہے بلکہ جنگ وجدل میں لگا ہے۔ کسی سے لڑ رہا ہے۔ کیا چور گھر میں آ گھُسے۔ نہیں خواب کے مقابلے پر اَڑا ہے۔ نیند سے زور آزمائی کر رہا ہے۔ آنکھیں ملتا ہے۔ جمائیاں آتی ہیں۔ انگڑائیاں لیتا ہے۔ ہائے کب پَو پھٹے گی تڑکا ہوگا۔ صبح مُنہ دکھائے گی۔ بار بار آسمان کو تکتا ہے۔ رات کٹتی ہی نہیں۔ کبھی ٹہلنا شروع کرتا ہے۔ پھر مارے ٹھنڈ کے چارپائی کی پناہ لیتا ہے۔ ہاں خوب سُوجھی۔ گانا شروع کرو۔ وقت معلوم نہ دے گا۔ ساتوں سُر ملے ہوئے آواز سے گانے لگا:۔

نیند تو ہے بیچو نگی آلی — جے کوئی گاہک ہوئے
آئے سئے موہنا گھوم گئے انگنا — میں بیرن رہی سوئے
نیند تو ہے بیچونگی آلی
سور داس پربھو اب جو ملو گے — نہ اکھوں گی نین سموئے
نیند تو ہے بیچونگی آلی"

گانے کی آواز سن کر کمرے کے اندر بابو بھی جاگ پڑا اور پڑھنے لگا۔ نوکر لہرا لہرا کر گا رہا ہے۔ اپنی دھن میں مست ہو رہا ہے۔ صبح اور شب کو بالکل بھول بیٹھا۔"

یہ تمام عبارت سوامی جی کے اُس پیام کی تشریح ہے جس کو دوسری جگہ انہوں نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

"سزا دینا اور کینہ پروری وہ گدھ ہے جو صاف بتا رہا ہے کہ تمہارے اندر جہل کا مُردار سڑ رہا ہے۔ بغیر مردار کے خیمہ گاہ گدھ کبھی نہیں آتا۔"

متذکرۂ بالا تمثیل میں نوکر آقا کی ناراضی اور زجر و توبیخ سے بے نیاز ہو کر اپنی ہستی کو ہمہ تن نغمہ بنا دیتا ہے جو صبح کی لاہوتی فضا میں احساس الوہیت سے بالکل ہم آہنگ ہے یعنی اُس کی ہستی انسانیت کے درجے سے اس وقت بالاتر ہی نہیں بلکہ ہمہ اوست کی ایک خوابی تعبیر ہے۔

فلسفۂ ویدانت کے متعلق اہلِ علم میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں بھی ہیں جو اواگون وغیرہ کے مسئلوں سے اور بھی زیادہ پیچیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ سوامی جی نے اوپر لکھی ہوئی مثالوں کی طرح اپنی انشا پردازی کے ذریعہ سے ہر قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اواگون محض ایک نام ہے جس کو دوزخ و بہشت کی طرح ایک تمثیلی ذریعۂ تعلیم سمجھنا چاہئے۔ دراصل خواہش اور لوبھ کا نشہ ہی انسان کو دیکھتا نہیں ہونے دیتا اور جس وقت یہ نشۂ آرزو دل و دماغ سے بالکل نسیاً منسیا ہو جاتا ہے (جس طرح اوپر لکھی ہوئی تمثیل میں نوکر کیفِ نغمہ میں کچھ دیر کے لئے بالکل نئے ہو گیا) اس وقت روح اپنے اُس سرمدی مرکز کی طرف خود بخود کھنچ جاتی ہے جس نے اس کو بظاہر آزمائش کی آلائش میں مقید کر رکھا ہے۔ پس بقول سوامی جی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

"کوئی بھی شخص دراصل نہ تو مقید ہوتا ہے نہ نجات پاتا ہے۔ نہ آواگون کے ماتحت ہوتا ہے۔ پرکرتی ہی سب پُرشوں کے آگے پھنستی ہے آزاد ہوتی ہے اور تناسخ میں گھرتی ہے۔"

فلسفۂ ویدانت میں عموماً اسباب واوقات کے تعین اور احساس و خواہشات کی تلقین ہی کو دوسرے معنی میں مایا جال کہا گیا ہے۔ جس کی مثال عام زندگی میں سوامی جی نے اس طرح بہم پہنچائی ہے:-

"جب تم کسی دقیق معاملہ کی چھان بین میں مستغرق ہوتے ہو تو گو آنکھیں کھلی ہوں سامنے سے کیا کچھ گزر جائے دکھائی نہیں دیتا۔ کان بند نہ ہوں پر شور و غل سنائی نہیں دیتا۔ وجہ یہ ہے کہ تم نے توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ تمہاری طرف سے "کن" نہیں ارشاد ہوا۔"

المختصر سوامی جی کا پیام فلسفۂ ویدانت کی تشریح کے اعتبار سے اردو زبان میں ایک خاص اہمیت اس وجہ سے رکھتا ہے کہ آج تک اس زبان میں اس سادگی اور دلاویزی کے ساتھ کسی نے اس کو پیش نہیں کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود اُردو زبان کے علماء اور شعراء اس کو نظر انداز کرتے رہے۔ کوئی مذہب کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہا اور کوئی زلفِ گرہ گیر کی گتھی سلجھانے میں ہمہ تن مصروف رہا جس سے وہ کچھ حاصل نہ حصول معنت میں تضیع اوقات ہوتی رہی۔ ان باتوں کا خیال کرکے اُردو زبان فلسفۂ ویدانت سے مالا مال ہو کر سوامی جی کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے کم ہے کیونکہ سوامی جی کے پیام میں خشک فلسفہ ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں انشا پردازی اور ادب کا کمال اس طرح ظاہر کیا گیا ہے جو اردو زبان کے بڑے بڑے ادیبوں کے دلوں کو بھی مسخر کرلے۔

زندگی کے آخری ایام میں سوامی جی بہت ہی زیادہ رقیق القلب ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے ان کی نثر نے نظم کا پہلو اختیار کیا جو ہندی پنجابی، اردو، اور انگریزی ہر زبان میں اُسی آن بان کے ساتھ موجود ہے جو کسی اہل زبان میں ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظم میں کہیں کہیں عروض کی غلطیاں ہر زبان میں رہ گئی ہیں مگر زیادہ نمایاں نہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور شاعر تو تھے نہیں نہ ان کو شاعر کہلانے کی آرزو تھی، ان کا کلام جذبات کا ایک دریا تھا جس کا دھارا سطح زمین کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ تیز یا دھیما ہو جایا کرتا تھا۔ غرض اُردو زبان میں وہ ایک کامیاب ادیب کہلانے کے مستحق ہیں اس اعتبار سے ان کی نظم کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک اکتسابی اور فطری جذبے میں کیا فرق ہے۔ ذیل کے مسدس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دیکھئے ایک صوفی ویدانتی نیچر کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے:۔

پہاڑوں کا ہر سمت خاموش سونا ۔۔۔ دوشالہ وہ گنجان پیڑوں کا ہونا
وہ دامن میں سبزے کی مخمل بچھونا ۔۔۔ ندی کا بچھونے کی جھالر پرونا
یہ راحت مجسم یہ آرام میں ہوں
کہاں کوہ و دریا یہاں میں ہی میں ہوں

یہ پربت کی چھاتی پہ بادل کا پھرنا ۔۔۔ وہ دم بھر میں بادل سے پربت کا گھرنا
کڑکنا، گرجنا، چمکنا، نکھرنا ۔۔۔ چھما چھم چھما چھم وہ بوندوں کا گرنا
عروس فلک کا وہ ہنسنا وہ رونا
مرے ہی لئے ہے فقط جان کھونا

یہ وادی کا رنگیں گلوں سے لہکنا ۔۔۔ فضا کا یہ خوشبو سے ہر سو مہکنا
یہ بلبل سے خنداں لبوں کا چہکنا ۔۔۔ وہ آواز سنے کا بہر سو لپکنا
گلوں کی یہ کثرت ارم روبرو ہے
یہ میری ہی رنگت یہ میری ہی بو ہے

.. ..

چڑھائی مصیبت اُترنا یہ مشکل ۔۔۔ پھسلنی برف ترسے آفت یہ بادل
قیامت یہ سردی کہ بچنا ہے باطل ۔۔۔ یہ بوٹیوں کی کہ گھبرا گیا دل
یہ دل لینا جاں لینا کس کی ادا ہے
مری جاں کی جاں جس پہ شوخی فدا ہے

عجب لطف ہے کوہ پر چاندنی کا | یہ نیچر نے اوڑھا ہے جالی دوپٹہ
دکھاتا ہے آدھا چھپاتا ہے آدھا | دوپٹے نے جوبن کیا ہے دوبالا

نشے میں جوانی کے معشوق نیچر
ہے لیٹی ہوئی رآم نے مست ہو کر

اردو غزل نے کس کے دل کو مسخر نہیں کیا لیکن ہر وہ شخص جو اردو ادب سے بخوبی آگاہ نہ ہو اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ سوامی رام تیرتھ نے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام کا تمام وکمال مطالعہ نہ کیا ہو۔ غالباً اسی وجہ سے اُنہوں نے متعدد غزلیں لکھیں جو ان کے دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔ بطور تمثیل یہ غزل ملاحظہ ہو:۔

سرود و رقص و شادی دمبدم ہے | تفکر دور ہے اور غم کو رم ہے
مبارک ہو طبیعت کا یہ کھلنا | یہ رس بھینی اُوسنتھا جام جم ہے
"مبارک" کہہ رہا ہے چاند جھک کر | سلاموں سے کمر میں اسکی خم ہے
رکھیں گے آگے کیا کیا ہم نہ اُمید | کہ مارا گرگِ غم پہلا قدم ہے
نہ کہتا تھا تمہیں کیا رآم پہلے | صباحِ عید آئی رات کم ہے

فارسی زبان کا حسن سوامی جی کے دل کو مسخر کئے رہتا تھا سو وہ اکثر حضرت عثمان ہارونی ؒ کی وہ غزل پڑھا کرتے تھے جس کی ردیف "می رقصم" ہے۔ اربابِ تصوف میں یہ غزل بہت مشہور ہے۔ یہاں بطور حوالہ مطلع لکھا جاتا ہے:۔

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم | مگر نازم بریں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم

وفورِ کیف کے عالم میں بے خود ہو کر سوامی جی اکثر یہ غزل پڑھتے اور ایک وجدانی کیفیت میں آہستہ آہستہ گھوما کرتے تھے۔ آپ نے اپنی پنجابی زبان میں اس غزل کو تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے۔ یہاں ان کی مَن ترنگ لفظ بلفظ لکھی جاتی ہے جو شاید اسی غزل سے مستفاد ہے۔ اردو اور پنجابی یا یہ کہ ہندوستانی اور پنجابی اس میں باہم شیر و شکر ہیں[1]:۔

ناچوں میں نٹ راج رہے | ناچوں میں مہاراج

سُورج ناچوں تارے ناچوں | ناچوں بَن مہتاب رہے
تَن تیرے میں مَن ہو ناچوں | ناچوں ناڑی ناڑ رہے

[1] یہ نظم راقم کو اچھی طرح یاد نہیں۔ خصوصاً ساتویں شعر کی بابت کچھ شک ہے۔ ابتدائی اشعار بالکل صحیح ہیں۔

بادر ناچوں بایو ناچوں ناچوں ندی ارناپ رے
قطرہ ناچوں سمندر ناچوں ناچوں موگھر کاج رے
مدھوا لب بدمستی والا ناچوں پی پی آج رے
گھر لاگو رنگ رنگ گھر لاگو ناچوں پا پا واج رے
راگ گیت سب ہوت ہر دم ناچوں بلورا ساج رے
رام ہی ناچت رام ہی باچت ناچوں ہو نرلاج رے

ناچوں میں مہاراج!

کیا فیثا غورث کے نظریۂ "سرود انجم" کا تصور اس نظم سے نہیں ہو سکتا؟ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ اجرامِ فلکی کے درمیان "زہرہ" رقص اور کیف کے عالم میں اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہے کہ میرا رقص اس پروانے کے رقص سے جو شمع کے گرد ہو رہا ہے اسکیل پر بالکل مطابق ہے ؎

تپش چوں حالتے آرد بروے شعلہ می رقصم خلش چوں لذتے بخشد بنوکِ خار می رقصم

الغرض اسی طرح ہر زبان میں سوامی جی نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ اردو زبان میں سوامی جی کو خواجہ میر درد دہلوی کا کلام بہت پسند تھا وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے کہ:-

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں گر وار ہیں تو ہم ہیں اور یار ہیں تو ہم ہیں

یہ وہ بہت پڑھا کرتے تھے۔ ان کا کوئی لیکچر اس غزل کے اشعار سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ علامۂ اقبال کی نظم سے سوامی جی کو ایک خاص دلچسپی تھی۔ خصوصاً یہ اشعار تو وہ اپنی من ترنگ کے عالم میں اکثر پڑھا کرتے تھے:-

بن کے گیسوئے رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں

سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے

علاوہ ان حضرات کے سوامی جی کے لیکچروں میں میر ضامن علی جلال لکھنوی کا کلام بھی نظر آتا ہے خصوصاً یہ اشعار:-

شوق اللہ رے اس چشمِ تماشائی کا حوصلہ تنگ ہو جاتا ہے بینائی کا
آج کچھ پلٹے ہی جاتے ہیں وہ آئینے سے نشہ بیخود کئے دیتا ہے خود آرائی کا

بے نشاں سنگ در یار ہی کو کرنا تھا   دل پہ اک داغ ہے کمبخت جبیں سائی کا

اور یہ شعر تو متعدد دلکھوں میں دیکھا گیا:۔

جلال اس بت کا بندہ دل سے ہو جاؤں جو بتلا دے   یہ کیا جھگڑا لئے پھرتے ہیں شیخ و برہمن اپنا

ہندی زبان میں ان کو ایسا ہی ملکہ تھا جس طرح کہ اردو میں۔ مگر ہندی شعرا میں سورداس جی اور کبیر صاحب کے کلام سے ان کو زیادہ رغبت تھی۔ اور بلھا شاہ کی کافیاں تو ہر وقت ورد زبان رہتی تھیں جن کے متعلق اگر ممکن ہوا تو علیحدہ کچھ لکھنے کی کوشش کی جائیگی زندگی کے آخری ایام میں ان کے قلب کی وجدانی کیفیت میں زیادتی ہوتی گئی اس لئے ان کی نظم سے عروض کی پابندی بالکل اٹھ گئی اور وہ جو کچھ لکھتے تھے ایک آزاد نغمہ ہوتا تھا۔ اس وقت کا ذکر ان کے ایک شاگرد نے اس طرح کیا ہے:۔

"ایک بلند پہاڑی پر رام بھگوان کی کٹیا سے قریب ایک فرلانگ پر میدان ہے۔۔۔۔ کٹیا کی لمبائی تقریباً ۳ گز اور چوڑائی ۲ گز ہوگی۔۔۔۔ اس کے اندر کیا رکھا ہے؛ پانچ چھ چھوٹے بڑے صندوق ہیں جن میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہیں۔ چاروں وید۔۔۔۔ ویدانت کی مشہور کتابیں جو آج تک سنسکرت میں لکھی گئیں۔ اور مولینا روم و شمس تبریز، فارسی میں اور ایمرسن اور والٹ وہٹ مین انگریزی میں۔۔۔۔ ایک بکس میں رام بھگوان کے ہاتھ کی لکھی کتابیں تھیں جو دو تین فلسکیپ کے ریم سے کم نہ ہونگی۔۔۔۔ ہوا دھیمی دھیمی چال سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ اس وقت رام کے دل میں ایشور کے پریم کا سمندر امڈا اور رام نے لیٹے ہوئے یہ گایا:۔

ہے رو کر یہ تکرار الفت تو تجھ سے	مرے جسم و جاں میں ہو حرکت تو تجھ سے
اُڑے مامنی کی وہ شرکت تو تجھ سے	ملے صدقہ ہونے کی عزت تو تجھ سے
سدا ایک رہنے کی لذت تو تجھ سے	رفیقوں میں گر ہے مسرت تو تجھ سے
عزیزوں میں گر ہے محبت تو تجھ سے	خزانوں میں جو کچھ ہے دولت تو تجھ سے
امیروں میں ہے جاہ و دولت تو تجھ سے	حکیموں میں ہے علم و حکمت تو تجھ سے

بے رونق جہاں یا ہے برکت تو تجھ سے

بعد ازاں بلھا شاہ کی وہ کافیاں جو کہ اس نے اپنے پیر شاہ عنایت کی مفارقت میں کہی ہیں دل چیرنے والے لہجے میں سنائیں۔ ایسا آنند امڈا کہ ہم لوگ بے سُدھ ہو گئے اور رام بھگوان کو بھی گاتے گاتے یہ خیال نہ رہا کہ کیا وقت ہے اور ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں" (رسالہ ست اپدیش)

اس طرح یہ اہل دل جہاں تک معلوم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس دنیا کی زندگی اس کے نزدیک مایا کا جال تھی جس میں یہ طائر قدسی زیادہ عرصہ تک مقید نہ رہ سکتا تھا۔ آخر اس کو توڑ کر وہ اپنے اس آشیانہ میں جا بیٹھا جو محبت کے گنبد نور کے پاس ہی کسی فردوسی شجر کی شاخوں پر بنایا گیا ہے۔۔۔ یہ نہیں معلوم کہ اس گنبد میں داخلہ کی اجازت اس کو ہوئی یا نہیں اس کے متعلق کچھ

لکھنا ابھی خیالِ خام ہے کیونکہ دارالسلام کی طرف بُلانے والے کی دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔

لیکن سوامی جی ہم میں اور آپ میں اب بھی موجود ہیں اور بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ:۔

در سخن پنہاں شدم چوں بوئے گُل در برگِ گُل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس لئے لازم ہے کہ آخر میں سوامی جی کے پیام سے چند خاص خاص اقتباسات اور بھی لکھیں اور اس مضمون کو اُن کی زبان سے ادا کئے ہوئے الفاظ ہی کے ساتھ ختم کریں:۔

"اے انسان تیرے اندر وہ دولتِ عظیم اور طاقتِ لا انتہا ہے کہ اس کا باقاعدہ اظہار ہی ملکِ دنیا اور خدا تک کو خوش کر سکتا ہے۔ اے گُل نوبہار تُو اپنی ذات میں خنداں تو ہو۔ اس ایک کے فرض ادا کرنے میں تیرے باقی سب فرض ادا ہو جائیں گے"

"پرمیشور ان کی سہایتا کرنے کو حاضر ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کو تیار ہوں۔ جب آدمی پورا ادھیکاری (مستحق) ہو گا تو اس کا ادھیکار (حق) ہی اس کو خود بخود ڈھونڈھ لے گا"

"میرے پیارے نوجوانانِ ہند تم گئی گزری اٹھارہویں صدی کے ڈیوڈ ہیوم وغیرہ کے بھرے میں آ کر جہل کا نام علم مت رکھو"

"پیارے ہندیو اپنے دل میں خلوص کو جگہ دو۔ اکبر بادشاہ کا سا دل پیدا کرو۔ یہی زندہ دلی ہے۔۔۔ تحصیلِ معرفت دو طرح پر ہو سکتی ہے (۱) تحصیلِ نظری (Theoretical) اور (۲) تحصیلِ عملی (Practical)۔ علم کیمیا کا پڑھنے والا اگر ساتھ ساتھ تجربہ نہ کرتا جائے تو کبھی اس علم سے حظ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہی حال علمِ الٰہی کا ہے جس کے ساتھ ساتھ عمل درکار ہے"

مَیں نے مانا دہر کو حق نے کیا پیدا و لے
مَیں وہ خالق ہوں مری کُن سے خدا پیدا ہوا

سیّد مقبول حسین احمد پوری

جامِ شکستہ

جب سے تو پیارے جام ٹوٹ گیا — میکشوں کا نصیب پھوٹ گیا
تجھ میں اے جام اب وہ مے نہ رہی — کیف کی ہیرے کوئی شے نہ رہی
آج اے جام تجھ کو رو بیٹھے — لطفِ ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھے
تجھ سے ملتی تھی مجھ کو مدہوشی — تجھ سے حاصل تھی خود فراموشی
وجد کا حال تجھ سے تھا دل میں — سحر پنہاں تھا ساغرِ گل میں
بے خودوں کو کبھی جگاتا تھا — آبِ حیواں کبھی پلاتا تھا
تھا تو ہمراز مے پرستوں کا — تھا تو دمساز مجھ سے مستوں کا
تجھ میں کیا بیخودی کے ساماں تھے — رازِ مستی کے تجھ میں پنہاں تھے
دیکھنے میں تو ساغرِ گل تھا — پر حقیقت میں جانِ محفل تھا
تیرا اِس طرح ہاتھ سے جانا — بھر گیا ہے ہمارا پیمانہ
تو نہیں ٹوٹا جی ہی چھوٹ گیا — رشتۂ زندگی ہی ٹوٹ گیا

شیشۂ دل میں تجھ سے مستی تھی — اُجڑی منزل یہ تجھ سے بستی تھی
اب کسے کوئی مُنہ لگائے گا — پھول سا ہاتھ میں اُٹھائے گا
تُو نے بخشی نہ صرف بیہوشی — بارِ غم سے ملی سبکدوشی
آنکھ تجھ پر تھی بادہ خواروں کی — زندگی تجھ سے نو بہاروں کی
دردِ سینے کا تُو ہٹاتا تھا — آتشِ دل کو تُو بجھاتا تھا
صُبح پیتے تھے شام پیتے تھے — تیرے صدقہ میں رِند جیتے تھے
ہم زمیں پر نہ پاؤں دھرتے تھے — آسمانوں کی سَیر کرتے تھے
دم قدم کا یہ تیرے تھا صدقہ — ہم زمیں پر۔ دماغ عرش پہ تھا
اب کہاں دِل گدازیاں تیری — اور مہماں نوازیاں تیری
اہلِ محفل کو تجھ سے آس نہیں — تجھ کو تشنہ لبوں کا پاس نہیں
جب تُو پھرتا تھا شان تھی دُونی — وہی محفل پڑی ہے اب سُونی
جامِ جم سے سوا تھی تیری شان — خاکساروں کا رکھتا تھا تُو مان

مست ناشاد کو بنا دے پھر
راگ وحدت کا تو سنا دے پھر

رام پرشاد ناشاد

اُمّید و بیم

"ذیل کا افسانہ ایڈورن پو کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے۔ وہ اپنی مزاحیہ نگاری کے باوجود درد انگیز جذبات کا دلدادہ ہے، اس کی ہنسی ظریفانہ ہنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ فکر و تردّد کی حامل ہے۔ وہ محض واقعات کا غیر جانبدار اور بے حِس شاہد ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی ہمدردی اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ "ظرافت" اور "رقت طرازی" زندگی کا تار و پود ہیں اور ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات دِل پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔" (ح۔ل)

وہ پیدائشی اندھا تھا۔ اُس وقت سے لے کر جب اُس کی محرومِ بصارت آنکھیں جن کی گہرائی میں بچپن کی معصومانہ بے بسی اور بے چارگی جھلک رہی تھی، ماں کے چہرے پر پہلی دفعہ پڑتی ہوئی دکھائی دیں، وہ اپنی تنہائی کے لمحے تاریکی کی ایک بھیانک دنیا میں بسر کرتا رہا۔ لیکن یہ کوئی موروثی عارضہ نہ تھا جس نے اُسے گہوارۂ طفلی سے لے کر آغوشِ لحد تک اپنی زندگی کے دن رنج و غم کے اُس ناگزیر عالم میں بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس میں روشنی کا گذر تک نہ تھا۔ اُس کی ماں کسانوں کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، وہ ایک خوبصورت سیم تن اور سلیم الطبع عورت تھی جس کی آنکھیں نیلی اور ٹھوڑی عمیق تھی۔ اُس کا باپ ایک قدیم عالی خاندان کا فرد تھا جس کی شہرت پر کبھی بے بصری کا بدنما دھبّا نہیں آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ دردناک مصیبت فطرت کے اُن ناقابلِ فہم اور بعید از قیاس واقعات میں سے ہے جو سائنس کی محیّر العقول تحقیقات کا مضحکہ اڑانے کے لئے وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی کہ وہ اندھا تھا۔

اُس کے لئے سُورج کی نرم روشنی حرارت کے زندگی بخش احساس سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اُس کے ذہن میں پھُول کا تصور ایک دلنشین مہک تک محدود تھا۔ اُس کے احباب چند ہمدردانہ آوازوں اور نگاہوں سے اوجھل جسموں پر مشتمل تھے جن کے ہاتھوں اور ہونٹوں کا لمس اُسے پیغامِ محبت دیتا تھا اور جن کی آنکھوں سے کبھی کبھی گرم آنسو ڈھلک کر اُس کے کملائے عارض کو پژمردہ کر دیتے تھے۔ اُس کی تاریک دُنیا اُن صبر آزما تکلیفوں اور شدید رکاوٹوں سے معمور تھی جو اُس کے جسم کو چُور چُور کئے دیتی تھیں شور و غل سے دل میں خلش پیدا ہوتی تھی۔ اس کی حساس انگلیاں چیزوں کی نا ملائم سطحوں کو مس نہیں کر سکتی تھیں۔ روشنی اور تاریکی، دن اور رات، رنگ اور صورت، فاصلہ اور تناسب، خوبصورتی اور بدصورتی، یہ ایسے الفاظ تھے جو کبھی خوش آئند معنی نہ رکھتے تھے۔

اگر روپیہ سے مراد دولت ہے تو وہ متمول بھی تھا۔ لیکن ذاتی ضروریات کی نسبت اپنی ماں اور بہن کے آرام و آسائش کیلئے وہ زیادہ فراخ دلی سے خرچ کرتا تھا۔ اُس کا باپ جس کے دل میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بڑی بڑی آرزوئیں تھیں، اس کے عہدِ طفلی ہی میں مایوس ہو کر مر چکا تھا۔ بچہ ہوتے ہوتے حسین اور تنومند نوجوان ہو گیا اور آخرکار ایک زبردست اور مضبوط انسان بنا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش طبع اور شریف النفس آدمی تھا جس کے جسم میں قوی روح اور پہلو میں دردمند دل تھا، موسیقی جو اُس کی زندگی کا سرمایۂ ناز تھی اس کے تاریک ترین لمحوں کو تسکین آمیز اور تسلی بخش تانوں سے روشن کرتی، اور انتہائی یاس کے وقت اس کے زخم رسیدہ دل کے لئے مرہم کا کام دیتی جب وہ گاتا تو اس کی آواز بانسری کی سُریلی آواز معلوم ہوتی، اس کے علاوہ پیانو، آرگن، بربط اور وائلن خوب بجاتا تھا، اُسے ادبیات کا صحیح ذوق تھا، اور اوائل عمر ہی میں اس نے اپنے آپ کو رومان کی طلسمی دنیا سے آزاد کر لیا تھا، اچھی صحبت، عمدہ شراب، لذیذ کھانے، تحمل، دل کے اتھاہ سمندر سے لہروں کی طرح اُمنڈتی ہوئی ہنسی، حقیقی دلسوزی اور غیر مصنوعی ہمدردی۔ غرضیکہ انقلاب آبادِ عالم کی ہر چیز میں وہ بے حد سرور حاصل کرتا تھا، وہ ایک مکمل انسان تھا! اور اکثر خوش رہتا تھا، ہاں کبھی کبھی اس کی دائمی تکلیف کوئی ناگوار مزاحمت پیدا کر کے اُس کے دل میں کمزوری کا ہلاکت انگیز احساس از سرِ نو تازہ کر دیتی تھی۔

وہ زیادہ تر سمندر کے کنارے ایک پرانے مکان میں رہتا تھا۔ مدوجزر کے راگ اور پانی کی ملاحت آمیز شیرینی سے لطف اندوز ہوتا تھا، شہروں سے خوف کھاتا تھا اگرچہ اس نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر شہروں میں اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا گلیوں میں آمدورفت کا لامتناہی شور اس کے خوفزدہ کانوں کے لئے ایک عذاب تھا اور بدبو سے ناک میں دم آتا تھا+

کبھی کبھی وہ پہاڑوں پر بھی جا کر رہتا تھا۔ پہلے پہل فطرت کی ان غیر فانی اور استوار یادگاروں کا جادو دانی سکون اُس کی بیقرار قوتِ حس کو تسکین دیتا رہا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ اس بے لطف اور غیر دلچسپ خاموشی سے تنگ آ گیا، وہ تنہائی سے گھبرانے لگا کیونکہ اب اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے پوشیدہ خیالات جرس کی دُور دراز اور مبہم آواز کی طرح اُس کے کانوں میں گونج رہے ہیں، پس وہ دوبارہ سمندر پر جانے کے لئے مجبور ہو گیا، موجوں کے تلاطم، ساحل سے ٹکرا کر واپس جاتی ہوئی لہروں کے جھاگ اور روئی کے گالوں کی طرح اڑ کر چہرے پر پڑتے ہوئے خنک جھاگ سے پھر وہی اطمینان حاصل ہوا+

اس طرح اس کی زندگی کے چوبیس برس گزر گئے، لیکن اس دوران میں کوئی خاص واقعہ نمودار نہ ہوا، وہ زمین، آسمان، اور سمندر کے عجائبات دیکھنے سے بالکل مایوس ہو چکا تھا، بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرینِ امراضِ چشم اس فطرتی نقص کی وجہ دریافت کرنے کے لئے آ چکے تھے، لیکن سب اس بات پر متفق ہو کر واپس چلے گئے تھے کہ اُس کی بیماری انسانی عقل سے بالاتر ہے! وہ اپنے اعزہ و اقارب کی خاطر حیل و حجت کے بغیر اپنے آپ کو ان یاس انگیز آزمائشوں کے سپرد کرتا رہا۔ لیکن آخرکار اُس نے

دل میں کوئی اُمید باقی نہ رہی، وہ کمزور انسان نہیں تھا، قوی دل تھا، اس لئے اب اُس نے محسوس کیا کہ جھوٹی امیدوں کے فریب میں آنا ناامیدی کو دعوت دینا ہے، اور اطمینانِ قلب صرف تسلیم و رضا ہی میں حاصل ہو سکتا ہے"۔

جب پچیس برس کا ہوا تو اُس نے سُنا کہ اٹلی میں ایک ڈاکٹر ہے جو بہت سے پیدائشی اندھوں کو بینا کر چکا ہے۔ اُس نے اپنے ایک معتبر دوست وانی مین کو جو خود امراضِ چشم کا ماہر تھا اس خبر کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے اٹلی بھیجا۔

واپس آکر وانی مین نے کہا "پریرا کوئی اتنا اچھا آدمی نہیں۔ لیکن باوجود اس کے وہ خاص قابلیت کا ڈاکٹر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حاسد معاصرین دنیا کے سامنے اُسے معمولی حیثیت میں پیش کر رہے ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے . . . "

اس کے بعد اس نے اطالوی ڈاکٹر کے طبی معجزے بیان کرنے شروع کئے۔ "وہ فرڈی ننڈ کا علاج کرنے کے لئے تیار ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ"!

"وہ کیا؟" ماں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کہتا ہے کہ اگر فرڈی ننڈ واقعی پیدائشی اندھا ہے تو میں اس کی صحت یابی کی کوئی اُمید نہیں دلا سکتا"۔

اس موقعہ پر عورتوں کے آرزومند چہرے یاس کی تصویریں بن کر رہ گئے۔

"ہاں —— وہ پیدائشی اندھا ہے" ماں نے رُک رُک کر کہا۔

"پریرا (اگرچہ اُس نے فرڈی ننڈ کو نہیں دیکھا) کہتا ہے کہ غالباً ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ اس کا خیال ہے اور مجھے خود اس کا یقین ہے کہ انسان کا اندھا پیدا ہونا نادر ترین واقعات سے ہے، اُس کے قیاس کے مطابق فرڈی ننڈ بینا رہ چکا ہے، خواہ پیدائش کے بعد صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی کیوں نہ ہو"۔

"دراصل ہمیں بھی اس بات کی خبر نہیں تھی، مجھے خود دو روز تک اس دردانگیز حقیقت کا گمان تک بھی نہ تھا، اور اس عرصہ میں میری نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی رہیں"۔

"پریرا اپنی خدمات کو تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہے" وانی مین نے کہا "اور اتنے بڑے آدمی کے لئے یہ بات بہت غیر معمولی ہے لیکن میرے خیال میں وہ کچھ طامع ہے، گذشتہ ایام میں وہ بڑی مصیبت میں مبتلا رہا ہے، اور آج کل جیسا کہ تمہیں معلوم ہے غیر معتقد اور بے وقوف لوگوں کی ایک کثیر تعداد اس پر ہنس رہی ہے جس کی وجہ سے اُس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے"۔

"اگر وہ فرڈی ننڈ کو تندرست کر دے تو ہر ممکن طریقے سے ہم اس کی امداد کے لئے تیار ہیں" ماں نے کہا "فوراً اُسے تار دے دو۔ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہوا۔ تو نقصان تو نہ ہوگا"۔

اطالوی ڈاکٹر کو پیغام بھیجا گیا، ماں اور بہن اس کے علاج کے لئے تیاریاں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

"کیا ابھی کوئی اور ڈاکٹر ہے؟" فرڈی ننڈ نے حیرت زدہ ہوکر غم آمیز ہنسی سے دریافت کیا، "میرا خیال تھا کہ اب اُن کا خاتمہ ہوچکا ہے۔"

لیکن جب دو ہفتہ کے بعد پریرا آیا تو اپنے آپ کو انتہائی صبر وتحمل کے ساتھ اُس نے اِس معجزہ گر کے سپرد کر دیا۔

ابتدائی معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا "صحت یابی کا بہت امکان ہے۔" اس کے بعد اُس نے ایک علمی تقریر شروع کی جس میں چند غیر مانوس طبی اصطلاحیں تھیں۔ فرڈی ننڈ اُن کی تکرار سے تنگ آ گیا، لیکن اس کے باوجود پریرا نے اس کے دل پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ ڈینگ نہیں مارتا تھا اور نہ اُسے غیب دانی کا دعویٰ تھا، اُسے کامیابی کا کامل یقین نہ تھا آخر اس نے اپنی گفتگو کو ان الفاظ پر ختم کیا "معاف کرنا، مجھے اُمید ہے کہ تم ایسے آدمی نہیں کہ اگر تمہارے متعلق کوئی سچی بات کہی جائے تو برداشت نہ کرسکو۔"

"آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے" فرڈی ننڈ نے کہا۔

"کیا تم اُس مایوسی کو برداشت کرسکو گے؟"

"ہاں اس سے پہلے میں اکثر برداشت کرتا رہا ہوں"۔

پھر ڈاکٹر نے کہا "میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بصارت ٹھیک ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ————"

اب وہ ذرا خاموش ہوگیا۔

"ہاں کہئے؟" فرڈی ننڈ نے جواب دیا،

"میں تم سے حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا، اور وہ یہ کہ تمہاری صحت یابی کے صرف عارضی ہونے کا امکان بھی ہے" (پھر اس نے ایک تازہ بحث چھیڑ دی) مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ بینائی ٹھیک ہو جائے گی لیکن ممکن ہے یہ صرف تھوڑے عرصہ کے لئے ہو، کیا تم یہ برداشت کرسکو گے؟"

"بہت مشکل ہے" فرڈی ننڈ نے جواب دیا "لیکن خیر میں برداشت کرلوں گا"

"تم میری بات کو اچھی طرح سمجھتے ہو" اطالوی نے کہا "تم جانتے ہو کہ عارضی بینائی کا کیا مطلب ہے؟ موجودہ حالت میں تمہیں محرومیٔ بصارت کا پورا مفہوم معلوم نہیں، کیونکہ تم نے اپنی آنکھوں کا مطلق استعمال نہیں کیا، لیکن اگر تم اچانک دیکھنے لگ جاؤ خواہ وہ چند گھنٹوں کے لئے ہو یا چند لمحوں کے لئے، اور اس کے بعد پھر اندھے ہو جاؤ، ہمیشہ کیلئے نابینا ————"

وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کی خاموشی معنی خیز تھی،

"جب تک کامیابی کی خاطر خواہ امید ہے" فرڈی نَنڈ نے کہا "میں اپنے آپ کو ہر متصور خطرے میں ڈالنے کیلئے تیار ہوں"۔

پریرا نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا "کافی اُمید ہے بشرطیکہ تم میری باتوں پر عمل کرو"۔

"آپ مجھ پر اعتبار کریں"۔

آخر فیصلہ ہو گیا۔ الماوی ڈاکٹر نے اُس کے گھر میں سکونت اختیار کر لی، اور علاج شروع کر دیا۔

طریقۂ علاج بہت طویل، بے حد تکلیف دہ اور غیر معمولی طور پر صبر آزما تھا، چھ ہفتے تک فرڈی نَنڈ، ایک تاریک کمرے میں کمبل پڑا رہا۔ اُس کی آنکھیں لیپ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اور ابروؤں پر گیلی پٹیوں کی موٹی موٹی تہیں چڑھی ہوئی تھیں، غذا کے متعلق اس پر بہت سی پابندیاں تھیں، اور اُسے ورزش سے روک دیا گیا تھا، دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو چکی تھی، اس نے اُمید و بیم کے اس کسالت انگیز مرحلے کو انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ گذارا۔ غرض ہر لحاظ سے وہ ایک مثالی مریض تھا، اس نے کبھی شکایت نہ کی، ڈاکٹر کو یہ جتانے پر کبھی مجبور نہ کیا کہ یہ کٹھن آزمائش کب ختم ہوگی، اس کی رُوح نے جو بلند ہمتی کا ثبوت اس سن کر دینے والے زمانۂ امتحان میں دیا، اس سے پہلے کبھی ظاہر نہیں ہؤا تھا،

چھٹے ہفتہ کے آخری دن پریرا نے خاندان کے تمام افراد کو جو پہلے ہی مایوس ہو چکے تھے اور بھی خوف زدہ کر دیا، وہ خلافِ معمول ناشتہ کے وقت نہ آیا۔ ایک خادمہ کو چائے کی پیالی دے کر اس کے کمرے میں بھیجا گیا، لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد وہ پریشان ہو کر واپس آ گئی، اور اس کے غائب ہو جانے کی وحشت انگیز خبر سنائی، معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں سے ٹرنک بند کیا ہے اور خود ہی اسٹیشن کو لے گیا ہے۔

ماں اور بہن کے چہرے آہستہ آہستہ زرد ہو رہے تھے، میز کے آرپار وہ ایک دوسرے کو خاموشی سے تک رہی تھیں، اس بلائے ناگہانی نے انہیں مبہوت اور رکبیدہ خاطر کر دیا تھا، جذبات کی فراوانی نے لبوں پر مُہرِ سکوت لگا دی تھی، کیا اُن کے دلکش اور رنگین خوابوں کا یہی انجام تھا؟

"مجھے یہ خط ملا ہے" خادمہ نے کہا اور ماں کی پلیٹ کے نزدیک رکھ دیا۔

لیکن اُس کی مایوس نگاہوں میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی، آخر کار اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور خط اُٹھا کر کھولا۔ اس وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ ڈاکٹر کی بدخط تحریر کو پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکی، خاموشی سے اُس نے خط کو لڑکی کے حوالے کر دیا۔

"اسے پڑھو، پیاری" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

لڑکی نے جس پر اس واقعہ کا کچھ کم اثر نہ ہؤا تھا، بلند آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

ڈاکٹر پریرا اپنے آپ سے شرمندہ تھا، اُس کا وداعی خط رنگین عذر خواہیوں سے لبریز تھا، اس نے لکھا تھا کہ ایک نہایت

ہی اہم فرض نے مجھے دل برداشتہ کردیا ہے، اور میں اپنی فرض شناسی اور ذاتی مقصد سے مجبور ہوکر جارہا ہوں، جنوبی امریکہ کے ایک کروڑپتی نے اپنے لڑکے کے علاج کے لئے جس کی نظر کمزور ہورہی تھی اُسے اڑھائی لاکھ ڈالر دینے کا وعدہ کیا تھا، بشرطیکہ وہ اس کام کے لئے سمندر پار جانے پر رضامند ہو، لڑکے کو اس بلا سے محفوظ کرنے کے لئے اُس کا جانا ضروری تھا۔ فوراً! پریرا کی رائے کے مطابق نوجوان کی متوقع کوری رگ بصری کے ایک سطحی زخم کی وجہ سے تھی اور پریرا برازیل کے ایک ماہر چشم کی تشخیص سے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ ایسا زخم نہایت آسانی سے مندمل ہوسکتا ہے، چنانچہ اُس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر ان حالات کی بنا پر اُس نے قسمت آزمائی کے اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، اس کے علاوہ فرڈی ننڈ کے متعلق کوئی ایسا کام باقی نہیں رہ گیا، جو وہ خود نہیں کرسکتا، لیپ کی آخری تہ خشک ہوجانے کے بعد پٹیاں کسی قسم کی تکلیف کے بغیر اُتاری جاسکتی ہیں، اور اگر فرڈی ننڈ کے مقدر میں بینائی سے بہرہ ور ہونا لکھا ہے تو وہ ضرور اسے حاصل کرلے گا، اس کے بعد چند عام ہدایات تھیں، اخیر میں اطالوی نے اس بار ہا دُہرائی ہوئی تنبیہ کا پھر تکرار کیا تھا کہ ممکن ہے اس چارہ جوئی کا نتیجہ صرف عارضی ہو!

خط پڑھ کر ماں اور بہن کو کچھ تسلی ہوئی۔ ابھی تک اُن کے دل میں امید باقی تھی، فرڈی ننڈ کی صحت یابی کا امکان مایوسی میں تبدیل نہیں ہوا تھا، اس تحریر سے اُن کی اُمید اور بھی بندھ گئی، اب وہ مریض کے کمرے میں ڈاکٹر کے چلے جانے کی اطلاع دینے کے لئے آہستہ آہستہ گئیں۔

وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔

"آہ - اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ وہ مکار آدمی تھا، اس نے ذرا وثوق سے کہا" لیکن جب تک مجھے معلوم نہ ہوجائے میں اس پر پورے طور پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا، انتظار کے چند دن اور باقی ہیں۔ دیکھا جائے گا"!

آزمائش کے آخری دن بہت بھیانک اور اُداس تھے، جلتا ہوا لیپ آہستہ آہستہ خشک ہوگیا۔ پریرا نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا تھا کہ جب تک لیپ کا ذرہ ذرہ آنکھوں سے جُدا نہ ہوجائے پٹیاں نہ کھولی جائیں۔

آخری پانچ دن جس کرب و الم کی حالت میں گزرے ناقابلِ بیان ہے، اُن کے سُست رفتار لمحے اس دردناک ڈرامے کے تینوں افراد کے صبر و تحمل کا امتحان تھے، اب فرڈی ننڈ کی نجات کی ساعت آنے والی تھی، امید و بیم کی یہ ساعت یا تو بنی نوع انسان کی عزیز ترین متاع کو اُس کے لئے ارزاں کردے گی، یا اُس کی دردمند آنکھیں حُسن اور روشنی کی نعمت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جائیں گی۔

آخرکار یہ اہم ترین لمحہ آپہنچا، لیکن وہ ابھی تک کشمکش و پیچ میں تھا، ناگہانی ہیبت اور نامعلوم مستقبل کے دہشت ناک خوف نے

اُس کے ہاتھوں کو پٹیاں کھولنے سے باز رکھا، زندگی میں پہلی دفعہ انسانوں کی عجیب وغریب دُنیا کو دیکھ کر خُدا جانے اس پر کیا گزرے یا اس کے برعکس آنکھوں کے نابینا ہونے کا ناقابلِ برداشت صدمہ نجانے اس کے دل پر کیا اثر کرے!

ماں اور بہن اُس کے تشریح طلب تامّل پر حیرت زدہ ہو کر بے صبری سے کسی بات کا انتظار کر رہی تھیں۔

"نہیں" اُس نے آہستہ سے کہا "میں یہ جرأت نہیں کر سکتا، مجھے —— مجھے ڈر لگتا ہے۔ ماں! آہ، بہتر تھا کہ میں اس خطرناک آزمائش میں نہ پڑتا، اس سے پہلے میں خوش تھا، ہر طرح سے بالکل خوش! لیکن اگر ان سب کوششوں کے باوجود میری قسمت میں اندھیری دُنیا ہے، تو میں کبھی خوش نہیں ہو سکوں گا"

اُس کی ماں نے اپنا ہاتھ تسکین کے طور پر اس کے سر پر رکھا، اُس نے اُسے پکڑ کر چُوما۔

"یہ میری تباہی کا باعث ہے" اس نے ماں کے ہاتھ کو چھوتے ہوئے کہا "ایملی اور تم میری جوانی کو برباد کر رہی ہو" اس نے اپنا سر جُھکا لیا اور سوچنے لگ گیا "میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ یہ بات مجھ پر اب کیا اثر کر رہی ہے" اس نے گنگناتے ہوئے کہا جیسے وہ اپنے جی سے باتیں کر رہا ہو۔ "تم موہوم طور پر بھی یہ نہیں جانتیں کہ میرے لئے اس کا کیا مطلب ہے نہیں۔ تم کیسے جان سکتی ہو، میں نے تمہیں پرندوں، پھولوں، رنگوں، چلتی پھرتی چیزوں، بچوں، سُورج، چاند، ستاروں اور سمندر کا ذکر کرتے سُنا ہے۔ لیکن آہ، میں اس قدیم سمندر کو پہچان سکتا ہوں اس کی آواز سُن سکتا ہوں، میں اس سے کبھی خوف نہیں کھاؤں گا" لیکن ماں —— ذرا سوچو تو سہی" یہ کہہ کر وہ کانپتا ہوا کرسی پر جا گرا، "شاید میں اسے برداشت نہ کر سکوں، لیکن اگر مجھے ایک انسان کی طرح یہ سب کچھ سہنا ہے" تھوڑے سے وقفہ کے بعد اس نے اُمید افزا لہجہ میں کہا "تو تنہائی میں سہنا پسند کروں گا"

"تنہائی میں؟" انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں نہیں! —— تنہائی میں انسان بہترین طور پر دُعا کر سکتا ہے اور خدا کے نزدیک ترین ہوتا ہے۔ اس لئے میں تنہائی پسند کرتا ہوں، کچھ عرصہ ہوا میں نے دُعا کی تھی اور یہ آوازِ غیب اُس کا جواب ہے۔ خُدا کو یہی منظور ہے کہ میں اس سختی کو اکیلا جھیلوں —— ہاں —— ہاں" اس نے آہستہ سے کہا "یہ بہترین طریقہ ہے، اور میں نے اب اس کا مصمم ارادہ کر لیا ہے ماں اور ایملی! اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں صرف اسی طرح اپنی ہمت اور جرأت کے امتحان کا مقابلہ کر سکتا ہوں"

وہ اُس کو چمٹ گئیں، اور بہت گریہ وزاری کی کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ہر چند اس بات کی التجا کی کہ وہ انہیں اپنے پاس رہنے دے لیکن اُس نے ایک نہ مانی، اُن کے آنسو اور نیازمندانہ منتیں رائگاں ثابت ہوئیں۔

"میں اکیلا رہوں گا" اس نے رُوکھے پن سے کہا "جب تک پہلی مرتبہ تمہارے پیارے چہرے دیکھنے کے قابل نہ ہو جاؤں، میں اکیلا رہوں گا، جب تک میں نہ کہوں تمہیں یہاں نہیں آنا ہوگا، تمہیں دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے میں

اِسے تالا لگا دُونگا تمہیں انتظار کرنا پڑے گا خیال کرو میں نے کتنا عرصہ انتظار کیا ہے! جب تک میں خود نہ بلاؤں!"

"لیکن، فرڈی ننڈ ـــــــ" ماں نے پھر التجا کی۔

"ماں"! اس نے ذرا تلخی سے جواب دیا: کیا آپ مجھے اپنے سامنے شرمسار کرنا چاہتی ہیں؛ میرے رونے اور کراہنے سے کسی کو کیا مطلب؛ میں نہیں چاہتا کہ جن لوگوں کو مجھ سے ذرا بھی محبت ہے، وہ اپنی آنکھوں سے مجھے دُکھ اور تکلیف میں دیکھیں نہیں۔ میں اکیلا رہوں گا۔ یہ ملاقات ہم سب کے لئے رنجدہ ہے اب ہمیں جُدا ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو ساری طاقت اسی جھگڑے میں ختم ہو جائے"

وہ اُس کی مرضی کے آگے جھک جانے کی اس قدر عادی تھیں کہ اُس کے الفاظ سُنتے ہی فوراً علیحدہ ہو گئیں۔ وہ دروازے تک اُن کے پیچھے پیچھے گیا، جب وہ چلی گئیں تو اُس نے بند کر کے تالا لگا دیا۔

"یاد رکھو! جب تک میں طلب نہ کروں" اُن کے جانے کے بعد یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔

جب اُس نے اپنے آپ کو تنہا پایا تو فوراً پٹیاں کھینچنی شروع کر دیں، لیکن اُس کی اُنگلیاں کانپتی تھیں، اور ہاتھ کمزور تھے اس لئے پہلی کوشش میں وہ پٹیاں کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکا، وہ جس نے پچیس برس تک صبر و استقلال کے ساتھ زندگی بسر کی تھی اب اضطراب اور بے چینی سے کراہنے لگا۔ اس کشمکش کے دَوران میں اُس کا سر کمرے کی کسی چیز سے ٹکرایا، اور وہ درد کے مارے بچوں کی طرح رونے لگا حالانکہ وہ معمولی تکلیفوں کی پروا نہیں کیا کرتا تھا،

آخرکار اُس نے پٹیاں کھول ڈالیں۔

اس کے بعد ایک مبہم سی چیخ سنائی دی۔

وہ دیکھ سکتا تھا!

اُس کے پپوٹے جو بُری طرح سے زخمی تھے، اوپر نیچے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، وہ اس قدر سخت ہو چکے تھے کہ ہلنے سے کڑکڑانے کی آواز پیدا ہو رہی تھی، لیکن وہ دیکھتا تھا! ـــــ وہ دیکھ رہا تھا! اس دل افروز اور حیرت انگیز حقیقت میں کوئی شک نہ تھا، وہ دیکھ رہا تھا!

پہلے اُسے ایک ہلکا سا دھندلکا دکھائی دیا جس میں بھورے رنگ کی بڑی بڑی بے سروپا اور بے ڈول شکلیں آہستہ آہستہ بہ رہی تھیں، جب اس کی نظر ذرا صاف ہو گئی تو یہ اور بھی واضح ہو گئیں۔ اُن میں ایک قسم کا امتزاج پیدا ہو گیا، ہوتے ہوتے یہ ایسے اجسام میں تبدیل ہو گئیں جو قوت لامسہ سے محسوس کئے جا سکتے تھے۔

اُس کا سر چکرانے لگا اور پاؤں ڈگمگانے لگے، اُن بے شمار آفتوں سے بچنے کے لئے جو اُسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے

تھیں اُس نے بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے، اب وہ کھڑکی کی آڑ میں ایک چھوٹی سی چوکی پر گر پڑا اور ڈر کے مارے اکٹھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ بے حد خائف تھا، لیکن جیسا کہ اُسے پہلے سے ہی خطرہ تھا؛ انتہائے یاس نے اُسے بالکل نڈر بنا دیا تھا، وہ دروازے کی طرف دوڑنے کے لئے بے قرار تھا، لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ ارد گرد کے عجائبات میں سے کونسی چیز دروازہ ہے، وہ چاہتا تھا کہ ماں اور بہن کو بُلانے کے لئے اُسے کھٹکھٹائے، اور زور سے چلّائے، اگر افسردگی کی ایک زبردست لہر اعضا کو بے حس کر کے اُسے اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے مجبور نہ کر دیتی تو وہ اس بے چینی کی حالت میں دروازے کی طرف دوڑ کر ہمیشہ کے لئے خودداری سے ہاتھ دھو بیٹھتا، لیکن اب اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا کہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کو حیرت زدہ ہو کر دیکھے اور اپنی رگوں میں خون کے کھولنے اور دل کی تیز اور بے پناہ دھڑکن کی آوازیں سُنتا رہے۔

فضا پُرسکون تھی، مطلع ابر آلود تھا، سمندر اور آسمان دونو دُھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے، صرف ساحل کا ایک تکونی حصہ جہاں پاؤں تلے روندی ہوئی سیاہ ریت کے تودوں کے سوا کچھ نہ تھا، کھڑکی میں سے نظر آ رہا تھا، ایک جہاز بادبانوں کو پوری طرح پھیلائے ہوئے سامنے سے گذرا، وہ اس کی ہئیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیا یہ پرندہ ہے؟ پھر اُس نے مرغابیوں کا ایک جھنڈ دیکھا، میلے اور گرد و غبار میں اَٹے ہوئے آسمان کے بالمقابل سیاہ دھبّے! لیکن وہ سفید؛ تیرتی ہوئی بلند چیز کیا ہے؟ ناواقف کتابی کیڑوں کی طرح جہازوں کے متعلق اُسے سب خیالی معلومات حاصل تھیں۔ لیکن وہ اس جہاز کو بالکل نہ پہچان سکا۔ اگرچہ تصوّر میں کئی بار اس نے جہاز کو آندھی سے بچانے کے لئے بادبانوں کو لپیٹا ہو گا۔

لمحۂ انکشاف کے اس مختصر عرصہ میں اُس کی دُنیا کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔

اُس کا خوف مُسرت کے ساتھ دُور ہو رہا تھا، اس کی بے حسی ختم ہو چکی تھی، لیکن اب ماں اور بہن کو اپنے پاس بُلانے کی کوئی خواہش نہ تھی، قوائے حس پر مسرت کا پُرجوش مگر دُنیا جہان سے بے نیاز کر دینے والا احساس غالب آ چکا تھا، دماغ ناکارہ ہو چکا تھا قوتِ فکر نے جواب دے دیا تھا، وہ اپنے ابتدائی تاثرات کو منضبط نہیں کر سکتا تھا، یہاں تک کہ اس کے بعد بھی وہ انہیں کبھی بیان نہ کر سکا۔

ایک اخبار ہوا کے جھونکے سے اُڑ کر اُس کے سامنے سے گزرا۔ کیا یہ آدمی ہے؟ وہ حیران تھا! پانی کے چڑھاؤ سے بل کھاتی ہوئی موجیں ریتیلے کنارے سے ٹکرا کر لالی سے جھاگ میں تبدیل ہو رہی تھیں اور اُن کی آواز اُس کے کانوں میں صاف طور پر آ رہی تھی، اُس نے سمندر کو پہچان لیا! لیکن کیا سمندر صرف ان تھپیڑے کھاتی ہوئی کف در دہاں لہروں کے سلسلے کا نام ہے یا اس میں وہ ناپیدا کنار اور قلابازیاں کھاتی ہوئی وسیع سطح بھی شامل ہے جو پہلے اوپر کو چڑھتی ہے پھر دُور جا کر ارغوانی اُفق

میں غائب ہو جاتی ہے، اس کے بعد رنگ بدل کر گنبدوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے اور زمین و آسمان کو نیم رنگین اور غبار آمیز دُھند سے معمور کر دیتی ہے!

ایک پتلا سا کمزور لڑکا بالو پر دوڑتا ہوا دکھائی دیا، اور روپوش ہو گیا! کیا وہ آدمی ہے؟ وہ پھر کانپنے لگا۔

اُس کے دل میں آئینہ کا کوئی تصور نہ تھا۔ اور اگر وہ اُسے دیکھنا بھی چاہتا تو ایسا نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ پریرا نے اپنی عام ہدایات میں اس بات پر غیر معمولی زور دیا تھا کہ جب تک فرڈی نند اپنی نو یافتہ حس کو اچھی طرح استعمال کرنے کا عادی نہ ہو جائے اور اشیا کے باہمی فاصلوں اور انتشارِ نُور کے ابتدائی اصُولوں کو نہ سمجھے اُسے دیر تک آئینہ دیکھنے کی اجازت نہ دی جائے، پریرا نے اکثر آدمیوں کو آئینہ پر پہلی دفعہ نظر ڈالنے سے دیوانہ ہوتے ہوئے سُنا تھا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے بھی ایسا دیکھا تھا۔

اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا،

اب اُس کی ماں جس کی پریشانی دیگر خیالات پر سبقت لے جا رہی تھی دبے پاؤں دروازے کے پاس آئی، اور آہستہ سے کھٹکھٹانا شروع کیا، اس نے آواز سُنی اور مطلب سمجھ گیا، اب اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ دروازہ ہے۔ وہ اُسے غور اور تعجب سے دیکھنے لگا کیونکہ یہ پہلا راز تھا جو شعور کی حالت میں اُس پر کھلا، ماں نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا اور اُس نے آواز پہچان لی۔

"نہیں۔ ابھی نہیں" اس نے جواب دیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں دیکھ سکتا ہوں" اس نے ماں کو فرطِ انبساط میں چیخ مارتے ہوئے سُنا "لیکن ——— ابھی نہیں۔"

جب وہ چلی گئی اور اُس کے پاؤں کی آہٹ بھی جاتی رہی تو وہ احتیاط سے اُٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا، لیکن وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا تھا، وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور گھسٹتا ہوا صوفے کی طرف چلا گیا، اور وہاں ٹھٹک کر بیٹھ گیا، اب اُس پر ایک نیا خوف طاری ہو رہا تھا،

خوف پھر جاتا رہا، اس نے پہلے ہی یہ سب کچھ سوچ رکھا تھا، اس لئے اب قطعاً بے ہراس تھا، جب تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا بالکل محفوظ تھا، صحیح الحواسی اس کی رعشہ براندامی پر ہنسنے لگی۔ اب اُس کے ہوش و حواس ٹھکانے ہو رہے تھے، اگر اس کی جگہ کوئی کمزور دل اور غیر مستقل مزاج آدمی ہوتا تو اِن اوہام کے اثرات سے کبھی جانبر نہ ہو سکتا، لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ زندگی کے اس نازک ترین وقت میں اگر وہ لمحے بھر کے لئے بھی کمزوری کا ثبوت دے گا تو ممکن ہے کہ بصیرت اور شعور سے بھی محروم ہو جائے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ محرومی بے بصری سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

جس طرح آفتاب زدہ پھولوں پر آہستہ آہستہ اوس پڑنے لگتی ہے اسی طرح اس کی رُوح پر امن اور تسکین کی فرحت افزا بارش

شروع ہوئی۔ جب اس معجزے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اُسے مکمل احساس ہؤا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔
اُس کی کنپٹیاں تپک رہی تھیں، حلق کوئلے کی طرح خشک تھا، سانس دانتوں میں سے سیٹیاں بجاتا ہؤا باہر آتا تھا، اور سینے میں پھیپھڑوں کے گڑگڑانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

ماں نے پھر دروازے پر دستک دی اور اس نے پھر وہی جواب دیا، "نہیں ـــــ ابھی تھوڑی سی دیر ہے"۔
اس نے ماں کو انتہائی محبت کے ساتھ اپنا نام گنگناتے ہوئے سُنا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ابھی اُسے دیکھنے کا مناسب وقت نہیں آیا۔ سجانے پیاری اور خوبصورت ماں کا پہلا نظارہ اس پر کیا اثر کرے، اس آنے والی خوشی کے تصور سے اُس کا دل دہلتا تھا۔

ایک دفعہ پھر اس نے سمندر اور آسمان کو حیرت زدہ ہو کر دیکھنا شروع کیا،
تقریباً دو گھنٹے اس از خود رفتگی کی حالت میں گزر گئے، نئی حس کی ہولناک تیزی کچھ کم ہو گئی تھی، مسرت کے احساس نے اُس کی قوتِ ارادی کو معطل کر دیا تھا، چنانچہ نقاہت کی وجہ سے صوفے میں ٹیک کر بیٹھ گیا، اُس کی ماں دو دفعہ اور دروازہ کھٹکھٹا چکی تھی، لیکن وہ نہایت سرد مہری سے اُسے ناکام واپس بھیجتا رہا۔ وہ ہر مرتبہ بے دلی سے اس کا حکم مانتی رہی، اور آخری بار اس ظلم کی بنا پر اُس نے نرم آمیز ضد کو بُرا بھلا بھی کہا تھا۔

"اگلی دفعہ" اُس نے اپنے جی میں کہا۔ اور فرطِ شوق سے مسکرایا، لیکن اُس کے چہرے سے مسکراہٹ جلدی غائب ہو گئی، جیسے کسی تازہ صدمہ سے:
یہ کیا تھا؛

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور آنکھیں ملنے لگ گیا، ان میں درد اور جلن تھی، وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور بیرونی منظر کو ٹکٹکی باندھ کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ کیا اُس کے دوبارہ نابینا ہو جانے کا امکان تھا؛ اس نے اپنے جلتے ہوئے پپوٹوں کو بند کیا اور پھر کھولا۔ سمندر اور آسمان کی ہم آہنگ سیاہی مائل رنگت مدھم پڑ چکی تھی، چیزیں ظاہری شکل و صورت میں دھندلی اور موہوم ہو رہی تھیں۔ اب اُسے اس بات میں کوئی شک نہ تھا، کچھ عرصہ پہلے ریتے پر گھاس کا ایک سرسبز قطعہ اُسے صاف طور پر نظر آ رہا تھا! لیکن اب بالکل بے رنگ ہو گیا تھا، اور تاریک میدان پر ایک نامعلوم دھبے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا، اور وہ اُٹھتی ہوئی موجیں! اُن کا یکساں اُتار چڑھاؤ، بڑھتی ہوئی تیزی، اور کنارے سے ٹکرا کر اچانک جھاگ میں تبدیل ہونا، وہ یہ سب باتیں دیکھ چکا تھا، لیکن اب ـــــــــ،

وہ صوفے سے کمر لگائے خاموش ہو کر لیٹا رہا، اُس کی آنکھیں مضطربانہ انداز میں کمرے کے چاروں طرف گھوم رہی تھیں، دیواری کاغذوں اور غالیچوں کے نقش و نگار، دروازے کے منقش پردے، چھت اور سامانِ آرائش سب غیر محسوس طور پر

مانند پڑ رہے تھے۔

پھر اُسے اطالوی ڈاکٹر کی تنبیہ یاد آگئی، کہ ممکن ہے میری بصارت صرف عارضی طور پر بحال ہو! "شاید چند گھنٹوں کے لئے یا صرف چند لمحوں کے لئے!" خوشی کی ترنگ میں وہ اس بات کے یاس آفریں امکان کو بھول چکا تھا، اب یہ اندوہناک حقیقت ایک سیاہ اور غم انگیز بادل بن کر اُس پر چھا رہی تھی، اُس کی اُمیدیں خاک میں مل رہی تھیں، زرّیں مستقبل کے خوابوں کی تعبیر اُس کے سامنے تھی! وہ اپنے آپ کو تاریکی کے سپرد کر دے گا؟ کیا وہ پھر اُسی اندھیری دُنیا میں چلا جائے گا؟ اس دُنیا کی ایک جھلک اور بس! زمین کے اسرار و عجائب کے انکشاف کا ایک مختصر وقفہ اور پھر موت تک گہرا اندھیرا!

وہ درد کے مارے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اُس کی آنکھیں جلدی جلدی روشنی کھو رہی تھیں، بخت ناساز گار عیش و راحت کی زندگی سے لذت آشنا کرنے کے بعد اسے عین کامگاری کے وقت اس نعمت سے مایوس کر رہا تھا، اس ناقابلِ بیان ستم ظریفی اور نامساعدت پر اُس کی رُوح کی گہرائی سے بددُعائیں نکلنے لگیں۔

اُس نے زور سے ایک چیخ ماری، اُٹھا اور بے دھڑک ہو کر بڑھتی ہوئی تاریکی میں جس سے وہ مدّتوں آشنا رہا تھا، دروازے کا راستہ ٹٹولنا شروع کیا، آخر چابی پھیری اور کواڑ کھول دیئے، اُس کی درد انگیز آواز مہیب خاموشی میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

× × × × × × × × × × × × ×

ہوش میں آیا تو اُس نے سمجھا کہ میں یقیناً موت کی سرحد سے گزر چکا ہوں اور قبر کے اُس پار کی دُنیا میں آباد ہوں۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بینائی پھر درست ہو گئی ہے۔ اگرچہ معمولی سے بالکل مختلف طور پر ایک ہلکی سی سنہری ٹمٹماہٹ اور اور ایک نرالی اور دلنشیں چمک سے فضا معمور ہو گئی، ماں کا چہرہ جو اُسے صرف ایک پُر ہول شکل بن کر دکھائی دے رہا تھا اُس کے سامنے تھا،

"پیارے! اب تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟"

"ہاں۔ اب میں مر چکا ہوں اور پھر اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو گیا ہوں" اس نے جواب دیا۔ ماں نے جھک کر اُسے چوما۔

"پیارے فرڈی ننڈ!" اس نے آہستہ سے کہا "تم زندہ ہو۔ تم ابھی اُسی رنگین پرانی دُنیا میں ہو۔ تم ——— نہیں، نہیں، تمہیں شک نہیں کرنا چاہئے، ہم پر اعتبار کرو۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں تم کو اس کام کے لئے تیار رکھنا چاہئے تھا ——— لیکن ہم پیشین گوئی کیسے کر سکتے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں دیکھ سکتا تھا" اُس نے آہستہ سے کہا "لیکن شاید وہ ایک خواب تھا، اور اب میں دوبارہ اندھا ہو گیا ہوں"۔

"نہیں" اُس نے چلّا کر کہا "تم اب بھی دیکھ سکتے ہو، اور تم آئندہ بھی ہمیشہ کے لئے دیکھ سکو گے"۔ پیچھے سے والدین کی آواز آئی۔

"ہاں" ماں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اب ہمیشہ کے لئے تمہاری نظر درست ہو گئی ہے۔ یہ غلط ہے کہ بے نوری لوٹ آئی ہے۔ میں تمہیں کس طرح سمجھا سکتی ہوں، اُس وقت شام ہو رہی تھی، قاعدہ ہے کہ جوں جوں رات نزدیک آتی ہے روشنی زائل ہوتی جاتی ہے اور روز ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیارے! یہ وہ سماں تھا جس کو "دونو وقت ملتے ہیں" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں؟"

بہت سے گھنٹے گزر گئے، تب کہیں جا کر یہ بات اُس کی سمجھ میں آئی، لیکن وہ بھی نامکمل طور پر!

(حفیظ ہوشیارپوری)

میں نے دیکھا دیکھتی آنکھوں
چکنے والی چڑیاں پیاری پیاری
دوکانوں میں بکتی
لوگوں کے کھانے کو
بکتی، دوکانوں میں
حماقت بازار کی!
میں نے دیکھا خواب میں
گیہوں میں کیڑا
اور دوکانوں میں کچھ نہیں
لوگوں کے کھانے کو
دوکانیں خالی
حماقت بازار کی!

گلچیں

غزل

پھر مہرباں ہو کے پریشاں نہ کیجیے
اب میری مشکلات کو آساں نہ کیجیے

اب مسکرا کے شرم سے آنکھیں نہ پھیریے
ذوقِ وفا کو اور پریشاں نہ کیجیے

افسردہ دل میں عشق کی وہ آگ اب کہاں
پھر حسرتوں کے داغ فروزاں نہ کیجیے

پھر چشمِ التفات سے مجھ کو نہ دیکھیے
رہ رہ کے پھر تہیۂ پیماں نہ کیجیے

پھر خلوتِ فراق میں ملنے نہ آئیے
اب ہو سکے تو ہمتِ احساں نہ کیجیے

اب دولتِ سکون و تحمل نہ چھینیے
پھر خواہشِ متاعِ دل و جاں نہ کیجیے

پھر کہہ رہی ہیں آپ مسیحا نفس ہوں میں
یوں دلفریب موت کا ساماں نہ کیجیے

اب آ چلا ہے صبر و سکوں کچھ جلالؔ کو
پھر مہرباں ہو کے پریشاں نہ کیجیے

(جلالؔ)

بوڑھے شاہ بلوط کا آخری خواب

جنگل میں ڈھلواں کنارے سے بہت اُوپر اور فراخ ساحل کے قریب شاہ بلوط کا ایک بہت بڑا درخت کھڑا تھا۔ یہ پُورے تین سَو پینسٹھ سال کا تھا۔ درخت کے لئے دِنوں کی گنتی کی یہ لمبی مُدت ہوبہُو ویسی ہی تھی جیسی ہمارے لئے ہوسکتی ہے۔ ہم دِن کو جاگتے، رات کو سوتے اور خواب دیکھتے ہیں لیکن نیند کے معاملے میں درخت ہم سے مختلف ہے۔ وہ سال کے تین حصّے برابر جاگتے رہنے پر مجبور ہے اور جاڑا آنے تک ذرا بھی نہیں سو سکتا۔ جاڑا اس کے آرام کا موسم ہے۔ اس کی رات موسم بہار، موسم گرما اور خزاں کے لمبے دن کے بعد ہوتی ہے۔

موسم گرما میں اکثر ایسا اتفاق ہوتا کہ کچھ یک روزہ پتنگے جو دُنیا میں صرف ایک دن کے لئے پیدا ہوتے ہیں زندگی کا لُطف اُٹھاتے اور مسرت محسوس کرتے ہوئے بوڑھے شاہ بلوط کے گرد پھڑپھڑانے لگتے اور اگر لمحہ بھر کے لئے اِس چھوٹی مخلوق میں سے کوئی فرد درخت کے بڑے بڑے سرسبز پتوں میں سے کسی پتے پر بیٹھ جاتا تو درخت ہمیشہ بول اُٹھتا "بے چاری ننھی مخلوق! تیری تمام عمر ایک دن پر مشتمل ہے۔ اُف! اس قدر تھوڑی! یقیناً یہ نہایت المناک بات ہے"۔

چھوٹی مخلوق کا ہمیشہ یہی جواب ہوتا "المناک! تمہارا مطلب کیا ہے۔ میرے آس پاس کی ہر چیز اس قدر حیرت انگیز طور پر چمکدار اور تاباں اور خوبصورت ہے کہ مجھے مگن بنا رہی ہے"۔

درخت کہتا "لیکن صرف ایک دن کے لئے اور پھر فنا"۔

پتنگا جواب دیتا "فنا! فنا کے معنے کیا ہیں! کیا تم بھی فنا ہو جاؤ گے"۔

"نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ میں تمہارے اس ایک دن جیسے ہزاروں دنوں تک زندہ رہوں۔ میرا دن تمام موسموں جتنا لمبا ہے۔ یقیناً اس قدر لمبا کہ تم لوگ اس کا حساب کبھی نہیں کر سکتے"۔

"اُونہہ ہوں! تب میں تمہیں نہیں سمجھ سکتا۔ تمہیں میرے ایک دن جیسے ہزاروں دن حاصل ہیں۔ لیکن مجھے اپنے ایک دن میں ہزاروں لمحے ایسے میسر ہیں جن میں مَیں خوش اور لُطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ کیا جب تم مرو گے دنیا کی تمام خوبصورتی ختم ہو جائے گی؟"

درخت جواب دیتا "نہیں دنیا کی خوبصورتی ضرور بہت طویل عرصے تک رہے گی بے انتہا طویل عرصے تک جس کا میں خیال

بھی نہیں کرسکتا؛

ننھا پتنگا کہتا "خوب خوب۔ پھر تو ہمیں جینے کے لئے برابر کا وقت ملا ہے۔ صرف ہم اس کا مختلف طریقہ سے حساب کر رہے ہیں؛

یہ کہہ کر ننھا پتنگا اپنے نرم و نازک مخملیں بازوؤں سے لطف اُٹھاتے ہوئے ناچتا، اُچھلتا اور ہوا میں تیرتا۔ گھاس کے خوشبودار کھیتوں، جنگلی پھولوں، بڑے بڑے شگوفوں، باغ کی جھاڑیوں، بسنتی گلابوں سے معطر نسیموں اور پودینے وغیرہ کی خوشبو سے تفریح کرتے ہوئے وہ ناچتا، گاتا اور اُڑتا۔ یہ تمام خوشبوئیں اتنی تیز ہوتیں کہ ان کے جھونکے ننھے پتنگے کو تقریباً مدہوش کر دیتے۔

لمبا اور خوبصورت دن اس قدر شیریں خوشبوؤں اور تفریحوں سے لبریز ہوتا کہ جب سُورج ڈوب جاتا تو پتنگا اپنی تمام خوشیوں اور تفریحوں میں تھکان سی محسوس کرنے لگتا۔ اس کے بازو اُسے زیادہ عرصہ تکلیف نہ دے سکتے۔ اور اُسے نرمی اور آہستگی سے نرم نرم گھاس کی لہراتی ہوئی پتیوں پر دھکیل دیتے۔ اس کا ننھا سا سر بہت آسانی سے نیچے کو جھک جاتا اور وہ نہایت امن سے شیریں نیند سو جاتا۔

پتنگا مر چکا ہوتا۔

شاہ بلوط کہتا "آہ غریب چھوٹا کیڑا! اس کی زندگی میں کتنا ہیبت ناک اختصار ہے؛"

یونہی ہر موسم گرما میں ہر روز ننھے پتنگوں کا ناچ ہوتا رہا۔ وہی سوال کئے جاتے وہی جواب دیئے جاتے۔ یکروزہ پتنگوں کے بہت سے خاندانوں میں یہی رسم جاری رہی۔ وہ تمام ایسی ہی خوشی اور ایسی ہی مسرت محسوس کرتے رہے۔

شاہ بلوط موسم بہار کی صبح موسم گرما کی دوپہر اور موسم خزاں کی شام میں برابر جاگتا رہا ——— اب اس کی رات اُس کے آرام لینے کا وقت قریب آگیا۔ سردیاں آرہی تھیں۔

آندھیاں پہلے ہی سے گیت گانے لگیں "شب بخیر۔ شب بخیر"۔ کوئی پتہ ادھر گرتا تھا کوئی پتہ اُدھر پڑتا تھا۔ آندھیاں بولیں "ہم تجھے جھلائیں گے، تھپک تھپک کر سُلائیں گے، سوجا، سوجا، ہم تیرے لئے خواب آور گیت گائیں گے، تجھے سُلانے کے لئے تھپکیاں دیں گے۔ اس سے تیری پُرانی شاخیں اچھی ہو جائیں گی اور فرط خوشی سے کڑکڑائیں گی ——— میٹھی نیند سو جا، میٹھی نیند سو جا۔ یہ تیری تین سو پینسٹھویں رات ہے۔ درحقیقت تُو دُنیا میں ابھی ایک لونڈا ہی تو ہے۔ میٹھی نیند سو جا، بادل تجھ پر برف اُڑھائیں گے جو بالکل ایک گرم رضائی ہوگی تیرے پیروں کو ڈھانپ لینے والی۔ تجھے میٹھی نیند اور سہانے روح افزا خواب مبارک ہوں؛"

اپنے تمام پتے کھو کر اب شاہ بلوط تنہا کھڑا تھا طویل موسم سرما کے دوران میں پُوری طرح آرام پانے کے لئے اور بہت سے خواب دیکھنے کے لئے۔ اُن واقعات کے خواب جو اس کی زندگی میں گزر چکے تھے۔ ویسے ہی واقعات جو انسانی خوابوں میں گزرتے ہیں۔

یہ بہت بڑا درخت کسی زمانہ میں بہت چھوٹا سا تھا اور یقیناً شاہ بلوط کے ایک پھل کی صورت میں اپنے شاخوں کے ہنڈولے میں جھولا کرتا تھا ——— لیکن اس وقت وہ انسانی حساب کے مطابق اپنی زندگی کی چوتھی صدی میں سے گزر رہا تھا۔ جنگل میں یہ سب سے بڑا اور عظیم الشان درخت تھا۔ اس کی چوٹی تمام دوسرے درختوں سے اونچی چلی گئی تھی۔ دُور دُور سمندر پار سے نظر آ سکتی تھی۔ اُسے دیکھ کر جہاز رانوں کو فوراً پتہ چل جاتا کہ ساحل قریب ہے ——— وہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ کس قدر آنکھیں اس کی طرف مشتاقانہ دیکھ چکی تھیں۔

اُس کی اُونچی اُونچی شاخوں میں جنگلی کبوتر اپنے گھونسلے بناتے۔ کوئل کوک کوک کر ابدی سوز و ساز کی خدمت بجالاتی۔ کوئل کے مشہور گیتوں کی گونج اُس کی شاخوں سے ٹکراتی ——— اور خزاں میں جب اس کے پتے تانبے کی چمکتی ہوئی تھالیوں کی طرح نظر آنے لگتے، مسافر پرندے آتے اور اپنی سمندر پار کی اُڑان سے پہلے ان شاخوں میں آرام لیتے۔

لیکن اب سردیاں تھیں درخت بے برگ و بار اور عریاں کھڑا تھا۔ تاکہ ہر کوئی دیکھ سکے کہ کتنی ٹیڑھی، بینگی اور جھکی ہوئی شاخیں تنے سے نکل کر آگے کو بڑھ رہی ہیں۔ کوے چیلیں دَورہ کرتے ہوئے آتے اور ٹیڑھی ٹیڑھی ننگی شاخوں پر بیٹھ جاتے۔ اور اس کٹھن زمانے کے متعلق گفتگو کرتے جس کی ابتدا ہو رہی تھی۔ وہ کہتے "سردیوں میں خوراک حاصل کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہے"!

کرسمس کے مقدس دنوں میں درخت نے ایک خواب دیکھا! ——— اُس کو کچھ احساس سا ہونے لگا کہ مسرت کا وقت آن پہنچا ہے۔ اپنے خواب کے تصور میں اُس نے گرد و نواح کے گرجاؤں میں گھنٹیاں بجتی سُنیں۔ اُسے یہ دن گرمیوں کا ایک خوبصورت دن معلوم ہُوا شیریں اور تاباں دن۔ اُس کی اُونچی اُونچی چوٹیاں سرسبز پتوں اور تازہ پھولوں سے ڈھنپ گئیں۔ سُورج کی کرنیں پتوں اور شاخوں میں کھیل رہی تھیں۔ ہوا پھولوں اور جھاڑی بوٹیوں کی خوشبُو سے لدی ہوئی تھی۔ رنگین تتلیاں ایک دوسری کا پیچھا کر رہی تھیں۔ فصل ربیع کے پتنگے درخت کے آس پاس یوں ناچنے کودنے لگے گویا خدا نے ناچنا اور خوش ہونا انہیں کے لئے بنایا ہے۔ درخت کی عمر کے ہر سال میں جو جو پُر مسرت واقعات گذرا کرتے تھے اسے خواب میں تمام دوبارہ گذرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے پُرانے وقتوں کے بہادر سرداروں اور معزز خاتونوں کو جنگل میں اپنے خوبصورت جنگی گھوڑوں پر سوار دیکھا جن کی ٹوپیوں کے طُرّے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور جن کی کلائیوں پر شاہین بیٹھے تھے۔ شکار کے بگل کی آواز سنائی دی اور کتّے بھونکنے لگے۔ اُس نے نیزوں اور بھالوں والے بہادر جنگ جُوؤں کو رنگین وردیوں اور چمکدار زرہ بکتر میں ملبُوس اپنے خیمے لگاتے اور جنگ کرتے دیکھا۔

حفاظت کے نشان کی آگ جابجا روشن ہوئی۔ لوگوں نے گیت گائے اور درخت کے مہماں نواز سائے میں سو گئے۔ اس نے چاندنی رات میں اپنے قریب محبت کرنے والوں کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ملتے اور تنے کی بھوری سبز چھال پر اپنے ناموں کا پہلا حرف کندہ کرتے دیکھا۔

کئی سال گزرے خوش دل راہ گیروں نے ہواؤں کے دیوتا کے ستار اور چنگ و رباب اس کی شاخوں کے ساتھ لٹکائے تھے۔ اب وہ دوبارہ وہاں لٹکے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور وہ اُن کی عجیب و غریب آوازیں سُن سکتا تھا۔ جنگلی کبوتر غرغوں غرغوں کر رہے تھے جیسے وہ درخت کے احساسات کی تشریح کر رہے ہوں۔ اور کوئل اُسے یہ بتانے کے لئے کہ کتنے بہار کے دن ہنوز وہ جئے گا کوک رہی تھی۔

اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی جڑوں میں، تنے میں، رگ رگ اور پتے پتے میں یہانتک کہ بلند ترین شاخوں میں بھی نئی رُوح بیدار ہو کر سنسناہٹ پیدا کر رہی ہے۔ جب زمین کے اندر جڑوں میں زندگی کی پُرجوش لہر دوڑی درخت نے اپنے آپ کو تنتے ہوئے اور پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ جُوں جُوں بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ اُونچا ہی اُونچا ہوتا گیا اس کی بلند ترین ٹہنیاں خوب پھیلتی اور پتوں سے بھرتی گئیں۔ اُس کے جوشِ نمو کی مناسبت سے اس کا دلی اطمینان بہت بڑھ گیا۔ اور ساتھ ہی اس کی رُوح میں بلند سے بلند تر ہو جانے کی دل خوش کُن آرزو اُٹھی تاباں اور درخشاں سُورج تک پہنچ جانے کی آرزو۔ پہلے بھی اس کی اُونچی اُونچی شاخیں اُن بادلوں میں دھنس رہی تھیں۔ جو سیلانی پرندوں کے جھنڈ یا بڑے بڑے سفید راج ہنسوں کی طرح نیلے آسمان میں تیر رہے تھے۔

ہر پتہ اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھا جیسے دیدۂ بینا رکھتا ہو۔ پتے اس طرح معلوم ہوتے گویا دن کی کشادہ روشنی میں بڑے بڑے چمکدار ستارے نمودار ہیں۔

روشن اور شیریں نظر آنکھوں کے سے ستارے ——— وہ ایک بچے کی آنکھوں کی جانی پہچانی ہوئی نظر یا اُن محبت کرنے والوں کی آنکھوں کی یاد دلاتے تھے جو ایک دفعہ شاہ بلوط کے نیچے ملے تھے۔

بوڑھے درخت کے لئے یہ لمحے حیرت انگیز اور امن و مسرت سے لبریز لمحے تھے ——— تاہم اس تمام شادمانی کے باوجود درخت نے ایک پُرشوق تمنا یا آرزو محسوس کی اور وہ یہ تھی کہ اُس کے نیچے کے تمام دوسرے درخت، جھاڑیاں، ابری بوٹیاں، پھول وغیرہ بھی اس کی شان و شوکت، شہرت اور برابر کی خوشی دیکھنے کے لئے اُتنے ہی اُونچے ہو جائیں جتنا اونچا وہ خود ہے ——— بلند مرتبہ شاہ بلوط اپنی تفریحوں کے درمیان اکیلا ذرا بھی خوش نہ ہو سکتا تھا۔ باقی تمام چھوٹے بڑے پودے اُس کے برابر نہ تھے۔ اس کا یہ پُرشوق جذبہ اور احساس اس کی ہر شاخ اور ہر پتے کے ریشے ریشے میں ایسی گرمجوشی اور تیزی سے کانپا جیسے ایک انسانی دِل کی رگوں میں کانپے۔

درخت کی چوٹی اِدھر اُدھر لہرائی اور نیچے کی طرف جھکی۔ گویا اپنی خاموش آرزو کی دُھن میں وہ کسی بات کی تلاش میں سرگرداں ہے ——— یکایک اس کو جنگلی بنفشہ کی خوشبو، نیلو فر اور گلاب کی تیز خوشبو کے ساتھ مل کر آنے لگی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ کوئل کی کوک سُن

رہا ہے۔ اس کی تمنا تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ جنگل کے درختوں کی سرسبز چوٹیاں بادلوں تک پہنچ گئیں۔ شاہ بلوط نے ان کو اپنے نشیب سے اٹھتے اور اونچا ہی اونچا ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں تیزی سے اوپر کی طرف اٹھیں۔ بعض نے نہایت تیزی سے بڑھ جانے کی ترنگ میں اپنی جڑیں بھی توڑ لیں ——— بید کا درخت ان سب میں سے زیادہ جلد باز نکلا۔ اس کا پتلا تنا ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر کی شکل میں بجلی کے ایک شعلے کی مانند اوپر کو اٹھا۔ شاخیں اس کے گرد سبز پرنیان کی جھنڈیوں کی طرح پھیل گئیں۔ جب پرندے اپنے نغموں سمیت ہوا میں بلند ہونے لگے تو جنگل کی تمام پیداوار یہاں تک کہ سبز اور طرہ دار ناگر موتھے بھی جنگل کے باقی پودوں سمیت بڑھ گئے۔ گھاس کی ایک پتی پر جو ایک لمبے سبز تار کی طرح ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی ایک ٹڈا بیٹھا اپنے بازوؤں کو اپنی ٹانگوں کے ساتھ صاف کر رہا تھا۔

ہر کوئی اپنے اپنے طریقے سے گا رہا تھا۔ بھونرے گنگنائے۔ شہد کی مکھیاں بھنبھنائیں۔ پرندے چہچہائے۔ ہوا نغموں کی آواز اور طرب و انبساط سے معمور ہو گئی۔

شاہ بلوط بولا "ہائیں! ننھا نیلا پھول کہاں ہے۔ وہ جو کنارِ آب اُگ رہا تھا اور ارغوانی عشق پیچہ اور ڈیزی؟" شاہ بلوط ان سب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک مترنم آواز آئی۔ "ہم یہ ہیں ہم یہ ہیں۔"

"لیکن آخر بر ما کا حسین خوشبودار ناز بو! وہ کہاں ہے۔ اور وادی کے نرگس کہاں ہیں؟ جنہوں نے پچھلے سال اپنی گدرائٹ سے تختۂ زمین کو ڈھانپ دیا تھا؟ وہ پیارے پیارے پھولوں والا جنگلی سیب کا درخت؟ اور جنگل کے وہ تمام نازنین جو ہر سال اٹھلایا کرتے تھے؟ کیا وہ فی الفور اور یک بیک کونپلیں نکال کر ہمارے ہم پایہ ہو سکتے ہیں؟"

اوج ہوا سے آوازیں آئیں "ہم ادھر ہیں۔ ہم ادھر ہیں۔" گویا وہ پیشتر ہی سے اتنے رفعت پذیر تھے اور پہلے بھی اسی بلندی میں لہرایا کرتے تھے۔

شاہ بلوط نے مسرت بھری آواز میں کہا "اوہو! تمام چھوٹے بڑے موجود ہیں۔ ایک بھی نہیں بھلایا گیا۔ یقیناً یہ اچھی بات ہے بہت ہی اچھی بات۔ کیا ایسی بے نظیر مسرت کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔"

ہوا میں سے جواب سنائی دیا "آسمانوں میں ہمیشہ رہنے والے خدا کی جناب سے ایسا ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے۔"

بوڑھے درخت نے جو اب تک اوج ہی اوج حاصل کرتا چلا جا رہا تھا محسوس کیا کہ اس کی جڑیں اپنے آپ کو زمین میں سے کھود رہی ہیں ———

درخت بولا "یہ بالکل ٹھیک ہے اور نہایت اچھا ہے۔ اب مجھے پابندیاں نہیں جکڑ سکیں گی۔ میں نُور اور شہرت

کے بلند ترین درجوں میں پہنچ جاؤں گا۔ تمام چھوٹے بڑے جن سے میں محبت کرتا ہوں میرے ساتھ ہیں۔ تمام —— تمام یہیں ہیں "

ایسا تھا بوڑھے شاہ بلوط کا خواب۔

جب وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ بحر و بر میں ایک بہت بڑا طوفان برپا ہُوا۔ سمندر بڑی بڑی لہروں میں کنارے کی طرف اُچھلا۔ درخت میں سے کڑکڑنے اور پھٹے جانے کی آوازیں سُنی گئیں۔ جڑیں زمین کے اندر سے اُکھڑ گئیں۔ ٹھیک اسی لمحہ میں جب اس نے خواب میں محسوس کیا تھا کہ وہ زمین سے اُکھڑ رہا ہے۔

وہ گر پڑا —— اس کے تین سو پینسٹھ سال گذر چکے تھے چھوٹے پتنگے کے ایک ہی دن کی طرح ——

کرسمس کی صبح کو جب سُورج نکلا طوفان ختم ہو چکا تھا۔ تمام کلیساؤں میں خوشی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اور ٹڈرونڈ(ایک قدیم محافظِ دین پادری) کی قربان گاہ پر عید کی نیاز کے دھوئیں کی طرح ہر چھوٹی سے چھوٹی جھونپڑی کے چولہے میں سے دھواں نکل نکل کر نیلے آسمان پر جانے لگا —— سمندر رفتہ رفتہ خاموش ہو گیا۔ ایک شاندار جہاز کے تختے پر جس نے رات خوفناک طوفان کا مقابلہ کیا تھا خوشی اور شادمانی میں تمام جھنڈے لہرانے لگے۔ ملّاح چلّا اُٹھے "آہ! درخت تباہ ہو گیا! پُرانا شاہ بلوط —— ہمارا سمندر پر سے زمین دکھانے والا مینار —— اس کی جگہ اب کون کام آسکے گا —— افسوس! کوئی بھی نہیں۔

بوڑھے درخت پر یہ ایک ماتمی تقریر تھی —— چھوٹی سی مگر پُرمعنی —— یہاں یہ ساحل کے قریب برف سے ڈھنپے ہوئے کنارے پر پھیلا پڑا تھا۔ اور اس پر جہاز میں سے ابدی زندگی اور انسانی رُوح کی نجات کا ایک پُرانا گیت کرسمس کی خوشی میں گایا جا رہا تھا۔

"اس سرُور صبح میں بلند آہنگی سے گاؤ
سب کچھ تکمیل کو پہنچ گیا کیونکہ نبی پیدا ہُوا ہے۔
ہمیں مسرّت کے گیت بلند آوازی سے گانے دو۔
اپنے نبی اپنے بادشاہ کی تعریفوں میں

اہلِ جہاز میں سے ہر کسی نے اس گیت اور دُعا کے درمیان اپنے خیالات بلند ترین ہوتے ہوئے محسوس کئے۔ ہُو بہو اُسی طرح جس طرح بوڑھے درخت نے کرسمس کی صبح کو اپنے خوبصورت خواب میں رفیع الشان ہو جانا محسوس کیا تھا۔

(ترجمہ) ح۔ ب

محسوساتِ ماہر

اصول کے غریب کیوں ضوابط و قیود کیا | نمازِ عشق کیلئے رکوع کیا سجود کیا
جنوں کی خامیوں کے دو فراق و وصل نام ہیں | اگر کمالِ عشق ہی تو غیب کیا شہود کیا
نمائشِ جہاں نہیں، طلسم ہے طلسم ہے | عروج کیا زوال کیا، ہبوط کیا صعود کیا
تلونِ جمال کی عیاں ہیں چند صورتیں | وگرنہ کائنات کی اساس کیا نمود کیا
ہوس پرست کیا کہا، مآلِ عشق یاس ہے | سرور و غم سے کیا غرض یہاں زیان و سود کیا
ثباتِ عشق کی قسم فریب ہے فریب ہے | وجودِ دہر کچھ نہیں، نمودِ ہست و بود کیا
نشاط و غم کی حس نہیں تو ہو بلا سے دل تو ہے | گلہ ہو بیحسی کا کیوں، شکایتِ جمود کیا

حیاتِ ماہرِ حزیں رہینِ دردِ عشق ہے
وگرنہ مشتِ خاک کی بساط کیا نمود کیا

منظور حسین ماہر القادری

حسن کاری اور افسانہ نویسی

ذیل کا مضمون ہندی کے مشہور افسانہ نویس پنڈت بشمبر ناتھ کوشک کے مضمون کا ترجمہ ہے:۔

قبل اس کے کہ فنِ افسانہ نویسی کے متعلق کچھ لکھا جائے، میں اس بارے میں اجمالاً اپنے خیالات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حسن کاری کیا چیز ہے؟ اس امر کی اس لئے ضرورت ہے کہ فی زمانا وہ حضرات جن کے دماغوں میں مغربی تہذیب اور لٹریچر کے تاثرات کچھ اس قدر ضرورت سے زیادہ مرتسم ہو گئے ہیں کہ وہ اُن کے بالکل ہی اندھا دھند پرستار بن گئے ہیں کہہ دیا کرتے ہیں کہ "حسن کاری کا مقصد صرف حسن کاری ہے (Art for art's sake)" اس مقولے کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ کوئی ایسا مائی کا لال ملا جو مجھے اس کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھا سکے۔ اس قول کے حامیوں سے بھی جب کبھی اس پر بحث مباحثہ ہوا تو اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ وہ مجھے سمجھانے سے قاصر رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ خود بھی اس کا ٹھیک مطلب سمجھ نہیں سکتے۔

سنسکرت ادب کے رو سے حسن کاری کی چونسٹھ اقسام قرار پائی ہیں۔ ان میں گانا، بجانا، ناچنا اور مصوری وغیرہ داخل ہیں۔ حسن کاری کی علامت یہ ہے کہ فراموش شدنی نہ ہو۔ شاستر اور ادب کو انسان فراموش کر سکتا ہے لیکن حسن کاری کو ایک دفعہ سیکھ لینے کے بعد پھر کبھی نہیں بھول سکتا۔ آدمی یہ بھول سکتا ہے کہ پندرہ پنجے کتنے ہوتے ہیں۔ لیکن تیرنا کبھی بھول نہیں سکتا۔ گھوڑے کی سواری ہرگز بھول نہیں سکتا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ حسن کاری کا نصب العین کیا ہے؟ حسن کاری کے دو مقاصد ہیں۔ ایک اپنا مطلب دوسرا پرایا مطلب یا دوسروں کی بہبودی۔ مصور جب تصویر بناتا ہے تو فقط یہی دو مقاصد اس کے پیش نظر رہتے ہیں یعنی خود کی دل بہلائی یا روپیہ پیسہ کمانا یا دوسروں کو خوش کرنا۔ کوئی مصور صرف اس لئے تصویر نہیں بناتا کہ تصویر بنانی ایک حسن کاری ہے۔ لہذا تصویر بنانی ہی چاہئے۔ اگر وہ تصویر نہیں بنائیگا تو مصوری حسن کاری نہیں رہے گی۔ یا تصویر بنانی اس کی عادت میں داخل ہو گئی ہے انسان کوئی ایسا کام ہرگز نہیں کرتا جس سے نہ تو خود اس کی تفریح طبع ہو اور نہ دوسروں ہی کی۔ جن کا دماغ مختل ہو جاتا ہے۔ وہ پاگل اکثر ایسے کام کیا کرتے ہیں جو بظاہر دیکھنے والوں کو لغو اور اوٹ پٹانگ معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن سے پاگل کا دل بہلتا ہے۔ اگر اس کا دل نہ بہلے تو وہ کبھی ایسی حرکتیں نہ کرے۔ غرض پاگل بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو مطلب سے خالی ہو پھر صاحب ہوش و حواس انسان کا کیا پوچھنا۔ "حسن کاری حسن کاری کے لئے" کے علمبردار فرماتے ہیں کہ حسن کاری وہ ہے جس میں فقط حسن و جمال ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ

اس میں افادیت بھی ہو۔ بعض نوبہاں تک بڑھ کر کہنے لگتے ہیں کہ حسن کاری میں اگر کوئی مقصد یا افادیت مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا حسن وجمال غارت ہوجاتا ہے۔ وہ حسن کاری نہیں رہتی۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے کوئی کہے کہ اگر کوئی اس خیال سے تیرنا سیکھتا ہے یا تیرنے کے لئے پانی میں کودتا ہے کہ وہ کبھی ڈوبتے ہوئے کی جان بچائے گا تو اس کا تیرنا حسن کاری نہیں سمجھا جائیگا۔ یا اگر کوئی مصوّر اس لئے تصویر بناتا ہے کہ اس کو فروخت کرکے اپنے اہل وعیال کی شکم پروری کرے تو اس کی بنائی ہوئی تصویر حسن کاری کے دائرے سے خارج کردی جائے گی۔ اگر حسن کاری سے افادیت خارج کردی جائے گی تو حسن کاری بالکل بیکار چیز ہوجائے گی۔

نرے حسن وجمال میں بھی افادیت موجود ہے۔ اگر کوئی چیز حسین وجمیل ہے تو وہ نظر بازوں کا دل خوش کرتی ہے یہی اس کی افادیت ہے۔ جس حسن وجمال میں ناظرین کے دلوں کو مسرور کرنے کی قوت نہ ہو حسن وجمال نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا حسن کاری میں حسن وجمال کی تخلیق کے ساتھ افادیت بھی آجاتی ہے۔ اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ پس یہ کہنا کہ حسن کاری میں افادیت غیر ضروری چیز ہے یا یہ کہ وہ ہونی ہی نہیں چاہئے بالکل لغو سی بات ہے۔ درحقیقت حسن کاری اس وقت منتہائے کمال کو پہنچتی ہے جبکہ وہ جمیل ہونے کے علاوہ انسان کے لئے مطلع نظر ین کر مفید ہوجاتی ہے۔

اس قول کے حامیوں کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ناظرین کو چاہئے کہ وہ حسن کاری کو حسن کاری کی نظر سے دیکھیں۔ اس میں افادیت یا نصب العین یا تعلیم کو نہیں تلاش کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ اگر کسی مصوّر نے ایک آدمی کی تصویر بنائی تو ناظرین کو فقط یہ دیکھنا چاہئے کہ تصویر میں ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ ہیں یا نہیں بس۔ اگر یہ سب ہیں تو مصوّری ختم شد۔ اب اگر کوئی ناظر مصوّر سے یہ کہے کہ "استاد ناک تم نے ذرا لمبی بنادی، اگر ذرا چھوٹی ہوتی تو زیادہ خوبصورت ہوتی" تو مصوّر اُسے جھڑک کر کہے "کیا بکتے ہو، صرف یہ دیکھو کہ یہ ناک ہے یا نہیں"۔ ناظر بچارا جواب دیتا ہے "ہاں ناک تو ضرور ہے"۔ اس پر مصوّر کہے "تو بس جھگڑا ختم ہے آگے تمہیں کچھ کہنے کا اختیار نہیں۔ ناک کو صرف ناک کی نظر سے دیکھو۔ کیا لمبی ناک والے آدمی دُنیا میں نہیں ہوتے؟" دوسرا ناظر کہتا ہے "بھئی تم نے پیشانی پر جو تل بنایا ہے وہ ٹھیک نہیں جچتا۔ تمہیں گال پر تل بنانا چاہئے تھے۔ کیونکہ تل اکثر گال پر ہی خوبصورت معلوم ہوتا ہے"۔ اس پر مصوّر کہتا ہے "بیوقوف ہوا تل کو تل کی نظر سے دیکھو۔ انسان کے جسم پر سب جگہ تل ہوسکتا ہے۔ کیا دُنیا میں کسی کی پیشانی پر تل نہیں ہوتا؟"

"حسن کاری حسن کاری کے لئے" کے مؤیدین کی کچھ عجیب سی حالت ہوتی ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ناک کی جگہ ناک ہے یا نہیں۔ اگر موٹی ہے۔ تب بھی ٹھیک ہے۔ کیونکہ موٹی ناک بھی ہوتی ہے۔ اگر لمبی ہے۔ تب بھی ٹھیک ہے کیونکہ لمبی ناک بھی ہوتی ہے۔ اگر چپٹی ہے تب بھی نئی نہیں ہے۔ کیونکہ چپٹی ناک بھی ہوتی ہے۔ جو لوگ ناک میں حسن تلاش کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ ناک اسی طرح کی اچھی ہوتی ہے۔ اس سے بڑی، چھوٹی، موٹی یا پتلی اچھی نہیں ہوتی وہ حسن کاری کو نہیں سمجھتے۔ خوبصورت

اور سڈول ناکیں دنیا میں بہت تھوڑی نکلیں گی۔ کثرت تو بے ڈول ناکوں ہی کی ہے۔ لہذا ان کی مصوری ہی فطرت و حسن کاری ہے۔
اب فن افسانہ نویسی کو بھی مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں جانچنا چاہئے کہ افسانہ نویسی کی حقیقت کیا ہے۔ افسانے کا پہلا مقصد یہ ہے کہ اس میں قاری یا سامع کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ اگلے زمانے میں جب کتابیں بمشکل دستیاب ہوتی تھیں راجاؤں مہاراجوں اور متمول لوگوں کے ہاں داستان گو رہتے تھے۔ وہ رات کے وقت کہانیاں کہا کرتے تھے۔ بچے بالطبع کہانیاں سننے کے شوقین ہوتے ہیں اور رات میں بغیر کہانی سنے انہیں نیند نہیں آتی۔ افسانوں کی اس قدر کثرت اشاعت اس لئے ہے کہ ان سے عوام کا دل بہلتا ہے۔ جی خوش ہوتا ہے۔ لہذا افسانے میں دلچسپی کی خوبی کا ہونا ضروری ہے۔ جس کہانی میں یہ گُن نہ ہو اس کے پڑھنے یا سننے سے دل بہلنے کی بجائے اُکتا جاتا ہے۔ وہ کہانی نہیں کہی جا سکتی۔ جب تک انسان کا دماغ پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک اُس پر تعلیم یافتہ کا صحیح اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں کہانی کی محض اِسی صفت کی بدولت دِل بہلائی ہوتی ہے۔ بچے یا معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو طوطا مینا، حاتم طائی، الف لیلہ اور دیو پریوں کے قصوں کے ذریعہ ہی تفریح طبع حاصل ہوتی ہے۔
لیکن تعلیم اور تجربہ بڑھ جانے پر انسان کہانیوں میں دِل بہلاوا کے سوا کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ وہ کہانیوں میں درس و عبرت، پند و نصیحت ڈھونڈتا ہے۔ سمجھدار انسان پند و نصیحت سے خالی کہانیوں کو سُن کر یا پڑھ کر بول اُٹھتا ہے "آخر اس کہانی کا مطلب کیا نکلا؟" کچھ لوگ جو فن افسانہ نویسی کو ضرورت سے زیادہ سمجھتے ہیں اس پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو ایسا کہتے ہیں وہ حُسن کاری سے محض بے بہرہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بیوقوف ہیں لیکن وہ بچارے مجبور ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنے جذبہ و وجدان کے ماتحت کہتے ہیں۔ ان کا دل نری گپ شپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ چاہے افسانہ نگار اپنی حسن کاری افسانے کے خاکے (پلاٹ) اور کردار نگاری میں صرف کر ڈالے۔ لیکن وہ ان کے دِل کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تصویر کا پورا ڈھانچہ خوبصورت بنایا گیا ہے۔ مصور نے اپنی ساری حسن کاری خرچ کر دی ہے۔ حسن کار اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ کیونکہ خطوط بھی ٹھیک ہیں۔ رنگ بھی چوکھا ہے۔ تناسب بھی موزون ہے۔ لیکن ناظر کا دل جو حسن کاری کی نظر سے نہ خطوط کو سمجھتا ہے نہ رنگ کے اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہے یہ کہتا ہے کہ "اگر اس کی ٹھوڑی پر ایک تل بنا دیا جاتا تو یہ تصویر کس قدر خوبصورت ہو جاتی۔ مصور نے تل نہیں بنایا یہ بُرا کیا" حسن کاری کے ماہرین اس پر ہنس کر یہ کہہ سکتے ہیں "تل بنانا ضروری نہیں ہے۔ اگر تل نہیں بنا تو کیا اس سے تصویر خراب ہو جائے گی؟" اس میں کلام نہیں کہ تصویر خراب نہیں ہوئی۔ لیکن یہ تو ماننا پڑے گا کہ اس کی خوبصورتی میں کچھ کمی ضرور رہ گئی جس کو ناظرین نے محسوس کیا۔ اگر مصور ناظرین کو بے وقوف سمجھتا ہے تو تصویر کو چھپائے رکھے اور اُسے صرف حُسن کاروں ہی کو دکھلائے۔
قصہ کہانیوں کا پرچار زیادہ ہوتا ہے اور لوگ انہیں شوق سے سنتے یا پڑھتے ہیں۔ پند و نصیحت کا کام جس خوش اسلوبی سے اور جس قدر زیادہ کہانیوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور کسی ترکیب سے ممکن نہیں۔ اس لئے اس بات کو سمجھ کر عقلمندوں نے تعلیم و تلقین کے لئے کہانیوں

کا پیرایہ اختیار کیا۔ چنانچہ پوران امثال و اخبار کا مجموعہ ہے۔ اس طرح سینکڑوں سبق آموز کہانیوں کی ابتدا ہوئی۔ ہندوؤں میں ست نارائن کتھا کا جو گھر گھر چرچا ہے وہ بھی ایک کہانی ہی ہے لیکن نری گپ شپ نہیں۔ اس میں مذہبی تعلیم و تلقین ہدایت و موعظت شامل ہے۔ لہٰذا یہ کہانی ہندوؤں کے مذہب کا ایک جزو بن گئی۔ ست نارائن کتھا کا مصنف دراصل افسانہ نویسی کا بڑا ماہر تھا۔ تلسی داس کی رامائن بھی تو ایک کہانی ہے لوگ کہا بھی کرتے ہیں کہ رامائن میں ہے کیا" رانی وا کی سیتا ہری، رانے وا کی لنکا جاری" بس رامائن ختم۔ اگر تلسی داس بھی رامائن کو اسی طرح سادگی سے لکھ جاتے تو کیا آج رامائن کو اس قدر ہردلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوتی؟ ہرگز نہیں۔ رامائن کا چرچا اس لئے ہے کہ وہ بے شمار ہدایات و مواعظ، ان گنت سیاسی حقائق، بیسیوں امثال و نظائر کا گنجینہ ہے۔ اس سے صرف رام چندر جی کی سرگذشت حیات ہی نہیں معلوم ہوتی۔ سیتا کی سیرت و کردار ہی کا مطالعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں سب کے لئے مسالہ موجود ہے حسن کاروں کے لئے بھی اور عوام کے لئے بھی۔

اگر افسانہ نگار فی الواقع حسن کار ہے تو وہ ایسا افسانہ لکھے گا جو خواندہ اور ناخواندہ، جاہل اور عقلمند، حسن کاری کے نقاد اور حسن کاری سے بے بہرہ سب لوگوں کے لئے پسندِ خاطر ہو سب کی تفریح طبع کا باعث ہو۔ سب کے دلوں کو خوش کر سکے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں ضرور نقص ہے وہ افسانہ کی تعریف و اصطلاح سے محض نابلد ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ لچر، پوچ گندے، شرمناک اور شہوانی قصے لکھ کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ قارئین ان کے گندے پن کو حسن کاری سمجھ کر ان کی مدح سرائی کریں۔ ان کے خلاف ایک حرف زبان سے نہ نکالیں۔ اور اگر کچھ کہتے ہیں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نرے اُلو ہیں۔ وہ حسن کاری کے معنی و مطلب سے محض عاری ہیں۔ وہ حسن کاری کو حسن کاری کی نظر سے دیکھنا نہیں جانتے۔ خوب! عجیب و غریب حسن کاری کی بیچ میں منطق بھی انوکھی ہے۔ سڑی اور گندی گلی میں لے جا کر کوئی کہے کہ "ہیں ناک کیوں دابتے ہو، مُنہ کیوں بناتے ہو؟ یہ بھی خالقِ کائنات کی حسن کاری کا ایک نمونہ ہے۔ اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھو" اس وقت شاید کوئی عذار رسیدہ یہ کہہ سکتا ہے "ٹھیک کہتے ہو! یہ بھی میرے محبوب کا پیارا نظارہ ہے"۔ عوام تو یہی کہیں گے "بھئی باز آئے ہم ایسی حسن کاری سے۔ ہم غیر حسن کار ہی اچھے ہیں۔ اس حسن کاری نے تو ہماری حسن کاری کو بگاڑ دیا۔ محش ادب کو کوئی ماہر ادبیات ہی حسن کاری کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ عوام سے یہ توقع رکھنا عین حماقت ہے۔ شرمناک برہنہ تصویر بنانے اور فروخت کرنے والے یہ اُمید رکھیں کہ سب لوگ ان کی تصویروں کو خریدیں اور ان کو سراہیں تو یہ کیسے ممکن ہے؛ اگر کچھ لوگ ایسی تصویروں کی تلاش میں رہتے ہوں اور اُن کو بڑے شوق سے خریدتے ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ تصویریں مصوری کے نقطۂ نگاہ سے بہترین ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ مصوری کے نقطۂ نظر سے بہترین بھی ہوں تو وہ ترک کرنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ وہ ناظرین کے دلوں میں روگ پیدا کرتی ہیں۔ طوائف چاہے کیسی ہی حسین و جمیل ہو۔ لیکن وہ قابلِ عزت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں بیماری پیدا کرتی ہے۔ حسن کاری کا کام انسان

کے دل میں بیماری پیدا کرنا اور اُسے سماجی، اخلاقی ادبار اور پستی کی طرف لے جانا نہیں ہے بلکہ اس کا کام معراجِ انسانیت ہے۔ جس کہانی کو پڑھ کر قاری کا دل خوش نہیں ہوتا اس کو کوئی اخلاقی سبق نہیں ملتا۔ زندگی کے کسی مسئلہ کو سلجھانے میں اس سے مدد نہیں ملتی۔ اس کے پیشِ نظر کوئی نصب العین قرار نہیں پاتا۔ وہ کہانی کبھی بہترین اور حُسن کاری کا اعلےٰ نمونہ نہیں سمجھی جا سکتی۔ بعض لوگ جو فطرت پسند ہیں کہہ دیا کرتے ہیں کہ افسانہ نگاروں کو دُنیا کی سچی تصویر پیش کرنی چاہیئے۔ دُنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو من وعن ظاہر کرنا چاہیئے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بالکل نقالی ہے نہ اس میں کچھ اپج ہے اور نہ حسن کاری۔ لوگ جو باتیں رات دن دیکھتے سنتے ہیں وہی اگر ان کے سامنے پیش کی جائیں تو اُن سے نہ دلچسپی ہی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی نفسیاتی اور روحانی ارتقا کا امکان۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان کے رُوبرُو کوئی نئی چیز پیش کی جائے۔ ایسی چیز، جو آسانی سے مہیا نہ ہو سکے۔ جس حُسن کاری میں جدت اور اُپج نہیں وہ نقالی ہے۔ خواہ وہ آہنی قلم کی ہو، خواہ مُوقلم کی۔ مصوری کے نقطۂ نظر سے عکاسی (فوٹوگرافی) میں کونسی حسن کاری ہے؟ حسن کاری تو مُوقلم سے متاثر کرنے والی تصویر بنانے میں ہے۔ دُنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ اس بات کو ظاہر کرنے میں کوئی حسن کاری نہیں ہے۔ یہ کام تو ہر ایک آدمی کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہے۔ حُسن کاری تو یہ ظاہر کرنے میں ہے کہ دُنیا میں کیا کیا ہونا چاہیئے اور کس بات کی کمی ہے۔ کسی حسین چیز کو دیکھ کر اس کے حُسن وجمال کی نمائش کرنے میں اس قدر حُسن کاری نہیں ہے جس قدر یہ ظاہر کرنے میں کہ اُس چیز کی خوبصُورتی میں کیا نقص ہے اور اس میں کس قسم کا اضافہ ممکن ہے۔ آخر میں صرف اتنا عرض کر کے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے کہ حسن کاری حسن کاری کے لئے نہیں بلکہ حُسن کاری بہبودِ خلائق کے لئے یعنی اس کی ترقی وکمال کے لئے ہے جس افسانے میں خاکے کی جدت اور اپج، کردار کی ندرت اور خوبصورتی کے علاوہ قاری کو شاہراہِ ترقی کی طرف رہنمائی کرنے والے خیالات موجود ہوں وہی افسانہ حُسن کاری کے نقطۂ نظر سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔

بشمبر ناتھ کوشک

مترجمہ غلام رسول حیدر آبادی

محفلِ ادب

ترجمہ کے متعلق چند اصولی باتیں

چونکہ اُردو زبان ابھی تک دَورِ تراجم سے نہیں گزری ہے اس لئے یہ بحث کبھی نہ کبھی ضرور دیکھنے میں آجاتی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ کس اصول سے کیا جائے ـــــ کوئی کہتا ہے کہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کوئی عربی و فارسی سے مدد لینا ضروری سمجھتا ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صرف معمولی قصّے کہانی کی کتابوں کا تعلق ہے۔ آپ بہ آسانی ہندی بھاشا سے کام نکال سکتے ہیں، لیکن جس وقت سوال علمی کتابوں کا آئے گا تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو عربی فارسی سے مدد لیں یا سنسکرت سے، جب غیر زبانوں کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُردو دان طبقہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

ہر چند بعض کتابیں مصطلحاتِ علمیہ کی لکھی جا چکی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی اصولی گفتگو اس موضوع پر نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہو سکا جس کو سامنے رکھ کر ہم ترجمہ کی دشواریوں کو دُور کر سکیں۔

انجمن ترقیٔ اُردو اور جامعہ عثمانیہ کی خدمات اس باب میں یقیناً قابلِ قدر ہیں اور اس وقت تک وہاں سے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہو چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ تمام ترجمے کسی ایک اصول کے ماتحت نہیں کئے گئے اور اربابِ قلم کی وہ تشویش جو اصول سے متعلق تھی ہنوز باقی ہے۔

انجمن ترقی نے جو لغت مصطلحات کا مرتب کیا ہے وہ ناقص و نامکمل تو خیر ہے ہی، افسوس یہ ہے کہ جتنا کچھ اس میں ہے وہ بھی کسی اصول کے ماتحت نہیں ہے، کسی جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ لے لئے ہیں اور کسی جگہ عربی کے ثقیل مصطلحات لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ اُردو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ہم کو غیر زبانوں کے الفاظ لینا ضروری ہیں، اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ الفاظ کس زبان سے لئے جائیں عربی سے یا سنسکرت سے۔

سنسکرت سے مصطلحات مستعار لینا گناہ نہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس زبان سے تعلق نہیں رہا ہے۔ اور عربی سے وہ بڑی حد تک مانوس ہیں یہاں تک کہ دیہاتیوں کی زبان میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عربی سے مدد نہ لی جائے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ تصریفی آسانیوں کو دیکھیں گے تو لامحالہ سنسکرت پر عربی کو ترجیح دی جائیگی۔ اور یوں بھی اس وقت تک علوم و فنون کی جتنی کتابیں عربی میں آچکی ہیں سنسکرت یا بھاشا میں منتقل نہیں ہو سکیں۔

بہر حال چونکہ ترجمہ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور میں نے ہمیشہ عربی سے مدد لینے کو مرجح سمجھا ہے اس لئے آج کی صحبت

میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں کہ خود عربی میں ترجمہ کے کیا اصول ہیں، ممکن ہے کسی حد تک مفید ثابت ہوں۔

پہلا اصول تو یہ ہے کہ جب تک انہیں عربی الفاظ ملتے ہیں وہ عجمی الفاظ کا ترجمہ اپنی ہی زبان کے مترادف الفاظ میں کرتے ہیں البتہ وہ عربی الفاظ میں اُن تمام الفاظ کو شامل کرتے ہیں جو اُن کے لغت و ادب میں اوزانِ عربیہ پر جاری ہیں خواہ اُن کی اصل کچھ ہو ——— مثلاً قلم کہ در اصل یونانی لفظ ہے لیکن چونکہ اُن کے لغت میں رائج ہے اس لئے اُسے وہ عربی سمجھتے ہیں، یا ابریق کہ فارسی الاصل ہے، یا قیس کہ سریانی کا لفظ ہے یا سلطان کہ نبطی الاصل ہے یا مشکاۃ کہ حبشی الاصل ہے سب عربی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ اوزانِ عربیہ کا بھی زیادہ لحاظ نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر استعمال و رواج کو دیکھتے ہیں اور اسی لئے جند بید ستر، سالامندرا اور قنطاریون ایسے الفاظ بھی اُن کے نزدیک عربی کے الفاظ ہیں۔

اس قاعدہ میں ان کے یہاں بہت کم استثنائی مثالیں مل سکیں گی اور افعال میں تو بالکل نہیں کیونکہ وہ غیر زبان کے افعال کبھی استعمال نہیں کرتے ——— اسی طرح حروف میں بھی کوئی مستثنےٰ نہیں ہے بجز (De) فرانسیسی (of) انگریزی اور (von) جرمنی کے، کہ یہ سب حروفِ اضافی ہیں اور عربی میں ان کی ضرورت نہیں لیکن صرف اس لئے کہ التباس پیدا نہ ہو اور لوگ آسانی سمجھ سکیں، کیونکہ اگر بجائے پرنس آف ویلز کے پرنس ویلز لکھیں تو ممکن ہے لوگوں کو سمجھنے میں زحمت ہو۔

اسماء میں بیشک شواذ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بعض عجمی الفاظ اس طرح داخل ہو چکے ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو اصل مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا مثلاً لفظ پرنس کو لیجئے، کہ اس کا ترجمہ عربی میں لفظ امیر سے کیا جاتا ہے لیکن پرنس آف ویلز کا ترجمہ امیر ویلز یا امیر آف ویلز نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح معنی پر صریح دلالت نہیں ہوتی چونکہ ترجمہ کا اصل مقصود یہ ہے کہ کم سے کم وقت اور الفاظ میں سامع ہمارے مدعا کو سمجھ سکے اس لئے عجمی الفاظ بجنسہٖ لے لینے میں وہ کبھی احتراز نہیں کرتے اگر ضرورت اس کی ناشی ہوتی ہے ——— اب سے بہت پہلے ابن اثیر، ابن سینا اور ابن بیطار بھی ایسے عجمی الفاظ کو جو کثرت سے رائج ہو گئے تھے اور جو اپنے مفہوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے تھے، لے لیتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں نہ کرتے تھے لیکن اگر کسی التباس کا اندیشہ نہیں ہوتا تو بیشک عربی میں ترجمہ کرتے تھے اور اب بھی یہی دستور ہے چنانچہ "پرنسات اروبا" کبھی نہیں لکھیں گے بلکہ "امراء اوروبا" لکھیں گے۔

الغرض ان کا مقصود ترجمہ سے یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا فوراً سمجھ لیا جائے اور اس غرض کے لئے وہ عجمی الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے مثلاً (Rheumatism) کو لیجئے کہ اب عربی میں زیادہ تر اس کو "روماتزم" کہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے عربی مرادف لفظ "داء المفاصل" یا "وجع المفاصل" موجود ہے، لیکن چونکہ داء المفاصل سے عام طور پر ہاتھ پاؤں کے جوڑوں کا درد سمجھ میں آتا ہے اور پیٹھ کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے اُنہوں نے روماتزم جوں کا توں اپنے یہاں لے لیا اسی مصلحت سے وہ بجائے توتیا کے زنک اور بجائے نشادر کے امونیا لکھتے ہیں۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عجمی لفظ کا صحیح مترادف لفظ عربی میں نہیں ملتا ہے تو پھر یہ جستجو کی جاتی ہے کہ قریب تر مفہوم کس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا مل گیا تو اسے اختیار کر لیتے ہیں ——— مثلاً انگریزی لفظ "Mercenaries" ہے۔ اس سے مراد وہ افواج ہیں جو دوسرے ممالک سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اب انہوں نے سوچا کہ یہ رسم یقیناً عربوں میں بھی رہی ہوگی اور ضرور اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہوں گے، چنانچہ جستجو سے ان میں لفظ "مسترزقہ" ملا جو ایسی فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور وہ انہوں نے اختیار کر لیا ——— اسی طرح ایک اور انگریزی لفظ "Tributary" ہے جس سے مراد وہ چھوٹی ندی ہے جو کسی دریا میں جا کر گرتی ہے، اس کے لئے جب انہوں نے قدیم سفرنامے اپنے یہاں کے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے لفظ نامر استعمال کیا گیا ہے جس کی جمع نوآمر آتی ہے، اس لئے انہوں نے اس کو اختیار کر لیا ——— اگر کوئی ایسا عجمی یا عامی لفظ ہوتا ہے جس کی عربی زیادہ رائج نہیں ہے تو بدستور وہی لفظ باقی رکھا جاتا ہے مثلاً مصر میں لفظ لقاوی کثرت سے مستعمل ہے اور عربی لفظ بذار کوئی استعمال نہیں کرتا، اسی طرح مذبح کو سلاخ بلدی کہنے کا رواج ہے اور زبل کوئی نہیں کہتا، یا پل کو بجائے جسر کہنے کے کبری کہتے ہیں اور ڈاک کو بجائے برید کے بوسطہ، تو انہوں نے انہیں رواجی الفاظ کو لے لیا، کیونکہ وہ زیادہ قریب الفہم ہیں اور عام و خاص سب انہیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

تیسرا قاعدہ عجمی ناموں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ جو نام جس طرح سے عربی میں رائج ہیں ان کو بدستور اسی حال پر رکھا گیا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، مثلاً ابراہیم، یوسف، المانیا، امیرکا وغیرہ اور جو نام نئے آتے ہیں ان کو تلفظ کے لحاظ سے لکھتے ہیں ——— شہروں کے بعض نام ایسے ہیں جو زمانۂ قدیم سے عربی میں چلے آ رہے ہیں جیسے وینس کے لئے بندقیہ، سسلی کے لئے صقلیہ سو اس کے لئے انہوں نے یہ کیا ہے کہ جب وہ کسی واقعۂ تاریخی کا ذکر کریں گے تو وہی بندقیہ و صقلیہ استعمال کریں گے، لیکن جب زراعت و صناعتِ مالیہ کے متعلق کچھ لکھنا ہوگا تو وہ وینس و سسلی ہی لکھیں گے، کیونکہ اہلِ حرفت و پیشہ میں یہی زیادہ رائج ہیں۔

بعض نام ایسے ہیں جو فی الاصل عربی ہیں لیکن اہلِ مغرب نے ان کی صورت میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، سو ان کو اسی اصلی صورت میں لکھا جاتا ہے اور اہلِ مغرب کے تصرفات کو قبول نہیں کیا جاتا، مثلاً قاہرہ، قرطبہ، اشبیلیہ کو اب کیرو، کارڈووا اور سیوائل کبھی نہ لکھیں گے۔

چوتھا قاعدہ الفاظِ جدیدہ کا ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ اگر انہیں کوئی لفظ عربی کا ایسا مل جاتا ہے جو پہلے سے اس معنی میں رائج ہے تو پھر وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں مثلاً مستحجین، مدرعۃ، نیمتر حجین اور ففنفور وغیرہ بلکہ اسی سے افعال بھی بنا لیتے ہیں مثلاً مغنطیس سے انہوں نے مغنط فعل بنایا اور کہربا سے کہرب۔ لیکن اگر کوئی لفظ رائج شدہ انہیں نہیں ملتا تو وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ نئے لفظ کو اپنی زبان میں لے لیتے ہیں جیسے تلفون، فونوغراف، مکروفون، اتوموبیل اور کبھی کبھی کوئی دوسرا عربی لفظ بھی گھڑ لیتے ہیں جیسے اتوموبیل کے لئے سیارہ کہ اب عام طور پر یہی مستعمل ہے۔

اوّل اوّل جب بیروت میں بائسکل آئی تو اس کا ایک پہیہ بہت بڑا تھا، اور دوسرا بہت چھوٹا اور سوار ہونے میں بڑی زحمت ہوتی تھی، لوگوں نے سمجھ لیا کہ ٹرائیسکل (تین پہیوں والی گاڑی) کے مقابلہ میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے اس لئے انہوں نے لفظ بائیسکل اختیار کرنے سے احتراز کیا اور دراجہ کا لفظ اختراع کیا، بعد کو جب دو پہیوں والی گاڑی کے لئے بائسکل اور تین پہیوں والی کے لئے ٹرائیسکل کا لفظ وضع ہوا تو اہل مصر نے دراجہ کو چھوڑ کر عجلہ کا لفظ وضع کیا جو دونوں پر حاوی تھا۔

مصطلحات علمی میں چونکہ تعریب کا بہت کم موقعہ ہے اور ذرا ذرا سے تغیر سے معنے میں بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اس لئے انہوں نے اس باب میں بھی علماء کا تتبع کیا اور جوں کا توں لے لیا۔

اب معنی کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ حقیقی ہوں گے یا مجازی، اور اہل عرب کے نزدیک مالوف ہوں گے یا غیر مالوف، پس اگر وہ حقیقی ہیں اور مالوف بھی ہیں (مثلاً گھوڑے پر چڑھنے کو وہ رکوب کہتے ہیں اور شراب پینے کو شرب) تو اس قبیل کے معنے جہاں جہاں آئیں گے وہ یہی افعال استعمال کریں گے۔ اگر معنی حقیقی ہیں اور غیر مالوف تو ترجمہ لفظی کرتے ہیں۔ یا قریب قریب لفظی کے مثلاً بندوق سر کرنے کے لئے وہ لفظ اطلاق استعمال کرتے ہیں اور بم وغیرہ کے لئے رمی۔

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور مالوف تو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور انسے اختیار کر لیتے ہیں جیسے فتنہ جگانے کے لئے الفاظ الفتنہ۔

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور غیر مالوف تو وہ اس قبیل کے استعارات کو اپنی زبان میں تلاش کرتے ہیں اگر قریب قریب اس کے مل گئے تو انہیں لے لیتے ہیں ورنہ پھر اس غیر زبان کے استعارہ کو استعمال کرنے لگتے ہیں ــــــــ الغرض اہل عرب کے تمام اصول ترجمہ کے متعلق آسانی کے خیال پر قائم کئے گئے ہیں اور وہ دوسری زبان کے الفاظ لینے میں بھی تامل نہیں کرتے، اس لئے اگر اردو میں بھی انہیں اصول پر کاربند ہوں تو کیا حرج ہے۔ یعنی غیر زبان کے وہ الفاظ جو رائج ہو چکے ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیں اور مصطلحاتِ علمیہ یا دوسرے بلند مفہوم کے الفاظ کا ترجمہ کرنے میں پہلے اپنی زبان میں جستجو کریں، اگر کوئی لفظ پورے معنی پر حاوی مل جائے تو لے لیں، اور اگر کسی غیر زبان سے استعارہ کی ضرورت ہے تو عربی فارسی سے مدد لیں۔

ہر چند اس صورت میں عربی فارسی کا علم ضروری ہوگا اور ہر شخص ترجمہ نہ کر سکے گا، لیکن اگر سنسکرت یا بھاشا کے ثقیل الفاظ لئے گئے تو سنسکرت دانی کی ضرورت ہوگی، اور یہ امر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فارسی عربی کا سیکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سنسکرت کا ــــــــ

نگار

ــــــــــــــــــــــــ

مطبوعات

تاریخ سلطنت خداداد (میسور) مؤلفہ جناب محمود خاں صاحب محمود بنگلوری۔ یہ کتاب ساڑھے چار سو سے اید صفحات پر نفیس کاغذ اور طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور اس میں چودہ ہاف ٹون بلاک کی تصاویر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب میسور کی ایک مفصل اور دلچسپ تاریخ ہے۔ ابتدا میں نوابان ارکاٹ کا حال ہے۔ اسکے بعد تاریخ میسور اور تاریخ دکن و جنوبی ہند۔ کتاب کا زیادہ حصہ سلطان حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے ساتھ ان کی معرکہ آرائیوں کا مفصل تذکرہ ہے۔ زوال سلطنت کے اسباب اور اسلامی ہند پر اُن کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اُردو کی تاریخی تصانیف میں بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ قیمت چار روپے۔ پتہ:۔ جناب محمود خاں صاحب۔ ملا ڈکنسن روڈ بنگلور۔

ریحانہ (عہد فاروقی کا ایک دلکش ناول) مصنفہ حضرت کوکب جوالاپوری مدیر حمایت اسلام لاہور۔ یہ ایک تاریخی ناول ہے جو شرر کے ناولوں کی یاد دلاتا ہے۔ اسکا مقدمہ مولانا روشن صدیقی نے لکھا ہے۔ زبان اور انداز بیان دلکش اور پلاٹ دلچسپ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔ حجم ۲۴۴ صفحات قیمت ۱۰ر۔ ریحانہ بک ڈپو۔ ولایت بلڈنگ، برکت علی روڈ سے منگوائیے۔

نقد الادب مصنفہ جناب عطاء اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ یہ دو سو صفحات کی ایک مجلد کتاب ہے جو بہت حسن اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ اُردو زبان میں فن تنقید کے اصول پر شاید اس سے قبل اس محنت سے کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی۔ مصنف نے بہت تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ قیمت عہ۔ مصنف سے گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے پتے سے منگوائیے۔

موتی۔ یہ دہلی کے نوجوان ادیب سید یوسف بخاری صاحب کی تالیف ہے جس میں اُنہوں نے زندگی اور اُس کے ہر شعبہ کے متعلق علم و حکمت کے کثیر التعداد اقوال جمع کر دیے ہیں۔ ابتدا میں مولانا راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی اور جناب اختر انصاری کی تعارفی تحریریں ہیں اس کے بعد یوسف صاحب نے اقوال کی اہمیت اور اُن کا فلسفہ وغیرہ بیان کیا ہے۔ تقریباً سو سے زائد صفحات پر اقوال پھیلے ہوئے ہیں جو بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ کتاب کا کاغذ کتابت اور طباعت بہت نفیس ہے۔ قیمت ۱۲ر مصنف سے گلی امام متصل جامع مسجد دہلی کے پتے سے منگوائیے۔

ساقی کا افسانہ نمبر۔ دہلی کے مشہور رسالے "ساقی" نے حال میں اپنا افسانہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس کا حجم دو سو صفحات ہے۔ اور اس میں جدت یہ ہے کہ بارہ مشہور افسانہ نگار حضرات نے اس میں ایک ہی پلاٹ پر بارہ دلچسپ افسانے لکھے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ یہ ایک دلچسپ نفسیاتی مطالعہ بھی ہے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف دماغ کس کس انداز میں اپنے تخیلات پیش کرتے ہیں۔ ہم جناب مولانا شاہد احمد صاحب کو اس کامیاب تجربے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اس پرچے کی قیمت دس آنے ہے۔ پتہ دفتر رسالہ ساقی دہلی

جہانگیر

کا

نظام نمبر ۱۹۳۴ء

اپنے

صوری و معنوی محاسن کے لحاظ سے شعر و ادب اور تاریخ کی جان ہوگا

ملک کے

بلند پایہ اور مستند اہل قلم حضرات کے مضامین نظم و نثر اس عرفانی ادبی یادگار کی زینت ہونگے

بلند پایہ صحافت کا

یہ جمیل ترین مرقع ستمبر ۱۹۳۴ء کے وسط میں پیش ہوگا

حضرت امیر خسرو، حضرت حافظ شیرازی اور حضرت بیان یزدانی میرٹھی مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام خدائے سخن حضرت امیر مینائی، حضرت لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط

بھی نظام نمبر کی زینت ہونگے

جن حضرات نے گذشتہ سال کا نظام نمبر ملاحظہ فرمایا ہے وہ اس کی شان و شوکت کا صحیح اندازہ فرما سکتے ہیں قیمت فی پرچہ دو روپے کا صرف چار روپے تین آنے سالانہ قیمت اولین فرصت میں بھیج دیجئے جس میں سال بھر رسالہ حاضر ہونے کے علاوہ صرف یہ نظام نمبر بلا زائد قیمت پیش ہوگا بلکہ اسی چندہ میں دسمبر ۱۹۳۴ء میں خاص نمبر اور خاص الاہتمام بالشان سالنامہ بھی مفت نذر ہوگا آرڈر بھیجنے میں تساہل نہ کریں

خاکسار منیجر رسالہ جہانگیر ریلوے روڈ لاہور

قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں ۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا ۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے ۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/ ۔

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے ۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے ۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

Printed at the Half-Tone Press, F W.Co., Lahore

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۶۶۳

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(غالب)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی. اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی. اے

فہرستِ مضامین

جلد ۳۶ — نمبر ۶

ہمایوں بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء

تصویر:- سوچ بچار

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے مع محصول

قیمت فی پرچہ ۸ آنہ

بزمِ ہمایوں

یہ اس سال کا آخری پرچہ ہے آئندہ پرچہ "ہمایوں" کا نیا سالگرہ نمبر ہوگا۔ ہمایوں کے معیار کو قائم رکھنے اور اسے بیش از بیش مفید اور دلچسپ بنانے کیلئے جو کوشش ہم کرتے رہے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ معاصرین اہلِ قلم اور ناظرینِ "ہمایوں" نے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ سال ہم "ہمایوں" کو اور بھی زیادہ دلکش بنانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے علاوہ گزشتہ سال ہم نے ایک زاید افسانہ نمبر شائع کیا تھا۔ مستقبل قریب میں ہمارا ارادہ ہے کہ "ہمایوں" کا ایک صحافت نمبر شائع کریں جسمیں ہندوستانی صحافت کے آغاز کی دلچسپ اور پراز معلومات تاریخ ہوگی۔ ہمیں یقین ہے کہ اس موضوع پر ایسا محققانہ مضمون آج تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ جنوری ۱۹۳۵ء کے سالگرہ نمبر کی مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ یہ چاند زمانہ:۔ جدید مغربی تحریکات کے متعلق ایک دلچسپ اور پراز معلومات مضمون۔ از میاں بشیر احمد صاحب

۲۔ بھوندو ہوی کی اکاون لاکھ علامتیں۔ ہمایوں کے مقالہ نگارِ خصوصی حضرت "فلک پیما" کا ایک بے مثال مزاحیہ مضمون۔

۳۔ افسانہ اور حقیقت نگاری۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ڈی کا بلند پایہ نقادانہ مقالہ۔

۴۔ صندل پور کے بریجے۔ جناب مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک انوکھا محققانہ اور پراز معلومات دلچسپ مضمون۔

۵۔ جمالیات۔ علامہ کیفی دہلوی کا بصیرت افروز اور دلچسپ فلسفیانہ مضمون۔

۶۔ از کجاست تا بہ کجا۔ ایک بلند پایہ مزاحیہ افسانہ جو اردو کے مشہور ادیب خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے کمشنر انبالہ نے خاص طور پر اس نمبر کے لئے لکھا ہے۔

۷۔ دوسرے افسانوں میں پروفیسر حمید احمد خاں ایم۔ اے کا ایک طبعزاد حکیمانہ دلچسپ افسانہ ہوگا ایک دلچسپ افسانہ حامد علیخان جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کا ہوگا

اس کے علاوہ اور بڑے چھوٹے مضامین دلکش نظمیں اور خوبصورت سہ رنگ و یکرنگ تصاویر اس پرچہ کی زینت ہوں گی۔

جہاں نما کے زیرِ عنوان گذشتہ سال کے تمام واقعات پر ایک مبسوط تبصرہ ہوگا۔ اس پرچے کی دوسری خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں "ہمایوں" دوسرے معاصرین کی روش کے خلاف اپنے خاص نمبروں کی الگ قیمت نہیں لیتا۔ ہر خریدار کو سالگرہ نمبر اور دوسرے ہر اس نمبر سالانہ چندہ ہی میں مل جاتے ہیں خلافِ معمول یہ پرچہ بھی ۷۲ کے بجائے ۹۶ صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ موجودہ خریدار نہ صرف خود آئندہ سال خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں گے بلکہ اپنے احباب میں سے بھی نئے خریدار پیدا کر کے ہمایوں کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

جہاں نما

سائنس اور جنگ

برٹش ایسوسی ایشن (ابرڈین) کے تین ہزار اراکین کے سامنے سرجیمز جینز نے اپنی صدارتی تقریر میں ان لوگوں کے خیال کی شدید طور پر تردید کی جو یہ کہتے ہیں کہ سائنس نے دنیا کو فائدے کے بجائے نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔

انہوں نے کہا یہ ظاہر ہے کہ جو ملک سائنس سے اپنا تعلق منقطع کرلے گا۔ وہ ہر اعتبار سے بالکل پسماندہ رہ جائیگا۔ بعض جدید ایجادات نے اگر لوگوں کو بے روزگار کیا ہے تو اس کے مقابلے میں بے شمار ایسی ایجادات بھی ہوئی ہیں جن سے لوگوں کے لئے نئے روزگار کی شکل نکل آئی ہے۔

جو لوگ ایسی صورتِ حال کی تمنا رکھتے ہیں جس میں ہر قسم کی مشینوں کا فقدان ہو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسی دنیا میں آباد ہیں جہاں انہیں ترقی یافتہ تجارتی طریقوں کا مقابلہ کرنا ہے اور جدید اسلحہ کے ہلاکت بار حملوں سے اپنی حفاظت بھی کرنی ہے۔

اگر سائنس نے جنگ کے ہتھیاروں کو خوفناک بنادیا ہے تو اس نے حفاظت کے لئے بھی ہتھیار ایجادات بہم پہنچادی ہیں۔ حملے اور اس سے حفاظت کے لئے جو کوششیں کی جاتی ہیں سائنس نے ان میں کسی طرح بھی جانبداری سے کام نہیں لیا۔

اس صورت میں یہ خیال درست نہیں کہ آئندہ جنگیں زیادہ متواتر اور زیادہ مسلسل ہوں گی۔ یہ ضروری نہیں کہ آئندہ جنگ ضرور زیادہ ہلاکت خیز ہی ہو۔ البتہ جنگ کا امکان معدوم نہیں ہوا۔

سائنس نے انسان کو اس سے قبل کہ وہ اپنے آپ پر اختیار حاصل کرتا قدرت پر اختیار دے دیا ہے۔

سائنس انسان کو پشت بہ پشت وراثت میں مل رہا ہے لیکن حاصل کردہ عادات و خصوصیات اس طرح ایک دوسرے کو منتقل نہیں ہوتیں۔ اس طرح گویا علم کے لحاظ سے ایک پشت دوسری کے برابر ضرور ہوتی ہے لیکن دوسری چیزوں میں نہیں ہوتی۔ یہ تلخ حقائق ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں اور جن کے پیشِ نظر ہمیں یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تہذیب کے لئے ایک خطرہ ہے۔

نباتات پر کلوروفارم کا اثر

ڈاکٹر بوس نے نباتات کے متعلق جو حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں ان میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ حال میں انہوں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ درخت کلوروفارم کے اثر سے عارضی طور پر بیہوش کئے جاسکتے ہیں۔

عام طور پر معلوم ہے کہ زیادہ بڑے درخت ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ نہیں لگائے جاسکتے اور اگر ایسا کیا جائے تو وہ بہت جلد سوکھ جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بڑے درختوں کی جڑیں ضرور کٹ جاتی ہیں اور اگر جڑوں کا کچھ حصہ کٹ جائے تو اکثر درخت سوکھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر بوس نے ثابت کیا ہے کہ محض چند جڑوں کا کٹ جانا ہی درخت کے سوکھنے کا باعث نہیں ہوتا بلکہ جڑوں کے کٹنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ درخت کو اکھاڑ کر پہنچانے میں جو صدمہ درخت کو پہنچتا ہے وہ اس کے لئے ذہنی طور پر اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔

اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر بوس نے بعض بڑے بڑے درختوں کو کلوروفارم کے عمل سے بیہوش کیا اور اس کے بعد انہیں ایک جگہ سے اکھڑوا کر دوسری جگہ لگا دیا۔ بیہوشی کی حالت میں درخت صدمے کی اس شدت سے محفوظ رہے جو ان کے لئے جانکاہ ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درخت دوسری جگہ دوبارہ پنپنے لگے۔

ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کے بعد بعض ایسے درخت بھی ابتدا میں مرجھا جاتے ہیں جو بعد میں پھر سرسبز ہوجاتے ہیں۔ ان درختوں کو بھی صدمہ تو ہوتا ہے لیکن سخت جانی کی وجہ سے وہ اسے برداشت کرلیتے ہیں اور اپنے نئے ماحول میں دوبارہ خوش ہوجاتے ہیں۔

موجودہ چینی مصوری

ڈگنی کارٹر نے جو ناروے کی ایک فنان خاتون ہے دنیا کے مختلف ممالک کی مصوری کا مطالعہ کیا ہے چینی مصوری کے متعلق اس کا ایک مضمون جو "ایشیا" میں شائع ہوا ہے اہل ذوق کے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوگا۔

چین کے پاس عہد قدیم سے مصوری کا ایک حیرت انگیز خزانہ موجود ہے لیکن اب کئی صدیوں سے وہاں کی مصوری کو ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصوری پر قدیم روایات اور ایسے لوگوں کی آراء کا قبضہ ہوگیا ہے جو خود اعلیٰ درجے کے فن کار نہیں بلکہ مطالعہ وغیرہ سے نقاد بن گئے ہیں چینی مصوری کے انحطاط کے اس پنج صد سالہ دور میں کبھی کبھی تائی چن اور ٹنگ ین جیسے اعلیٰ درجے کے مصور نظر آتے رہے جنہوں نے اپنی اپج سے صحیح مصوری کے نمونے پیش کئے اور قدامت پرستی کی قیود

کو توڑ ڈالا۔ واشنگٹن کی فریر گیلری میں ٹائی جن کی تصویر "بادِ خزاں اور اُٹھتی ہوئی موجیں" فن کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ تصویر فن کتابت سے قریبی تعلق رکھنے کے باوجود زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ہے اور بہت معنی خیز ہے۔ گزشتہ تین سو سال سے چینی مصوری اہل فن کی نظروں سے اس لئے بھی گر گئی کہ مصوری کے ایسے نمونے پیش ہوگئے جو نااہل لیکن بلند شخصیت کے مصوروں نے امراء کو ہدیۃً بھیجے تھے۔ ان کی قدر فن کے لحاظ سے نہ ہوتی تھی بلکہ ہدیہ دینے والے اور قبول کرنے والے کے معاشرتی درجے اور اس کی امارت کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اگر ایسی تصویریں ضائع کردی جائیں تو باقی یقیناً ایک قابلِ قدر ذخیرہ رہ جاتا۔

چین میں آج کل ایسے نقادوں کی ضرورت ہے جو حقیقی مصوروں اور ان لوگوں کے درمیان امتیاز کرسکیں جنہوں نے مصوری محض شغل یا تفریح کے لئے اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ چینی مصوروں کو قدیم مصوری کی رسمیں توڑنے کے لئے مغرب سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چین مغرب کی تقلید میں اپنی مصوری کی خصوصیات کو کھو بیٹھے۔

لڑکیوں کے لئے اخلاقی معیار

(رابندر ناتھ ٹیگور کے نصائح)

ٹیگور نے اپنی ایک تقریر میں لڑکیوں کے لئے اخلاق و آداب کا معیار قائم کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:۔

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لڑکیوں کو آپس میں اور دوسروں کے ساتھ نہایت خلیقانہ برتاؤ کرنا چاہئے۔ خلافِ آداب طرزِ عمل ہر صورت میں قابلِ ملامت ہے۔ لیکن لڑکیوں کی صورت میں تو یہ ایک ناقابلِ عفو جرم ہے۔

تحریر، تقریر اور اظہارِ جذبات میں اعتدال کے اصول پر قائم رہنا اچھے اخلاق کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شور و غوغا مچانا اور آپے سے باہر ہونا زندگی یا زندہ دلی کا ثبوت نہیں۔ اچھے آداب اچھی فطرت سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں اور سلیم الفطرت لوگ دوسروں کی رضاجوئی اور ان کے صحیح حقوق کے احترام کی خاطر خود تکلیف بھی برداشت کر لیتے ہیں۔

جب کوئی ہمسایہ مطالعہ میں مصروف ہو شور مچانا اور کسی کو سونے کے وقت سونے سے روک دینا یا کسی کے کمرے میں بلا اجازت داخل ہو جانا اور اس کی چیزیں خراب کرنا۔ اور اس کے کاغذوں اور خطوں پر متجسس نگاہیں ڈالنا۔ اور اس کی کتابیں یا دوسری قابلِ استعمال اشیاء لے جانا یہ سب باتیں خلافِ آداب ہیں۔

کسی کو بدنام کرنے کے لئے افواہیں پھیلانا۔ یا ان سے لطف اٹھانے کی نفرت انگیز عادت ہماری سیرت میں ایک ایسا عیب

پیدا کر دیتی ہے جس سے انسان کی فطرت بالکل پاک ہونی چاہیئے۔

صفائی اور باقاعدگی ہر حال میں ملحوظ رکھنی چاہیئے بعض لوگ تعیش اور تصنع کے خلاف احتجاج کے طور پر پھوہڑپن کے عادی ہونے لگتے ہیں۔ لیکن لباس کی صفائی اور باقاعدگی اور چیز ہے۔ اور خود نمائی اور چھچھورپن اور چیز ہے۔ لباس کی دلکشی اعلیٰ درجے کی جمالیاتی حس اور سادگی کی خوبصورت روح کا ثبوت بھی ہو سکتی ہے۔ لباس کو محض دکھاوا ہی نہ سمجھنا چاہیئے یہ دوسروں کی تعظیم کی ایک علامت بھی ہے اگر ہم دوسروں کے سامنے اپنے لباس کے معاملے میں بے پروائی برتیں تو گویا ہم نہایت کج خلقی سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ ہمیں اُن کی مطلق پروا نہیں"۔

شوہروں کے لئے ایک سبق

مادام گگنے کو پچیس سال کی ایک خوبصورت فرانسیسی عورت ہے شوہر کے قتل کے جرم میں دو سال قید کی سزا ہوئی اور یہ سزا بھی پہلے جرم کی قانونی رعائت سے منسوخ ہوگئی ہے۔ شوہر کا جرم یہ تھا کہ وہ رات کے کھانے کے لئے گھر پر نہ آیا تھا استغاثہ کا بیان ہے کہ قتل کی رات مادام گگنے بہت دیر تک کھانے پر اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کھانا بالکل خراب ہوگیا۔ لیکن شوہر پھر بھی نہ آیا۔ اس پر مادام گگنے سخت غضب آلود ہوکر اُس کی تلاش میں نکلی۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شراب پینے میں مصروف تھا۔ عورت نے پستول نکالا اور شوہر کا خاتمہ کر دیا۔

تصویر

سوج سجارہ

یہ فرانس کے حیرت کار سنگتراش روڈیں کا بہترین اور خوبصورت ترین کارنامہ ہے۔ بعض نقادوں کو جو روڈیں کی فنی تخلیق کو بدصورت قرار دیتے تھے۔ روڈیں نے یہ غیر فانی جواب دیا کہ

"کوئی زندہ چیز بدصورت نہیں"

نازی جرمنی

موجودہ جرمن قوم ایک ایسے دورِ حیات سے گزر رہی ہے۔ جو اس کے لئے نہایت اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ اگر وہاں کے تمام لوگ اپنے آپ کو ایک متحدہ قومیت میں جذب کر لیں۔ انتشار و پراگندگی کے وہ تمام عناصر جو اسے آج کل خانہ جنگی اور اندرونی مناقشات کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں۔ جلد از جلد قومی مفاد اور ملک کی حفاظت و بقا کے لئے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے جائیں تو جرمن قوم کے سامنے پھر ایک باوقار اور عظیم الشان مطمحِ حیات ہوگا۔ ورنہ اس کی موجودہ حالت، اس کو ایک غیر قابلِ اعتنا چھوٹی سی ریاست میں منتقل کر دے گی ——— جب سے ہٹلر، برسرِ اقتدار ہوا ہے، اخبارات میں ہر روز نہایت خوفناک خبریں نکلتی رہتی ہیں۔ کبھی فرانس اور جرمنی کانفرنسِ تحدیدِ اسلحہ میں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیاں کرتے ہیں۔ کبھی جرمنی، آسٹریا کو اپنے زیرِ سایہ لانے کی "غیر آئینی" طور پر کوشش کرتا ہے۔ کبھی جرمنی اور اٹلی، برسرِ پرخاش نظر آتے ہیں۔ الغرض کوئی نہ کوئی جھگڑا ہر روز اس نئی طاقت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ کیا واقعی، دنیا کی سلامتی، اور امنیت، ہٹلر کے ہاتھوں میں ہے؟ اس پر سطورِ ذیل میں روشنی ڈالی گئی ہے :—

جنگِ عظیم کے تخریبی اور تباہ کن اثرات میں جرمنی کی تعمیرِ نو کے اسباب مضمر ہیں۔ جرمنوں کے بڑھتے ہوئے احساسِ قومیت کا پیدا کرنے والا ہٹلر ہے۔ جس کی تمام پالیسی یا حکمتِ عملی معاہدۂ وِرسائی کی ذلت آگیں شرائط پر مبنی ہے۔ لہذا اُسے سمجھنے کے لئے اس اہم دستاویز کا مطالعہ ضروری ہے ———

۱۹۱۴ء کی جنگ اپنے ویراں ساز نتائج کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کرتی ہے۔ اس وقت کی بگڑی ہوئی حالت اب تک درست نہیں ہوئی۔ موجودہ معاشی و سیاسی مشکلات سب اسی جنگ کے ناگزیر نتائج میں سے ہیں۔ جب یہ شعلے بھڑکنے لگے تو یورپ بلکہ تمام دنیا ان کی زد میں آگئی۔ ایک طرف جرمنی، آسٹریا۔ بلغاریا اور ٹرکی اور ہنگری تھے۔ اور دوسری طرف فرانس، بلجیم، اٹلی، انگلستان مع نوآبادیات، امریکہ۔ روس وغیرہ وغیرہ۔ الغرض جنگ ختم ہوئی اور فتح کا سہرا اتحادیوں کے سر رہا اور وہ مغلوب دشمنوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے بیٹھ گئے۔ یہاں چونکہ ہمیں صرف معاہدۂ وِرسائی سے تعلق ہے۔ لہذا صرف اسی کا تذکرہ کریں گے۔ یہ معاہدہ جون ۱۹۱۹ء میں قرار پایا اور اس کی رُو سے اتحادیوں نے ہر قسم کی قیود اور بندشیں اپنے حریف جرمنی پر عائد کر دیں۔ شکست خوردہ جرمنی کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ ہار چکا تھا۔ اس میں مدافعت کی تاب بھی نہ تھی۔ ملک میں

عجب بدنظمی، انتشار اور بدگمانی سی پھیل گئی تھی، چنانچہ جرمنوں نے آنکھیں بند کرکے اس دستاویز پر مہر تصدیق ثبت کردی ـــ سب کچھ جا چکا تھا۔ مگر ابھی "احساسِ زیاں" باقی تھا اور اپنی ذلت اور پستی سے ہرگز مطمئن نہ تھے۔ اس لئے اب انہوں نے ۱۹۱۹ء کے پرزۂ کاغذ کی دھجیاں اڑانے کے لئے اعلان کردیا۔ عہد نامہ کی تین شرائط ایسی ہیں۔ جن سے جرمن قوم کو زبردست اختلاف ہے

۱۔ عہد نامہ کی رُو سے جرمن قوم کو اقرار کرنا پڑا کہ جنگِ عظیم کی تمام ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا انہیں تاوانِ جنگ کی کثیر رقمیں اتحادیوں کو دینی پڑیں۔

۲۔ آئندہ امن حفاظت کی ضمانت کے طور پر ان کی فوج وغیرہ محدود کردی گئی۔ وہ ایک لاکھ سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ چھ جنگی جہاز، چھ کروزر (cruisers) اور بارہ تباہ کن جہاز رکھنے کا حق دیا گیا۔ اور ہوائی طاقت کے قیام کی سخت ممانعت کی گئی۔

۳۔ یہ الزام دے کر کہ جرمن گورنمنٹ نوآبادیات کے انتظام میں کوتاہی کرتی ہے۔ ان سے بہت سے علاقے چھین لئے گئے۔ ان تمام ضبط شدہ علاقوں کا رقبہ تقریباً ۶۰۰۰۰ مربع میل ہے ـــ'

مندرجہ بالا شرائط اگر بنظرِ انصاف دیکھی جائیں تو نہایت کڑی اور جابرانہ ہیں۔ مثلاً سب سے پہلی شرط تاوانِ جنگ کی ہے۔ یہ رقم ۶۶۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تھی۔ ایک ایسے ملک سے جو شکست کھا چکا ہو۔ اور جس کے پاس خود اس کی بھوکی قوم کے کھانے کیلئے کچھ نہ ہو۔ جہاں ایک حکومت کا تختہ الٹ چکا اور جو اپنی زندگی، بالکل نئے آئین و قوانین کے تحت شروع کررہی ہو۔ جہاں بدنظمی قحط۔ بھوک اپنا سکہ جمائے ہوں اور سب سے زیادہ یہ کہ جس کی نوآبادیات بھی چھین لی گئی ہوں۔ اس سے اتنی کثیر رقم تو کیا ایک لاکھ پونڈ بھی ادا نہیں کئے جا سکتے تھے۔ یہ یورپ کے تدبر کی نہایت مضحکہ خیز مثال ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ فرانس اور بلجیم کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ ان کے ہاں بےکاروں کی تعداد بڑھی، زخمی سپاہیوں اور بیوہ عورتوں کے لئے وظائف کی ضرورت تھی، عمارات منہدم ہوئیں۔ قابلِ کاشت زمین ہمیشہ کے لئے بنجر بنادی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا نوآبادیاں چھین کر اور اس کو فوجی حیثیت سے بالکل بےدست و پا اور مفلوج کرکے اس غم و غصہ کی تسکین نہ ہوسکتی تھی اور اگر پھر بھی جذباتِ انتقام تاوانِ جنگ ہی پر مصر تھے۔ تو کیا اتنی ہی کثیر رقم کا مطالبہ قرینِ قیاس تھا۔

یہ ہیں: وہ خیالات جو ہر جرمن کے دماغ میں معاہدۂ ورسائی کا خیال کرتے ہی جوشِ و غضب کا ایک ہیجان برپا کر دیتے ہیں۔

دراصل اتحادی بھی آپس میں اُن جنگی قرضوں کی وجہ سے جھگڑے ہوئے تھے۔ امریکہ سب سے بڑا قرضخواہ تھا۔ انگلستان کو فرانس۔ اٹلی، زیکوسلافیہ، یونان رومانیا اور پرتگال سے قرضہ لینا تھا۔ برطانیہ۔ فرانس۔ اٹلی امریکہ کے مقروض تھے۔ اس لئے

ان سب کی یہ خواہش تھی۔ کہ کچھ ایسا انتظام ہوجائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پہلے تو نوآبادیات کے حصے بخرے کرلئے کہ وہ مستقل آمدنی کی صورت تھیں اور پھر قرضے اتارنے کے لئے اتنی بڑی رقم تاوان جنگ قرار دی گئی۔ کہ اس کی ادائی بس وہم وخیال ہی کرسکتا ہے ـــ بہرحال جرمنی نے نہایت دیانتداری اور محنت سے اس بار گراں سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہی مگر چونکہ تمام ملکوں پر جنگ کا نہایت مہلک اثر پڑا تھا۔ اس لئے ہر ایک کو اپنی ہی خوشحالی کی فکر تھی۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ اس کی تجارت کو فروغ ہو اور اسی کے ملک میں تمام دنیا کا سونا اکٹھا ہوجائے۔ اس کے لئے پرانی "تغیر مداخلت" کی (LAISSE FAIRE) پالیسی رد کر دی گئی اور محصول درآمد و برآمد کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ سب نے اپنے ملک کی صنعت و تجارت کی استواری کے لئے غیرملکی مال پر محصول لگانے شروع کر دیئے۔ اب صورت حالات نہایت پرخطر ہوگئی۔ مال فروخت کرنے کے لئے سب تیار ہیں۔ مگر خریدتا کوئی نہیں۔ چنانچہ بین الاقوامی تجارت بالکل سرد پڑگئی۔ ہر ایک ملک میں بے کاری بڑھنے لگی۔ لوگ بھوکوں مرنے لگے اور کئی ایک ملکوں میں انقلابی تحریکیں زور پکڑنے لگیں ـــ جرمنی کو بھی ان ناموافق حالات سے مفر نہ تھا۔ اس کا مال بھی اسی طرح بے کار جانے لگا۔ اقتصادی بدحالی نے شکستہ ملک کی جڑیں اور بھی کھوکھلی کر دیں۔ اس نے مجبوراً تاوان جنگ دینا بند کردیا اب کیا تھا۔ تمام یورپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ قرضخواہوں نے تقاضے شروع کر دیئے اور روپے کی پکار پڑنے لگی۔ معیار طلا (GOLD STANDARD) پہلے ہی گر چکا تھا۔ اب اس کے سنبھلنے کی بھی امید جاتی رہی۔ اس طرح سے موجودہ کساد بازاری روز بروز ترقی پر ہے۔ چنانچہ جرمنی میں بھی ۱۹۳۰ء کی نازک حالت کے بعد ایک انقلابی تحریک نے زور پکڑنا شروع کیا۔ یہ قومی اشتراکیت (NATIONAL SOCIALISM) کا دور حکومت ہے اور اس کا بانی اڈالف ہٹلر ہے۔ اول تو وہ اس سے منکر ہیں کہ جنگ عظیم کی تمامتر ذمہ داری جرمنی پر عائد ہوتی ہے اور اس میں وہ قدرے حق بجانب بھی ہیں۔ تاہم قطع نظر اس کے کہ جنگ کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اثرات بد کے ذمہ دار کون ہیں۔ واقعات کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوجائے گا کہ اگر تاوان جنگ کی یہ کڑی شرطیں پیش نہ کی جاتیں۔ تو یقیناً دنیا اس عالمگیر اقتصادی بدحالی میں مبتلا نہ ہوتی جرمنی ۱۹۳۲ء تک (یعنی لوزان کانفرنس تک) ۱۲۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تاوان جنگ ادا کرچکا ہے اور اس میں سے ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ فرانس کے حصے میں آئے اور باقی دوسری اتحادی جماعتوں میں تقسیم ہوئے۔ مگر چونکہ انہیں بھی امریکہ کا قرض دینا تھا۔ اس لئے باقی تمام رقم یعنی ۲۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ امریکہ کے خزانہ میں داخل ہوگیا ہے ـــ اب ایک طرف تو دنیا کا سونا فرانس اور امریکہ کے خزانوں میں بند پڑا ہے اور دوسری جانب قرضوں کی ادائی کے لئے تدابیر عمل میں لائی جارہی ہیں۔ لیکن یہ سنکر سخت تعجب ہوگا۔ کہ جرمنی نے جو کروڑوں پونڈ اتحادیوں کو ادا کئے ہیں (اور جن میں فرانس اور امریکہ حصہ دار ٹھہرے ہیں) جرمنی کی اپنی پیدا کردہ دولت نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی اس نے امریکہ اور انگلستان ہی سے قرض لیا ہے۔ یہ ایسی مثال

ہے کہ ایک شخص آج زید سے ایک روپیہ اُدھار لیتا ہے۔ کل جب زید کے تقاضے شروع ہوتے ہیں تو وہ بکر سے ۱/۲ ۱ روپیہ قرض
لے کر ایک زید کو دے دیتا ہے اور باقی سے اپنا خرچ نکالتا ہے۔ اسی طرح جب بکر مطالبہ کرتا ہے تو عمرو سے لے لیتا ہے اور
جب عمر ادائی قرضہ پر زور دیتا ہے تو پھر زید اور بکر سے طالبِ امداد ہوتا ہے ——— آپ دیکھتے ہیں کہ حالات کی یہ روش
کتنی تمسخر انگیز ہے۔ آخر جرمنی ان حالات میں کیا کرے۔ چنانچہ اس نے وہی کیا۔ جو روس نے کیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر
دیا کہ وہ اب تاوانِ جنگ ادا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے وہ قرضے بھی جو بعد میں انہوں نے تاوانِ جنگ
کو ہلکا کرنے کے لئے اٹھائے تھے۔ معرضِ خطر میں پڑ گئے۔ اب ۱۹۳۲ء میں لوزان کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ تاوانِ جنگ
ختم ہو جانا چاہیئے اور اتحادیوں کے آپس کے قرضے بھی باہمی سمجھوتے سے جلد از جلد طے ہونے چاہئیں۔ تاکہ دنیا کو آرام کا
سانس نصیب ہو ———

جرمنی کا دعویٰ تھا کہ وہ جنگ کے لئے تنہا ذمہ دار نہ تھا۔ پھر اس نے تاوانِ جنگ کی ادائی سے انکار کیا۔ وہ بھی منظور
ہو گیا۔ مگر ابھی تک وہ ذلت اور پستی کے غار سے نہیں نکلا۔ ہٹلر دیکھتا ہے کہ جرمنی کے بازوؤں میں ابھی قید و بند کی زنجیریں
پڑی ہیں۔ لہذا اپنی پرواز سے پہلے وہ ان بے جا بندشوں سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس کا فطری حق ہے کہ وہ آزاد رہے
اور دوسری قوموں کی طرح فرو تر ثابت نہ ہو اور پھر اس صورت میں کہ دنیا کا مقدس ترین خون اس کی رگوں میں رواں دواں
ہو ——— "میں جرمنی کو آزاد منظم اور خوشحال بنانا چاہتا ہوں۔ کسی صورت میں بھی ہماری قوم کی عزت دوسروں کے رحم و کرم
پر نثار نہیں کی جا سکتی"۔ ان الفاظ میں وہ ہمیشہ اپنی زندگی کے مطمحِ نظر کو قوم کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جرمن
نوجوان کا دل حب الوطنی سے لبریز ہے۔ وہاں کے بچے بچے کو اپنی "کمبخت پستی" اور "غلامی" کا احساس ہے۔ وہ خوب جانتا ہے
کہ وقت آ پہنچا ہے کہ غلامی، سر ریزی۔ خود سپردگی کے معاہدہ کی دھجیاں فضائے یورپ میں بکھیر دی جائیں۔ اسی لئے وہ قومیت
اور اتحاد کی تبلیغ کرتا ہے۔ اپنی روایات، اپنی تاریخ اور اپنی نسل کی برتری ظاہر کرتا ہے۔ پھر اسی غرور و تمرد سے سربلند نوجوان
کو موجودہ پستی کے طعنوں سے ابھارتا ہے۔ غیرت دلاتا ہے اور جوش میں لاتا ہے۔ نوجوان طبقہ کلیتہً اس کے ساتھ ہے۔ پھر بیکار
لوگوں کو جن میں اشتراکی خیالات پھیل رہے تھے۔ اپنی طرف بلاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے بہت سے ذرائع اختیار کئے ہیں
لوگوں کو کام دلانے کے لئے اُس نے عورتوں کی آزادی سلب کر لی۔ انہیں ملازمتوں سے برطرف کر دیا اور گھر میں رہنے کی
سخت تلقین کی۔ اس طرح بہت سے بیکار لوگ، برسرِ کار ہو گئے اور آزادیٔ نسواں سے جو بے راہ روی سوسائٹی میں پیدا ہو گئی
تھی۔ وہ بھی جاتی رہی۔ اب ایک نئے حکم کے ماتحت ہر کنوارا ۲۵ برس سے کم شخص سرکاری اور پبلک ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائیگا
اور ان معطل شدہ سرکاری اور پبلک لوگوں کے لئے مزدور سبھائیں (Labour Camps) وغیرہ کام مہیا کریں گی۔ اس طرح

سے جبکہ دوسرے ممالک ضبطِ تولید کے طریقوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ہٹلر جرمن نسل کی ترقی و توسیع کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے۔ بہت سی شادیاں حکومت کے خرچ سے ہوئیں اور زیادہ اولاد پیدا کرنے کے لئے گورنمنٹ سے وظائف ملتے ہیں ——

حال ہی میں ہٹلر گورنمنٹ کی طرف سے شادی کے متعلق کچھ ہدایات شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند ایک کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

۱۔ یاد رکھو کہ تم ایک جرمن ہو۔ (۲) تمہیں چاہیئے کہ اپنا جسم اور روح دونوں پاک وصاف رکھو (۳) صرف جرمن نسل ہی سے اپنا رفیقِ زندگی منتخب کرو صحت جسم کی خوبصورتی کی ضامن ہے۔ یاد رکھو۔ تم رفیق زندگی کا انتخاب کر رہے ہو کسی معمولی شریک بزم کا نہیں۔ شادی کے زریں معنی ایک عمدہ نسل میں پنہاں ہیں"۔ مندرجہ بالا چند فقروں سے واضح ہو جائے گا۔ کہ ہٹلر تمام قوم کو جوان، تندرست اور تنومند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے اس نے جنسی تعلقات کے ادنیٰ لٹریچر کو نذرِ آتش کر دیا ہے۔ عریاں تصاویر، حیا سوز اور اخلاق باختہ کھیل تماشے سب قانوناً ممنوع قرار دیئے گئے ہیں سکولوں میں صحت جسمانی کے لئے ورزش اور دوسرے مردانہ کھیل ضروری قرار دیئے گئے ہیں۔ الغرض وہ آیندہ نسل کو ہر نہج اکمل و احسن بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ان میں بچپن ہی سے 'نازی نصب العین' کی اشاعت کی جاتی ہے "جرمنی میں ہر بچہ نازی پیدا ہوتا ہے"۔ قومیت اور اعتمادِ نفس کے سبق اوائل عمر ہی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح سے جرمن قوم آیندہ کشمکش حیات میں ایک نمایاں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہٹلر صرف اپنی قوم کی کامل اعانت کا طلبگار ہے۔ وہ دوسروں کے رحم و کرم کا سائل نہیں بنتا —— وہ بارہا واشگاف الفاظ میں اپنی قوم کی برتری، فوقیت اور اولیت بتا چکا ہے۔ اپنی ہر تقریر کا پہلا فقرہ وہ اسی شدید احساس تفوق سے شروع کرتا ہے۔

"میری حکومت میں کسی قسم کی نکتہ چینی اور خردہ گیری قابلِ سرزنش ہے، مجھے معاندانہ تنقیدوں کی ضرورت نہیں۔ میں طعن و تعریض سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ بلکہ میں اپنی قوم سے —— قوم کی منفعت کے لئے —— دیانت دارانہ تعاون و اشتراک کا طالب ہوں —— میں صرف اس کی مدد چاہتا ہوں۔ باقی کام میرے ذمے ہے —— میں حلفیہ عہد کرتا ہوں۔ کہ کوئی کام بھی غیر ذمہ دارانہ اور بے پرواہی سے نہ کیا جائے گا۔ اگر میں اپنے دعوٰی میں کامیاب نہ ہو سکوں تو میری گردن قوم کے سامنے —— اس کے پرجوش انتقام کے لئے جھک جائے گی"۔

یہ تمام واقعات تو اس کی ملکی اور اندرونی پالیسی کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس کی خارجی پالیسی کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ہٹلر اور جرمن قوم معاہدۂ ورسائی کے بہت خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے کسی طرح منسوخ کرا دیا۔ پہلی شرط تاوانِ جنگ کے متعلق تھی۔ سو اسکے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ دوسری شرط سامانِ جنگ کی تعیئن کے متعلق تھی۔ جرمن لوگ ہمیشہ سے جنگ جُو اور حریت پسند قوم رہے ہیں۔ لیکن جنگ کے بعد اس بہادر قوم کے بند جکڑ دیئے گئے تھے اور اس کی شاہینی ہمیشہ کے لئے ختم کر دی گئی تھی۔ مگر وہ جب سے موقع کی تاک میں تھے اور مناسب وقت آنے پر انہوں نے اس "غلامانہ عہد" سے اعلانِ بغاوت کر دیا۔ زمانۂ حال میں قومی ترقی، فوجی طاقت کے بغیر محال بلکہ ناممکن ہے موجودہ دنیا کی بنیاد سرمایہ داری اور استعماریت ہے۔ ہر جگہ تجارتی پردوں کے نیچے یہ "خود افرازی" برسر پیکار ہے اور اس دنیا کا ہر تجارتی معاہدہ "جنگی عہد و پیمان" ہے آسٹریا اور اٹلی کا تجارتی سمجھوتہ جرمنی اور فرانس میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیتا ہے۔ روس اور ٹرکی کی مفاہمت اٹلی کے مدبرین کے لئے ایک تازہ مصیبت پیدا کر دیتی ہے۔ ترکیہ اور روس میں باہمی لین دین کی گفتگو ہوتی ہے اور جاپان کا وزیر جنگ منچوریا میں جنگی محاذ کے استحکام کا حکم دیتا ہے۔ انگلستان کا اپنی نوآبادیات سے "ترجیحی معاہدۂ تاوہ" استوار کرنا جاپان اور لنکاشائر میں ایک نئی مسابقت پیدا کر دیتا ہے بالغرض موجودہ دنیا کا تمام نظام استعماریت کی بنیادوں پر قائم ہے اور یہ مدعا بغیر افواج کے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہر آزاد قوم کے لئے فوجی طاقت کا استحکام و بندوبست ناگزیر ہے خصوصاً جرمنی کے لئے جو ہر چہار جانب سے فرانس۔ روس، پولینڈ۔ اٹلی، زیگوسلافیہ جیسے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور جو اپنی حفاظت و بقا روز اول ہی سے فوجی طاقت پر منحصر سمجھتا ہے۔ وہ بھلا ان بندھنوں میں کب تک جکڑا رہتا۔ چنانچہ اس نے ان "کاغذی پرزوں" سے کامل تغافل برتتے ہوئے اپنی طاقت بڑھانا شروع کر دی۔ جرمنی کا ہر ایک نوجوان فوجی سپاہی اور جنگ کے ساز و سامان سے آراستہ نظر آنے لگا۔ جرمنی کا یہ زور ہمسایہ قومیں کہاں دیکھ سکتی تھیں چنانچہ اس کے سب سے پرانے اور "غدار" دشمن فرانس نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور اس کو نئی جنگ کی تیاریوں سے تعبیر کیا۔ واقعات کچھ بھی ہوں لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ جرمنی نے عہدنامہ کی خلاف ورزی کی تھی اور وہ اس کے لئے انجمن اقوام کے سامنے جوابدہ تھا۔ لیکن جرمن قوم نے ان کی مخالف آوازوں کی ذرا بھی پروا نہ کی اور نہ کرنا چاہیئے تھی۔ معاہدہ ورسائی کی رو سے یہ قرار پایا تھا۔ کہ دنیا کے قیامِ امن کے لئے تمام ملکوں میں تخفیفِ اسلحہ کی جائے گی اور اس مبارک کام میں جرمنی سب سے پہلے اقدام کرے گا۔ مگر آہستہ آہستہ "انجمن اقوام" سب قوموں سے اس تخفیف کے لئے مطالبہ کریگی چنانچہ جرمنی نے یہی سوال اٹھایا۔ کہ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق نہایت ایثار سے کام لے کر اپنی فوج میں تخفیف کر دی تھی اور وہ اب تک منتظر تھے کہ دوسرے ممالک بھی اپنے وعدوں کے مطابق اپنی اپنی فوج کم کر دیں گے۔ مگر اب تک کسی نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ ہر سال نئے تخمینۂ مصارف میں بڑی بڑی رقمیں فوج کے زیادہ مضبوط کرنے میں خرچ کی جا رہی ہیں۔ اس لئے جرمنی اب زیادہ قربانی نہیں کر سکتا۔ اور وہ اپنی قومی ضروریات کے مطابق اپنی فوجی طاقت منظم کر رہا ہے ——

ظاہر ہے اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ مگر اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو بھی روکنا تھا۔ لہذا انجمن تخفیف اسلحہ وجود پذیر ہوئی معمول کے مطابق بحث مباحثے ہوتے رہے۔ مگر نتیجہ نشستند و گفتند و برخاستند ہی رہا۔ سب سے زیادہ جھگڑا فرانس اور جرمنی کا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں بغض ہے۔ ایک دوسرے کو کبھی پھولتا پھلتا نہیں دیکھ سکتے۔ ہٹلر نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ

"برطانیہ ہمیں ایک عظیم الشان طاقت کی حیثیت سے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ اور فرانس سرے سے ہمیں کوئی طاقت دیکھنے کا ہی روادار نہیں"۔ جہاں یہ حالت ہو۔ وہاں کسی مفاہمت کلی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ چنانچہ کئی دفعہ برطانیہ کی تمام مصالحانہ کوششیں ناکام رہیں۔ آخر کار جرمنی نے "انجمن اقوام" سے علیحدگی اختیار کر لی اور بعد میں بڑی استمالت کے بعد اس شرط پر مراجعت کا اقرار کیا۔ کہ اُسے دوسرے ملکوں کے برابر "حق آزادی" دیا جائے۔ لیکن یہاں پھر اسلحہ وغیرہ کا سوال پیش آتا ہے۔ اگر آزادی دی جاتی ہے تو اُسے فرانس۔ اٹلی۔ برطانیہ وغیرہ کی طرح "فوجی استحکام کی کامل اجازت دینی پڑتی ہے" جو کم از کم فرانس کے لئے سوہانِ روح ہے۔ اور بدیگر صورت وہ تو آزاد ہے اور آزاد رہے گا۔ جس کا جی چاہے نبرد آزمائی کرے۔ پھر بھی ؎

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

آپس میں ہلکی ہلکی نوک جھونک ہوتی رہی۔ جس کی تان آخر ناکامی ہی پر ٹوٹی۔

۱۰ اپریل کو فرانس کے وزیر خارجہ ایم۔ لوئی بارتھو نے اعلان کر دیا کہ فرانسیسی گورنمنٹ برطانیہ کے پیش کردہ میمورنڈم سے متفق نہیں اور ہم کسی صورت میں بھی جنگی استحکامات کے معاملہ میں اپنی آزادیٔ عمل کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتے تاہم اس قسم کی مصالحت ہو سکتی ہے اگر مجلس تخفیف اسلحہ کے تمام رکن فرانس کی حفاظت کے ضامن بنیں۔ پھر اس نے جرمنی کی نازی نیم فوجی پارٹی پر اعتراض کیا اور آخر میں جرمنی کے انجمن اقوام میں داخلہ پر زور دیا۔

اس پر جرمنی نے اعلان کر دیا۔ کہ وہ لیگ میں شامل ہونے کے لئے طیار ہے بشرطیکہ تخفیف اسلحہ کے متعلق کوئی سمجھوتہ ہو جائے اور یہ بات واضح کر دی کہ معاہدہ ورسائی میں بیان کردہ فوج کی تعداد جرمن قوم کی ضروریات کے لئے کافی نہیں۔ پھر اس پیمان کے حل کی دو صورتیں پیش کیں:۔

۱۔ پانچ سال کے لئے امن وامان کا ایک عہد نامہ مرتب کر لیا جائے۔ یا
۲۔ ایک محدود سا عہد نامہ تخفیف اسلحہ کچھ مدت کے لئے مرتب کیا جائے۔

رہا نازی نیم فوجی جماعت کا سوال۔ سو اس کی بابت جرمن گورنمنٹ راضی ہو گئی کہ وہ ان کو کسی قسم کی فوجی تربیت نہ دیگی۔ اور اس کی بابت ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے کا اقرار بھی کر لیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی۔ کہ فرانس کی وہ فوج جو نو آبادیات

میں موجود ہے اور جو وقتِ ضرورت نہایت آسانی سے بلائی جا سکتی ہیں۔ خود فرانس کی فوج میں شمار ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس نے اعلان کر دیا کہ جرمن گورنمنٹ اپنی ہوائی طاقت کے قیام و استحکام کے لئے دو سال کا مزید انتظار (جو برٹش گورنمنٹ کے میمورنڈم نے تجویز کیا تھا) نہیں کر سکتی۔ وہ نئے معاہدہ کے آغاز ہی سے اپنی قوتِ پرواز کو چھوٹی مشینوں والے دفاعی جہازوں سے دیجا زجنگی جہازوں سے نہیں مضبوط کرے گی اور اس نے وعدہ کیا کہ اس کی ہوائی قوت اس کے ہمسایہ ملکوں کی مجموعی قوت کے ۵۰ فیصدی یا فرانس کے ۵۰ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھے گی۔ جرمن گورنمنٹ صرف پانچ سال تک اس معاہدہ پر رضامند ہے۔ اس کے بعد یہ ضروری ہوگا کہ تخفیف یا زیادتی کی جائے تاکہ وہ دس سال کے اندر اندر دنیا کی عظیم ہوائی قوتوں سے لگا کھا سکے آج تک جتنی کانفرنسیں تخفیفِ اسلحہ کے متعلق ہوئیں۔ اُن سب کا خلاصہ سطور فوق میں درج کیا گیا ہے اور عملی دنیا میں اس کا یہ اثر ہے کہ فرانس نے جرمن سرحد پر نہایت مضبوط آہنی قلعے تعمیر کرنے شروع کر دیئے ہیں اور جرمنی نے نئے تخمینہ میں فوجی مصارف کی مد میں ۲۵۲,۰۰۰,۰۰۰ مارکس زیادہ کر دیئے ہیں۔ ان حالات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ معاہدۂ ورسیلز کی دوسری "ذلت آمیز" شرط پر کہاں تک عمل کیا جا رہا ہے۔

اب تیسری شرط رہ گئی ہے۔ وہ نوآبادیات پر دوبارہ تصرف و قبضہ کا سوال ہے کیا واقعی ہٹلر ۶۰,۰۰۰ مربع میل علاقہ واپس لینے کے لئے بے چین ہے۔ کیا وہ اپنی پہلی سی وسیع سلطنت کا خواہشمند ہے؟ اس کا جواب نہایت صاف ہے اور وہ غیر مبہم الفاظ میں بارہا کہہ چکا ہے کہ اُسے نوآبادیات کی ضرورت ہے وہ دوسرے علاقہ کو فتح کرنا نہیں چاہتا۔ یہ بالکل پرنس بسمارک کی سی پالیسی ہے لیکن اسی سوال کے صحیح جواب پر موجودہ اور آیندہ حالاتِ دنیا کا انحصار ہے۔ اگر کوئی جنگ آیندہ ہونے والی ہے تو اس کی خفتہ چنگاریاں اسی خاکستر میں دبی ملیں گی۔

اگر یورپ کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو جرمنی کی نازک حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک طرف نظر ڈالیئے۔ فرانس۔ بلجیم۔ پولینڈ۔ روس وغیرہ نظر پڑیں گے جو سب کے سب متحدہ طور پر اس کے جانی دشمن ہیں۔ فرانس سے آج تک نہ نبھ سکی۔ بلجیم کی جنگِ عظیم والی خانہ ویرانی اور تباہ حالی اس کو جذباتِ مصالحت پر کبھی نہیں اُبھارتی۔ پولینڈ سے ایک معاہدہ ہو چکا ہے۔ مگر وہ برائے بیعت ہے فرانس ہرگز جرمنی اور پولینڈ کا اتحاد نہیں دیکھ سکتا۔ جنگِ عظیم کے بعد پولینڈ کو ایک خود مختار اور آزاد علاقہ بنانے والا ہی فرانس تھا اور آج بھی وہ پولینڈ کو ایک خود مختارانہ حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔ روس کے اشتراکی پراپیگنڈا کو جرمنی میں جتنا نقصان ہٹلر کی قومی اشتراکیت نے پہنچایا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اشتراکیوں کی بے رحمانہ تعزیر روس کے برادرانہ جذبات کو ٹھیس لگاتی ہے۔ لہذا روس اور جرمنی کے خوشگوار تعلقات، ہٹلر کے اقتدار کے ساتھ بگڑ گئے۔ اس کشیدگی کے باعث جرمنی اور جاپان میں رشتۂ مواخات استوار ہو گیا۔ کیونکہ جاپان کے مستعمرانہ اقدامات کے راستہ میں روس ہمیشہ حائل رہا۔ اور اسی نا اتفاقی کا نتیجہ

ہے کہ روس انجمن اقوام میں داخل ہونے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں (جرمنی اور جاپان) دنیا کے امن میں خلل اندازی کرنے والے اس سے الگ ہو چکے ہیں۔ الغرض جرمنی اس طرف سے بالکل گھرا ہوا ہے۔ دوسری جانب آسٹریا اٹلی۔ بلگیریا اور دیگر ریاستیں ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے تعلقات جتنے فرانس سے وابستہ ہیں۔ اتنے کسی دوسرے ملک سے نہیں۔ اب اٹلی نے بھی اس طرف پاؤں جمانے شروع کئے ہیں۔ مگر جرمنی کے لئے وہاں کچھ نہیں۔ تجارتی اغراض ان ریاستوں کو جرمنی سے بمراحل دور رکھتی ہیں۔ واقعات کا یہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی کی بین الاقوامی پوزیشن نہایت نازک ہے۔ ایسی صورت میں اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس کا جواب ہٹلر کی پالیسی ہے۔ وہ آغاز ہی سے جرمن قوم کے اتحاد کے مشن کا پرچار کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جرمن نسل کے لوگ آپس میں متحد ہو جائیں اور اس کے لئے اس نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے۔ اس کی زندگی کے صرف دو مقصد ہیں:-

۱۔ معاہدہ درسائی کا خاتمہ

۲۔ جرمن قوم کا اتحاد۔ اس کی ترقی اور خوشحالی۔

معاہدۂ ورسائی کی وہ دھجیاں اڑا چکا ہے اور برابر کا حقِ آزادی منوا چکا ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کا یہ فطری حق اور جائز مطالبہ رد کرے۔ مگر دوسرے مقصد کے حصول کے لئے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہے۔ اور یہی مصیبتیں ہیں۔ جو دنیا اور جرمنی کے تعلقاتِ موجودہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

جرمن قوم سے آباد دو ملک بہت مشہور اور ضروری ہیں اور یہی دو گتھیاں ہیں۔ جو یورپ کی قسمت کا فیصلہ چند ہی مہینوں میں کر کے رہیں گی۔

۱۔ آسٹریا اور (۲) مسئلہ سار (SARR PROBLEM)

پیشتر اس کے کہ ہم آسٹریا اور سار کے جرمنی کے ساتھ باہمی روابط اور ان کے اتحاد وغیرہ کی ممکنات پر بحث کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کی پوزیشن ایک دفعہ پھر واضح کر دی جائے۔ ہٹلر دیکھتا ہے۔ کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنی مخالفتوں کو کامیابی کے ساتھ دبا سکے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی حلیف ہو۔ تاکہ تمام دشمن یورپ میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا نہ سکے۔ اس کے لئے جب وہ چاروں طرف دیکھتا ہے تو سب طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔ فرانس۔ روس، پولینڈ وغیرہ سے وہ کبھی بھی برسرِ رفاقت نہیں ہو سکتا۔ وہ سب اس کے جانی دشمن ہیں۔ اب بڑی بڑی طاقتوں میں سے صرف دو رہ جاتی ہیں۔

اٹلی اور انگلستان

تقریباً دو سال پہلے ہٹلر کو ان ملکوں سے بہت کچھ امید تھی۔ مگر اب بوجوہ، وہ سب نقش برآب ثابت ہوئیں۔

اٹلی اور جرمنی میں اتحاد دو امیدوں پر مبنی تھا:۔

۱۔ یہ کہ دونوں ملکوں کا طریق حکومت مشترک ہے۔ دونوں ایک ہی نصب العین کے حامی ہیں۔ دونوں قومی ترقی۔ قومی خوشحالی۔ قومی وسعت کے لئے کوشاں ہیں۔

۲۔ اس لئے کہ فرانس دونوں کا دشمن تھا۔ جرمنی اور فرانس کی دشمنی تو کسی ثبوت و دلیل کی محتاج ہی نہیں۔ اٹلی اور فرانس میں بدمزگی یوں پیدا ہوئی کہ بلقان کی ریاستوں کے تجارتی اغراض دونوں کی امیدوں کا سہارا ہیں۔ اگر اٹلی آسٹریا اور ہنگری کو (معاہدہ مرینہ ۱۷ر مارچ ۱۹۳۴ء) کو ٹریسٹی اور فیوم کی بندرگاہیں عنایت کرتا ہے اور ان سے لکڑی اور غلہ وغیرہ خریدتا ہے تو فرانس تمام بلقانی ریاستوں کو تجارتی سہولتیں دینے پر رضامند ہے۔ دوسرے اٹلی کو نو آبادیات کی سخت ضرورت ہے اور ان کے لئے سب سے زیادہ زرخیز زمین افریقہ کی ہے۔ مگر وہاں فرانس کی چلتی ہے۔ وہ اٹلی کی دال نہیں گلنے دیتا۔ چنانچہ ان مناقشات کے پیش نظر ہٹلر کو مسولینی سے امید معاونت تھی۔ اس دوستی کے لئے اس نے بہت کوشش کی۔ بلکہ ترول (TYROL) کے جرمنوں سے برادرانہ رشتہ داری کا خیال تک بھی چھوڑ دیا۔ مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کیونکہ مسولینی خوب جانتا ہے کہ اگر آسٹریا اور جرمنی مل گئے تو وہ یورپ کی سب سے بڑی اور خطرناک حکومت بن جائیگی اور خود اس کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ اس خوف کے زیر اثر وہ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا سخت مخالف ہے۔ اب اس مخالفت میں فرانس اس کے ساتھ مل جاتا ہے اور چونکہ فرانس میثاق آسٹریا اور جرمنی سے بہ نسبت اٹلی کے زیادہ خائف ہے۔ اس لئے وہ اٹلی اور جرمنی کو توڑنے کے لئے قربانی بھی کرتا ہے یعنی اٹلی کو بلقانی ریاستوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کرنے کی آزادی دے دیتا ہے۔ اٹلی اپنا دوہرا فائدہ دیکھ کر ہٹلر کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح سے فرانس اور اٹلی مل جاتے ہیں۔ ہٹلر پھر اکیلا رہ گیا۔ اب دوسری طرف دیکھتا ہے۔ انگلستان سے کئی ایک امیدیں ہیں۔

۱۔ دونوں ایک ہی آرین نسل سے ہیں (۲) دونوں کا مذہب پروٹسٹنٹ ہے (۳) برطانیہ کے مال کے لئے بہترین منڈی جرمنی ہے (۴) ہٹلر سمجھتا تھا کہ توازن قائم رکھنے میں برطانیہ ضرور جرمنی کی مدد کرے گا۔ جنگ سے پہلے جرمنی یورپ کی سب سے بڑی طاقت تھی اور برطانیہ نے اس کا زور توڑا۔ مگر اب جنگ کے بعد فرانس زور پکڑ رہا تھا اور اب یورپ میں سب سے بڑی وہی حکومت ہے لہذا اب اس کی باری آگئی ——— مگر ———، جرمنی کے جنگی منصوبے اور اس کی فوجی تنظیم نے برطانیہ کو بدظن کر دیا۔ گو ہٹلر سے پہلے برطانیہ میں جرمنی کے لئے ہمدردی موجود تھی، اور انہوں نے جرمنی کی مالی حالت کو درست کرنے کے لئے قرضے بھی اٹھا دیئے تھے۔ مگر یہودیوں کے استیصال بالجبر نے یہ غمخواری ہمیشہ کے لئے رنج و غصہ میں تبدیل کر دی۔ برطانیہ کا بہت سا سرمایہ یہودیوں کی بدولت کارآمد ہے۔ اس کا کاروبار ان کی عنایت سے چلتا تھا۔ مگر جرمنی نے اس کے حلیفوں کا کچھ بھی

خیال نہ کیا اور ان کے ساتھ جابرانہ سلوک کیا۔ انہوں نے جرمنی سے اخراج کے بعد برطانیہ سے رجوع کیا۔ جو مدد سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ فلسطین کا دروازہ کھول دیا گیا۔ وہاں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہوا۔ اس طرح سے جرمنی کے سخت رویہ نے برطانیہ کو ناراض کر دیا ——

علاوہ ازیں اگر فرانس زبردست طاقت ہے تو ہوا کرے۔ انگریزوں کو اس سے کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ برطانیہ کی تجارت فرانس کی رقابت اور مسابقت سے محفوظ ہے۔ فرانس اپنی نوآبادیات سے تجارت کر سکتا ہے اس لئے اُسے غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ برطانیہ کے مفاد پر کبھی دست درازی نہیں کرتا۔ بلکہ برخلاف اس کے جرمنی اور برطانیہ میں ایک سرگرم مقابلہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۰ء ہی کو لیجئے۔ جرمنی کی برآمد۔ برطانیہ کی برآمد سے زیادہ تھی۔ ان حالات میں برطانیہ بھی جرمنی کی مدد سے کنارہ کش ہے اور جرمنی اب دنیا بھر میں اکیلا ہے (سوائے جاپان کے لیکن وہ بہت دور ہے) یہ حالات ہیں اور ہٹلر جرمن قوم کو متحد کرنا چاہتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آسٹریا اور سار کے اتحاد جرمنی میں کیا مشکلات ہیں اور جرمنوں کے آپس میں ملنے کے لئے اٹلی۔ برطانیہ یا کسی اور حلیف کی ضرورت کیوں پیش آئے —— کیوں نہ سب جرمن آپس میں مل جائیں ——

آسٹریا —— جنگ عظیم میں آسٹریا، جرمنی کے دوش بدوش جنگ میں شریک ہوا تھا اور دونوں میں اتحاد و یکجہتی پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب جرمنی کو شکست ہوئی اور وہ اپنی ٹوٹی اور بکھری قوت کی بحالی کے لئے کوشاں تھا۔ تو آسٹریا بھی، جنگ کے اثرات بد سے حتی الامکان بچنے ہی کے لئے تدبیریں کر رہا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد اٹلی میں سولینی نے زور پکڑا اور وہاں فسطائیت نے قدم جمائے، روس میں بالشویک انقلاب رونما ہوا۔ جاپان میں دو پارٹیاں۔ فوجی اور سیاسی پیدا ہوئیں۔ جرمنی میں قومی اشتراکیت کے آثار نظر آنے لگے۔ ٹرکی میں نوجوان ترک اور مصطفےٰ کمال کا اقتدار بڑھا۔ لہذا آسٹریا بھی ان انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہاں تین تحریکیں زوروں پر تھیں۔ (۱) قوم پرست (۲) اشتراکی (۳) فسطائی۔ قوم پرستوں کا رہنما ڈاکٹر ڈولفس تھا۔ جو بعد میں آسٹریا کا چانسلر بنا۔ اشتراکیوں کے لیڈر ڈاکٹر جولیس اور راؤ تھے۔ جو اپریل والے اشتراکی بلوے میں بُری طرح مجروح ہوئے تھے اور جن کے بعد آسٹریا میں اشتراکی زور بالکل ٹوٹ گیا۔ فسطائیت کا حامی میجر فے تھا ——

ہٹلر کی حکومت سے پہلے آسٹریا میں عام رجحان جرمنی سے رشتۂ مواخات قائم کرنے کا تھا۔ مگر اس کے اقتدار کے ساتھ ہی یہ برادرانہ جذبات ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے۔ وہ اس طرح ہوا کہ ہٹلر نے جب اشتراکیوں کو سزائیں دینا شروع کیں اور ان کی نقل و حرکت "لاقانونیت" سے تعبیر کی گئی تو آسٹریا کے کمیونسٹ بھی ہٹلر کے خلاف ہوگئے اور انہوں نے آسٹریا، جرمنی کے اتحاد کی مخالفت شروع کر دی۔ دوسرے ہٹلر تمام ملک میں پروٹسٹنٹ قسم کا مذہب رائج کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے بہت سے کیتھولک مذہب رکھنے والوں پر غیر مناسب دو ناروا زور بھی ڈالا۔ جس سے آسٹریا

کے کیتھولک بھی ناراض ہو گئے۔ فسطائیت والوں کے اغراض شروع ہی سے جرمن اتحاد کو بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اٹلی نے آسٹریا کو چند ایک تجارتی مراعات دے رکھی ہیں اور وہ اس سے لکڑی وغیرہ بھی خرید تا ہے۔ اٹلی نے اُس کے لئے ٹریسٹی کی بندرگاہ بھی کھول دی۔ کیونکہ اس میں اس کا فائدہ ہے۔ اٹلی کے سامانِ حرب اور دیگر ہر قسم کی تجارتِ برآمد کی کھپت آسٹریا میں خوب ہوتی ہے دوسرے وہ اپنے قریبی ملک کو اپنی ہی طرح "فسطائیت" کے زیر اثر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہؤا۔ اپریل کے بعد سے ہیجر نے وغیرہ کا اقتدار یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ آسٹریا اب "نیم فسطائی" ہے اور اٹلی اس کی آزادی۔ خود مختاری اور خوشحالی کا سرپرست ہے۔ آخری پارٹی ڈاکٹر ڈولفس کی تھی۔ یہ قوم پرست ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ لوگ کسی بیرونی قوت کے ماتحت رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کے لئے دوسروں کا نقصان بطیب خاطر قبول کر لیتے ہیں لہٰذا انہیں ہرگز ہٹلر کی ضرورت نہیں۔ وہ خود مختار رہنا چاہتے ہیں اور جرمنی سے برادرانہ تعلقات کے سخت مخالف ہیں۔ اب ہٹلر کیا کرے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ آسٹریا کو اپنے ساتھ ملا کر رہے گا۔ لیکن آسٹریا خود اس اتحاد کے خلاف ہے۔ اگر کچھ ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف بزورِ شمشیر مگر یہ ممکن نہیں کیونکہ اٹلی۔ فرانس اور برطانیہ کی متحدہ سرپرستی۔ جرمنی کے جنگی مقاصد میں حائل ہے۔ اگر ایک دفعہ وہ آسٹریا کی طرف ایسا اقدام کرے تو اس کی حدوں پر ان تینوں ملکوں کی فوجیں جمع ہو کر اعلانِ جنگ کر دیں۔ لہٰذا یہ طریقہ بھی خطرات سے محفوظ نہیں۔ لیکن آسٹریا میں ایک نازی پارٹی بھی ہے۔ جو ہٹلر اور جرمنی کے لئے ہر قسم کی قربانی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک منظم سازش کے ذریعہ ڈولفس کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہا۔ ۲۰ جولائی کو باغیوں نے "چانسلری" پر دھاوا بول دیا اور ڈاکٹر ڈولفس کو ایک شخص اوٹو نیلیا نے قتل کر دیا۔ تمام دنیا میں ایک تشویش انگیز ہیجان برپا ہو گیا اور ہر روز جنگِ یورپ کے اعلان کا خوف رہنے لگا۔ مگر ایسا نہ ہؤا۔ کیونکہ نازی بغاوت فوراً ہی دبا دی گئی۔ دوسرے ہٹلر نے صاف صاف الفاظ میں اس سے بےتعلقی ظاہر کر دی۔ بلکہ ثبوت کے طور پر اپنے سفیر متعینہ وائنا کو واپس بلا کر وہاں کپتان فان پیپن کا تقرر کر دیا۔ اٹلی کے اخبارات میں جرمنی پر شدید الزامات لگائے گئے اور آسٹریا کی مدد کے لئے اٹلی نے کچھ فوجیں بھی آسٹروی سرحد پر بھیج دیں۔ لیکن ہٹلر نے ان تمام واقعات سے کامل غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور وہ بالکل خاموش رہا۔ اس کے بعد سے ہٹلر اندرونی معاملات میں گھرا ہؤا ہے اور آسٹریا کی فضا اب ہر طرح سے ساکن و خاموش ہے، ہٹلر اس کے ساتھ اتحاد کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کر رہا ہے یا کرے گا۔ صرف واقعات آئندہ ہی روشنی ڈالیں گے اس سے پہلے قیاس آرائیاں کرنا۔ نہایت مشکل ہے:

مسئلہ سار جنگِ عظیم کے بعد جب جرمن نوآبادیات کی تقسیم ہوئی تو الساس اور لورین فرانس کو واپس کر دیئے گئے اور گو علاقہ سار کی کوئلے کی کانیں جرمن حکومت کے زیر اثر تھیں لیکن ان کا "عملی اور طبعی" تعلق لورین کی لوہے کی کانوں کے ساتھ تھا۔ اس لئے سار کی معدنی پیداوار پر فرانس کا حق مان لیا گیا اور اس طرح سے اس نقصان کی جو جرمنوں کے لورین کو تباہ کرنے سے

فرانس کو اٹھانا پڑا تھا۔تلافی کی گئی۔سار فرانس اور جرمنی کی سرحدوں کے اتصال پر واقع ہے۔یہاں کی تمام آبادی مزدوروں اور صنعتی کاریگروں پر مشتمل ہے۔یہ علاقہ اپنی معدنی اور صنعتی ترقیوں کے باعث بہت اہم ہے اور جرمنی کی خوشحالی بڑی حد تک اس سے وابستہ تھی جنگ کے بعد فرانس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے لئے بھی وہ اسی قدر اہم ہے جس قدر جرمنی کی تجارتی اغراض کے لئے۔اسی لئے معاہدۂ ورسائی کے وقت فرانس نے حتی الامکان کوشش کی۔کہ یہ کانیں ہمیشہ کے لئے اسے دے دی جائیں اور اتحادی بھی تقریباً رضامند ہو چکے تھے۔مگر پریذیڈنٹ ولسن نے سخت مخالفت کی اور کسی طرح بھی "الحاقِ دوام" کے لئے راضی نہ ہوا۔اس پر فرانس ناراض ہو گیا اور اس نے اس کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ سننے سے انکار کر دیا اور ضد کی کہ ایلساس لورین کے صوبوں کے ساتھ ہی اُسے بخش دیا جائے۔مگر ولسن کی شہ پر انگلستان بھی بگڑ گیا اور لائڈ جارج نے معاہدۂ ورسائی کی کل دفعات پر نظر ثانی کی دھمکی دی جس پر فرانس پریذیڈنٹ کی مجوزہ سکیم پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔قرار پایا کہ سار کی حکومت پندرہ سال کے لئے ایک کمیشن کے سپرد کی جائے گی۔جو پانچ اراکین پر مشتمل ہوگا۔اور جن کا انتخاب ہر سال انجمن اقوام کیا کرے گی۔ان میں سے ایک رکن جرمنی کا ہوگا۔دوسرا فرانس کا تیسرا سار کا اور باقی دو جرمنی اور فرانس کے سوا کسی دوسرے ملک سے منتخب کئے جائیں گے۔کمیشن سار برگ میں اپنے ہیڈ کوارٹر رکھتا ہے اور آج کل ایک انگریز مسٹر نوکس (Knox) اس کے صدر اعلیٰ ہیں۔اس طریقہ حکومت کی میعاد پندرہ سال تھی اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔کہ اختتامِ مدت پر ایک استصواب عام کے ذریعہ سے تین سوال پوچھے جائیں گے:۔

۱۔ آیا سار کے باشندے اپنے وطن جرمنی کے ساتھ اتحاد چاہتے ہیں۔

۲۔ یا وہ فرانس کے ساتھ اشتراکِ عمل کے خواہاں ہیں۔

۳۔ یا وہ کمیشن کے طرزِ حکومت کو پسند کرتے ہیں۔

جس سوال کے جواب میں کثرت رائے ہوگی۔وہی طریق کار اختیار کیا جائیگا اور اسی کے مطابق سار کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

اب یہ پندرہ سال کی مدت جنوری ۱۹۳۵ء میں ختم ہو جائے گی اور ۱۵ جنوری کو سار کے باشندوں سے مندرجہ بالا سوالات کئے جائیں گے۔ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ علاقہ جرمنی اور فرانس دونوں کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اگر یہ علاقہ جرمنی کے ساتھ متحد ہو گیا تو فرانس کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔کیونکہ جرمن حکومت فوراً یہاں کی کانوں کا کوئلہ فرانس بھیجنا بند کر دے گی اور فرانس کی لوہے کی کانیں بے کار ہو جائیں گی۔اس کی اسلحہ سازی و دیگر آلاتِ آہن کی تمام تجارت ماند پڑ جائیگی دوسری طرف اگر یہ علاقہ فرانس کو مل جائے (جس کا بہت کم امکان ہے) تو جرمنی کی تجارتی حالت بہت خراب ہو جائے گی۔اس کی بگڑی ہوئی حالت فقط تجارتی حالات کی استواری ہی سے ٹھیک ہو سکتی ہے اگر یہ نہ ہو سکا تو وہ تمام دنیا میں بے اعتمادی

پیدا کر دے گا۔ ہر جگہ اس کی تباہی کا اثر پڑے گا۔ ابھی تھوڑے ہی عرصہ کا ذکر ہے کہ مارک کی قیمت گر جانے سے تمام ملکوں میں بھی تجارتی "بے اعتمادی" پیدا ہو گئی تھی اور ہمارے ملک کے چند ماہرانِ اقتصادیات اور تاجر لوگوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو تار بھی دیا تھا کہ جرمنی سے ایک نیا تجارتی معاہدہ کیا جائے۔ الغرض اگر سار کا علاقہ جرمنی کو نہ ملا۔ تو یورپ بلکہ دنیا کو ایک انقلاب انگیز جنگ کا انتظار کرنا چاہیئے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ سار اور جرمنی کے اتحاد میں کیا رکاوٹیں ہیں:۔

سار میں آج کل دو پارٹیاں زوروں پر ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہاں صرف دو ہی پارٹیاں ہیں:۔ (۱) اشتراکی (۲) کیتھولک (یہ ظاہر ہے کہ یہاں کی آبادی جرمن قوم اور جرمن نسل سے تعلق رکھتی ہے)

جرمنی میں اشتراکیوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس پر پہلے ہی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اشتراکی جماعتی جنگ کے حامی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر جگہ دو متخالف جماعتیں ہیں (۱) سرمایہ دار (۲) مزدور۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ مزدوروں کا خون چوس چوس کر اپنی امارت کے "نت نئے جلوس" نکالا کرے۔ وہ ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی۔ اپنی چالاکی۔ مکاری اور بے دیانتی سے اپنی ملکیت بناتا رہتا ہے اور مزدور بے چارہ سرمایہ داری کی پیدا کردہ۔ غلامانہ ذہنیت کے باعث ہر طرح کے مصائب کا شکار ہوتا ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے مفاد کا یہ تضادِ مطلق ان کو ہمیشہ مبتلائے پیکار رکھتا ہے اور اس کا خاتمہ اس وقت تک نہ ہو گا۔ جب تک ان میں سے ایک کلیۃً ختم نہ ہو جائے اور چونکہ اشتراکی نقطۂ نظر کے مطابق نظام سرمایہ داری انحطاط پذیر ہے اس میں چند تباہ کن عناصر موجود ہیں اور اس کی بنیادیں کمزور ہیں لہٰذا وہ از خود ختم ہو جائے گا۔ صرف اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ چاہیئے اور اس بہانہ کو وہ ایک منظم و مسلح بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے۔ لیکن قومی اشتراکیت اس تعلیم کے خلاف ہے وہ چاہتی ہے کہ ملک میں کسی قسم کا انتشار نہ پایا جائے۔ تمام ملک میں صرف ایک پارٹی ہو۔ جماعتی جنگ کے بجائے ایک "مصالحانہ جنگ" ہو۔ قوم کی ترقی۔ قوم کی خوشحالی اور قوم کی وسعت کے لئے۔ قوم کے دشمنوں۔ قوم کے بدخواہوں اور قوم کے نکتہ چینوں کے خلاف۔ وہ صنعتی دنیا کو "مزدور سبھاؤں" کے ذریعے چلانا چاہتی ہے جو مزدوروں میں تنظیم پیدا کریں اور ان کی تعلیم و تہذیب کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اور دوسری جانب سرمایہ داروں کی جماعت ہو۔ جو "ڈائرکٹرز" کی ایک جماعت کے ماتحت اپنا نظام قائم کریں اور انصاف، اشتراکِ عمل، دیانتداری اور سب سے زیادہ تمام قوم کی فلاح و رفاہ کو مدنظر رکھیں۔ پھر اگر ان میں کچھ اختلافات پیدا ہوں تو وہ حکومت کی مقرر کردہ لیبر کمیشن کے فیصلہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔ یہ ہٹلر کا نظام حکومت ہے اس پر بھی اگر کوئی پارٹی بندی کی کوشش کرے تو وہ اس کے غضب کا نشانہ بنتا ہے۔ اشتراکی، ہٹلر کی پالیسی کے خلاف ہیں اس لئے وہ انہیں ہولناک سزائیں دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ اشتراکی دنیا کے غصہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ روس بھی جرمنی سے اِن

پالیسی کی بنا پر ناخوش ہے اور سار کے اشتراکی بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لہذا خطرہ ہے کہ وہ اتحاد جرمنی کے خلاف رائے دیں گے۔

اسی طرح ہٹلر چاہتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں بھی یکسانیت پیدا ہو جائے اور وہ اسی لئے کوششیں کر رہا ہے۔ کہ ایک پروٹسٹنٹ قسم کا چرچ قائم کرے اور تمام جرمن لوگوں کو اُس کے مقرر کردہ طریقوں پر عبادت کرنے کی تلقین کرے۔ لیکن کیتھولک اس کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے اعتقادات سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہوتے پچھلے دنوں بویریا میں کیتھولک لوگوں کو جو سزائیں دی گئیں تھیں وہ اسی "ہٹ دھرمی" کا نتیجہ تھیں۔ اب بھی کچھ دنوں سے کیتھولک رہنماؤں سے نئے گرجا کے متعلق (جس کا صدر مولر (Mueller) ہے۔ مشورہ کیا جا رہا ہے لیکن وہ اس کو بالکل قانون کے خلاف بتاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ گرفتار بھی کئے گئے ہیں آئندہ کیا ہوگا؟ صرف واقعات ہی صحیح روشنی ڈال سکیں گے۔ ہاں اتنا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہٹلر اشتراکیوں اور کیتھولک کی مدد چاہتا ہے اور وہ تالیفِ قلوب کے لئے، ہر قسم کے طریقے اختیار کرے گا جس کا دھندلا سا عکس اس کے ایک فرمانِ جدید میں نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ اس نے بہت سے سیاسی قیدی جن میں اکثریت اشتراکیوں کی تھی۔ رہا کر دیئے ہیں اور کیتھولک کے ساتھ بھی وہ نہایت رفق و ملاطفت سے پیش آتا ہے۔ بعد میں خواہ کچھ ہو مگر ۱۳ جنوری تک ہٹلر اپنے ان دشمنوں سے نہایت محبت سے پیش آئے گا۔ بہرحال اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ سار کے باشندے جرمن قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے وطن سے زبردستی الگ کئے گئے تھے۔ آخر وہ کون ہے۔ جو اپنے محبوب وطن کو واپس جانا پسند نہ کرے؟ ———'

ہٹلر کے خلاف نہایت مسموم پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ایک معمولی شخص ہے۔ جس نے شکست خوردہ جرمنوں کے جذبات معاہدہ ورسائی کے خلاف برانگیختہ کر رکھے ہیں اور وہ فوجی قوت کے بھروسے پر حکومت کر رہا ہے لیکن اگر واقعات کا بہ نظرِ غور تجزیہ کریں تو واضح ہو جائے گا۔ کہ ہٹلر ایک فوجی سپاہی اور باتدبیر جرنیل ہی کے علاوہ ایک دانشمند سیاستدان اور عمیق النظر رہنمائے قوم بھی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں گزشتہ واقعات کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ملک میں ایک منظم بغاوت اور مسلح سازش کا انکشاف اور ہٹلر کا بروقت اس کا استیصال کرنا، آسٹریا میں نازیوں کی بغاوت اور جرمن گورنمنٹ کا مصالحانہ رویہ اس کے تدبر کی بہترین مثالیں ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ خود اس کے مقرر کردہ افسروں نے جو نہایت مقتدر اور با اثر رہنماؤں میں شامل تھے۔ اس کے سیاسی اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی ایک خوفناک سازش کی اور ہٹلر نے نہایت حیرت انگیز پھرتی سے اس کا بالکل قلع قمع کر دیا۔ یہاں تک کہ تمام جرمن قوم سے ایک بھی آواز اس کے خلاف نہ اٹھی۔ خود مقتول افسروں کے حامیوں نے سرِ انقیاد خم کیا۔ اور کیا آسٹریا کے خونیں واقعات نے تمام یورپ کو اس کے خلاف نہیں کر دیا تھا! اطالوی اور فرانسیسی اخباروں نے اس پر اشتعال انگیز حملے کئے۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔ نہایت پُر امن۔ بے حس اور غیر مشتعل

اس کے بعد جرمنی ابھی ان انقلاب انگیز واقعات میں گھرا ہوا تھا۔ کہ پریذیڈنٹ فان ہنڈنبرگ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ملک کی نازک حالت دیکھتے ہوئے اس نے فوراً پریذیڈنٹ کے ذمہ دارانہ فرائض کو اپنے سر لیا اور ۱۹ اگست کے استصواب عام میں اپنی قوم کی عام اجازت حاصل کرکے ثابت کر دیا۔ کہ اس کی قوم اس کو پہچانتی ہے اور وہ ہمیشہ اُس کی متابعت کرے گی۔ مسولینی نے روم میں داخل ہوتے وقت ایک تقریر میں کہا تھا: "میں جانتا ہوں۔ ملک کو کسی دوا کی ضرورت ہے اور میں اس کو استعمال کر رہا ہوں"۔ لیکن ہٹلر نے کہا کہ میں اس "مردِ بیمار" کا علاج کر سکتا ہوں۔ میرے پاس اس کے مرض کی دوا ہے۔ کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ اس کا استعمال کروں"۔ اور قوم نے اُسے اجازت دی۔ اُسے اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اس کے احکام بجا لائی۔ اور وہ آج ان کی راہ نمائی کر رہا ہے۔ قوم کی تنظیم۔ قوم کی خوشحالی اور قوم کی وسعت کی طرف ——،

گناہ سے خطاب

اے نیکیوں کے جنم داتا! لوگ ہمیشہ تجھے اختیار کرکے پچھتائے۔ نادان سمجھ نہ سکے کہ تجھ میں ان کے لئے کیا سبق پوشیدہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو نیکی کو نیکی کون سمجھتا۔ کون اس کی قدر کرتا۔ میری روح بے چین تھی کسی چیز کی تلاش میں۔ اے گناہ وہ چیز میں نے تجھ میں پائی۔ اگر میں تیرے دربار میں باریاب نہ ہوتا۔ تو اس سیدھے راستے کو جو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن پر خدا کی رحمتیں نازل ہوئیں کیونکر پاتا۔

اے راہ خدا پر چلنے کی ہدایت کرنے والے تو نے راندۂ بارگاہ ہو کر بھی کس قدر عروج حاصل کیا۔ ہر وہ شخص جو تیرے آغوش میں آیا تو نے اُسے دکھ کے نشتروں سے اتنے کچوکے دیئے کہ آخر وہ اپنے خواب عیش سے بیدار ہو کر زندگی کی پاک صاف شاہراہ پر چل نکلا۔ تجھ میں لذت تھی۔ تلخ۔ آہ وہ تلخی جس پر لاکھ شیرینیاں قربان! اگر تلخی نہ ہوتی تو نیکی کی شیرینی کو میں کیونکر پاتا۔ یہ تیری ہی تلخی ہے جو اس مٹھاس کو مٹھاس بنائے ہوئے ہے۔

لوگ کہتے ہیں تو شیطان کا فریب ہے۔۔۔ مگر میں کہتا ہوں تو خدائے رحمٰن و رحیم کا خاص عطیہ ہے اگر شیطان فریب ہوتا تو تیری یاد خطاکار روح کو بےکل نہ کرتی اور نظام عصبی کو پراگندہ کرکے ہمیں عیش و عشرت کے خواب شیریں سے نہ چونکاتی۔ اگر شیطان کا فریب ہوتا تو ہماری روح کو بےقرار بنا کر نیکی کی راہ ڈھونڈنے کے لئے نہ اکساتا۔ تو خدا کا عطیہ ہے تو اس کی یاد دلاتا اور اس کی راہ دکھاتا ہے تو صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن پر خدا نے اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔ اس لئے اے نیکیوں کے جنم داتا! تیرا وجود لائق ستائش ہے ؎

سروپ رانی نگار

تجلّیات

مری نگاہیں بت آشنا ہیں ذرا انہیں پاکباز کردے
نقابِ رخ سے الٹ کے برہم طلسمِ رنگِ مجاز کردے

مری فغاں ہائے نیم شب پر نثار کون و مکاں کے نغمے
الٰہی! میرے نفس نفس کو تو نالۂ جاں گداز کردے

ابھی تو اے قصہ گو! شبِ زندگی کی تاریکیاں ہیں باقی!
عجیب ہے داستانِ اُلفت اسے خدارا دراز کردے

مری نگاہوں میں نور بھر دے مری رگوں میں سرور بھر دے
مجھے غمِ عشق دے کے دونوں جہان سے بے نیاز کردے

گرائے نہیں شکایت اگر اٹھائے کرم ہے اُس کا
مجھے تو ہر حال میں ہے تسلیم جو مرا کارساز کردے

نہیں ہے موقوف اس کی رحمت مری ہی سجدہ ریزیوں پر
خدا کی یہ دین ہے جسے سربلند وہ بے نیاز کردے

مری نوائے سازِ دل کو عطا ہو سوز و گداز ایسا
کہ ذرے ذرے کو ایک دنیائے درد و سوز و گداز کردے

میں تو ہی تو ہوں تو میں ہی میں ہے اگر تو پھر امتیاز کیسا
عجیب یہ راز ہے الٰہی مجھے بھی آگاہِ راز کردے

اثر ہے بے برگ و ساز لیکن بلند تر ہے مقام اس کا
ہے مردِ حق آشنا خدا اور بھی اُسے سرفراز کردے

اثر صہبائی

نئی دکان

انسان بیمار ہو تو قسم قسم کے غیر ضروری سوالوں پر ضرورت سے زیادہ غور کر لیتا ہے مثلاً اسی سوال پر کہ زندگی کیا ہے؟ تندرست آدمی کو غور کی فرصت کہاں؟ وہ تو عملی طور پر زندہ جواب یہ دیتا ہے کہ اگر انسان ایڈیٹر ہو تو زندگی یہ ہے کہ ہر روز کسی بھائی ایڈیٹر کو یا کم از کم گورنمنٹ کو دو چار گرما گرم سنا دیں کسی خود سر لیڈر کی مرمت کر دیں، اپنی روحانی روحانی غذا کے دوسرے گاہک اور جو اس رائے سے متفق نہ ہوں۔ انہیں زندہ در گور کر دیں۔

اگر انسان تاجر ہو تو زندگی یہ ہے کہ سستا خریدیں مہنگا بیچیں اور بچت سے کوڑوں پر کوڑے اور محلوں پر محل بنواتے چلے جائیں اور لوگوں سے بھی سنیں، خود بھی کہیں کہ محنت کا پھل ہے' اللہ کا فضل ہے۔

اگر انسان معلم ہو تو زندگی یہ ہے کہ کوڑ مغز کا ماتھا اور ماسٹر صاحب کا بید آئے دن اور ہر سال یہاں تک کہ کتابیں دھڑا دھڑ بکیں، امتحانوں کے پرچے دیکھنے کی فیس آئے، ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم تعریف کریں اور صوبے بھر میں نام ہو۔

گویا تندرستی کو اس سوال سے کہ زندگی کیا ہے کوئی خاص حکیمانہ دلچسپی نہیں یا یوں کہئے کہ حکمت و فلسفہ، بیماروں کا مشغلہ ہے۔ مگر حال ہیں علم النفسیات کے ایک ماہر کی کتاب نظر سے گذری ہے جو اس زریں اصول کو ٹھکراتی نظر آتی ہے۔ یہ ماہر سچے معنوں میں شفاء الملک ہیں۔ بیمار جسموں کا علاج خیالات کی مرہم پٹی سے کرتے ہیں اور بے انتہا کامیاب ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پوشیدہ اور فراموش شدہ حسیات کے دھوبی ہیں۔ پہلے چھپے انسانی احساسات کو سرنگ لگا کر باہر نکال لاتے ہیں پھر ان کو جمع شدہ کثافت و غلاظت سے الگ کرتے ہیں اور جب یہ نکھرے ہوئے احساسات اپنا عکس خود دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو مریض سے کہتے ہیں کہ چلو چھٹی اور واقعی مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ ان کے اس طرز عمل پر تو اعتراض نہیں مگر جب ان ماہر صاحب کے علاج کے فلسفے پر غور کرتا ہوں (آج کل طبیعت کچھ نادرست ہے) تو حیران ہوتا ہوں کہ دنیا کہاں سے کہاں جا نکلی اور ہم محض اردو خواں ابھی تک اپنی پرانی ادھیڑبن میں ہیں مشتے نمونہ از خروارے کے اصول پر ان ماہر صاحب کا صرف ایک نظریہ پیش کرتا ہوں۔ اگلے وقتوں کے لوگ (یعنے ہم محض اردو خواں) تو یہ سوچا کرتے تھے کہ کیا جھوٹ بولنا کبھی جائز ہو سکتا ہے مگر ان ماہر صاحب کا خیال اس کے لگ بھگ ہے کہ بعض خاص حالات میں سچ بولنا چنداں قابل اعتراض نہیں بہ استی سو جب بہ رضائے خداست کا پتنگ اس نفاست سے انہوں نے کاٹا ہے کہ واہ واہ واہ کرتے چچا سعدی کے

دروغ مصلحت آمیز کا گلا بیٹھ گیا ہے۔

حضرت ماہر صاحب فرماتے ہیں کہ بقا بعد از مرگ ردروحِ انسانی کے غیر فانی ہونے کا مسئلہ، کو یوں تو کوئی باور کریگا مگر آج کل یورپ میں جو سینکڑوں پیرانِ نود سالہ وصد سالہ موجود ہیں وہ موت کے انتظار میں کیا سوچیں؟ کیا ان کے لئے یہ بہترین خوش رکھنے والا طریقہ نہیں کہ وہ یہ باور کرلیں کہ صرف جسم ہی مریگا۔ روح کو ہمیشہ بقا رہے گی اور اگر یہ بہتر طریقہ ہے تو پھر کیوں اس پر اصرار نہ کیا جائے۔ یہ اعتقاد نہایت لابدی ہے۔ دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب کا ارشاد گویا یہ ہے کہ مذاہب کا پہلا آخری اور تمام تر مقصد یہ ہے کہ وہ دلخوش کن فریبوں کا خوبصورت مجموعہ ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر حضرت یہی پر اکتفا کرتے تو خیر گزرتی۔ مگر آپ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شباب کے مذہب سے ایام پختہ کاری کا مذہب قطعی الگ ہونا چاہیئے اور علی ہذا القیاس یعنے عمر کے مختلف مدارج کے لئے مذاہب کا فرض ہے کہ مختلف پیرایوں میں فریب کاری کی خدمت سرانجام دیں۔ ان حضرت کی کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے شبہ ہونے لگا کہ کیا یورپ میں مذاہب کی کوئی نئی دکان تو کھلنے والی نہیں کہ ہر موسم، ہر قد، ہر رنگ، ہر قابلیت اور ہر عمر کے لئے مذہب کا تن زیب وہاں مہیا کردیگی۔ اگر یہ دکان چل نکلی تو پھر فیشن کی ستم کاریاں غضب ڈھائیں گی۔

کاش ہندوستان کوئی ایسا سودیشی سورما (جہاتما کی دکان بند ہونے والی ہے) پیدا کردے جو یورپ کی اس نئی دکان کے کھلنے سے پہلے ہی ہندوستان میں یہ کاروبار چلا کر دکھلا دے۔ ہر قسم کے مذہبی تفرقے مٹ جائیں۔ مختلف مذاہب والے لڑتے اسی لئے ہیں کہ ہر شخص بجائے خود سچے دل یقین رکھتا ہے کہ میرا راستہ ہی راستی کا واحد ٹھیکیدار تھا اور جو مجھ سے متفق نہیں ان کا راستہ غلط ہے مگر یہ ماہر صاحب تو فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے اس کے حسب حال دروغ راستی نما کی ضرورت ہے گویا اب انا الحق کی بجائے یہ نئی معرفت نکلنے والی ہے کہ

انا الکذب

اور ہر شخص دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم سب جانتے ہیں۔ اخوت انسانی کا یہ نیا سبق یورپ ہی کو مبارک ہو ہم پنجابی اردو خوانوں کے لئے تو اپنے پرانے پیر اچھے ہیں کہ کھاتے ہیں مگر کم از کم کبھی کبھار یہ بھی تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو یاد کرو اور بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچاؤ۔ یہ کیا یورپ کا تمسخر ہے کہ خود فریبی کا لطف اٹھاؤ؟ حضرت اکبر تو فرما گئے کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں گرمیں تو درگاہ الٰہی میں دن رات یہ دعا کرتا ہوں کہ یوروپین دماغ میں یورپین بم پھٹیں کہاں ہم غریب صدقِ دل سے پارسائی پر مرنے والے اور کہاں یہ خراباتی کہ جامۂ پارسائی کو بازاری مگر ضروری پہناوا بیان کرتے ہیں۔

اگلے وقتوں کے لوگ علم کی اور عالم کی سچے دل سے عزت کرتے تھے مگر یورپ والے علم کو اور عالم کو جسمانی خوشی کا غلام تصور کرتے ہیں اور وہاں کے عالم خود اس نئی طرز کے موید ہیں۔ لعنت بر کارِ شیطان!

مکرر
مگر کہیں یہ نہ ہو کہ یورپ والے ہی سچے ہوں؟ واللہ اعلم بالصواب۔

"سہ کرر"
کچھ بھی ہو مگر یہ خیال دل سے نہیں نکلتا کہ کاش یہ نئی دکان سب سے پہلے ہندوستان ہی میں جاری ہو غیرت ہندی اور حب الوطنی کا زبردست تقاضا ہے کہ بجائے اس کے کہ اواگون موت کے بعد ہو یہ صورت ہو جائے کہ اس زندگی کے اندر ہی اندر جو آج بنگالی اور برہمو ہے وہ کل سکھ اور پنجابی ہو اور جو کل پارسی اور بمبئی کا سیٹھ تھا۔ وہ آج سرحد کا پٹھان ہو اور یہ تغیر و تبدل اس سرعت سے ہو کہ میاں بیوی کو اور بچے ماں باپ کو نہ پہچان سکیں۔ انگریز زبانیں سیکھتے سیکھتے عاجز آجائیں اور گھبرا کر یہاں سے چل نکلیں۔ کیا ہی لطف رہے کہ جو ایک دن پنڈت ہو وہ دوسرے دن چمار اور تیسرے دن والئی ریاست کے روپ میں نظر آئے۔ پھر تو کسی کو شبہ کی گنجائش نہ رہے کہ ہندوستانی اصل میں سب ایک ہیں۔

فلک پیما

صبح کی چڑیا

صبح کی چڑیا گاتی ہے۔
صبح کے آنے سے پہلے ہی پہلے جب کہ ابھی رات کا افق آسمان کو اپنی ٹھنڈی کالی کنڈلی میں لپیٹے ہوتا ہے
اس چڑیا کو صبح کا پیغام کون آکے دیتا ہے؟
صبح کی چڑیا! مجھے بتا کہ کیسے آسمانوں اور پتوں کی دوہری رات کے اندر سے وہ تیرے خواب میں در آیا مشرق کا وہ پیغام بر؟
دنیا نے تیری بات نہ مانی جب تو چلائی کہ "سورج چلا آتا ہے رات ہو چکی ہے"۔
اے سونے والے جاگ!
اپنی پیشانی کو جو روشنی کی پہلی کرنوں کی منتظر ہے۔ برہنہ کر دے اور صبح کی چڑیا کا ہمنوا ہو کر ایک سرود ایمان کے ساتھ گیت گا!

گلچیں

غزل

ناکامیوں سے تلخ مزہ زندگی کا تھا
ادنیٰ سا اک اثر یہ تری برہمی کا تھا

لکھے تھے ہم نے خطِ شکستہ میں کچھ حروف
خط کیا تھا اک پیام شکستہ دلی کا تھا

وہ بھی ترے تغافلِ بے جا پہ مر مٹا
ابتک جو دل شریک مری زندگی کا تھا

بے لطفیٔ حیات کی تصویر تھی خزاں،
ہر غنچہ آئنہ مری افسردگی کا تھا

اے پیکرِ غرور تجھے کچھ خبر بھی ہے
وقتِ خرام زیرِ قدم دل کسی کا تھا

غارتگرِ شکیب ہوئی وہ نگاہ بھی
دار و مدار جس پہ مری زندگی کا تھا

رکھی تھی شمعِ گور سرہانے بجھی ہوئی
دھندلا سا ایک رخ وہ مری بیکسی کا تھا

جس نے ہمارے لوٹ لئے سب حواس و ہوش
وہ اک مظاہرہ تری غارت گری کا تھا

تھیں شوخیاں بھی حسن کی ہمرنگِ اضطراب
احساس جب کسی کو مری بیدلی کا تھا

واقف نہیں تفاوتِ موت و حیات سے
مقصود ہی کچھ اور مری زندگی کا تھا

سوجھا نہ کچھ فریبِ محبت میں عندلیب
دل جس کو جانتے تھے وہ ناوک کسی کا تھا

عندلیب

ملتِ اشتراک کا مایۂ ناز مفکّر

انیسویں صدی کا نصفِ آخر صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ دہقانی اشتراکیت کا خیال روسی اذہان سے بتدریج محو ہو رہا تھا۔ کسانوں کی جگہ کارخانوں کے مزدوروں نے حاصل کر لی۔ روسی افسانہ نگاری کی توجہ کسان سے منعطف ہو کر مزدوروں کی زبوں حالی و واژگوں بختی میں مرکوز ہو گئی۔ کارل مارکس کے افکار نے اس کی قدیم "حزبی اشتراکیت" کا خاتمہ کر دیا۔

اس زمانہ کے گلستانِ ادب میں گورکی نے بادِ نسیم کا کام کیا۔ شباب مستقل مزاجی اور فکرِ جدید کے ساتھ گورکی اس کے ایوانِ ادب میں داخل ہوا ـــــ شاید کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے لئے

الیکسز پیشکوف گورکی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کی پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد ہی انتقال کر گیا۔ ابھی وہ چھوٹی عمر کا ہی تھا کہ اس کے دادا نے اُسے ایک کفش دوز کے یہاں نوکر کرا دیا۔ مگر وہ وہاں سے بھاگ کر ایک جہاز میں ملازم ہو گیا۔ جہاز پر بھی وہ بہت عرصہ تک نہ رہا ـــــ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مستقبلِ قریب کا ادیب اتنے عرصے تک دنیا کی نظروں سے روپوش رہے۔

گورکی کے ذہنی تلاطم نے اُسے مجبور کر دیا کہ وہ رُوس کی سرحدوں پر آوارہ پھرتا رہے خانہ بدوشی کی اس سیاحت کو اس نے ۱۸۹۰ء میں قلمبند کیا۔ یہی اس کی پہلی تصنیف تھی اور چند تصانیف کے بعد گورکی کی شہرت اکنافِ عالم میں پھیل گئی۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب میں حصہ لینے کی وجہ سے اُسے اپنی مادرِ وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ روس کو چھوڑ کر وہ اٹلی میں اقامت پذیر ہوا۔ جہاں اُس نے چند کتب تصنیف کیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد گورکی دوبارہ روس میں داخل ہوا۔ روس کی یہ عظیم الشان ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ اپنی غیر فانی تصانیف "ماتا" "خوفزدہ" اور "دوسرے شعلے" سے اکنافِ عالم میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

جس طرح اٹھارھویں صدی کے وسط میں وکٹر ہیوگو کے افکار نے نوجوان قلوب میں ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ ٹھیک اسی

طرح اس انشا پرداز کے خیالات تمام دنیا کے نوجوانوں کو حیاتِ نو کا سبق دے رہے ہیں۔

گورکی بالعموم طلبی دائرہ کے اُن فراموش کردہ افراد کی المناک داستانوں کو قلمبند کرتا ہے۔ جو زندگی کے حقیقی معنوں سے ہی ناآشنا ہوں اور جن کے قلوب زمانے کے کٹھور پن سے بے حس ہو چکے ہوں۔

گورکی درحقیقت ایک ادبی جراح ہے۔ اس کے افکار ہر دماغ میں چیرتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اُس کی بیان کی ہوئی داستانوں کی صحیح تصویریں وہاں منقش ہو جاتی ہیں۔

غریب کسانوں اور مزدوروں کے لاانتہا مصائب و نوائب بیان کرنے میں جو ملکہ اس مفکر کو حاصل ہے شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُسے خود زمانے کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا تھا۔ یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ایک روز گورکی نے اپنی بڑھتی ہوئی تکالیف سے تنگ آ کر خودکشی کا اقدام کیا۔ گو بعدازاں پستول کی آہنی گولی اُس کے سینے سے نکال دی گئی اور وہ موت کے سرد پنجوں سے بال بال بچ گیا مگر اس کاری زخم کا اثر اب تک موجود ہے — اُس کی چھاتی سے خون آنا ابھی تک بند نہیں ہوا۔

ان افسانوں میں جن میں گورکی نے مظلوم انسانوں کی دردبھری داستانیں پرازجوش طریقہ میں قلمبند کی ہیں 'ماں' 'جاسوس' اور 'چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ' شامل ہیں۔

اِن افسانوں کی طرزِ تحریر لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی ہوئی دماغ پر نقش ہو جاتی ہے — یہی گورکی کا کمال ہے جو اسے زمانۂ حال کے ادیبوں کی فہرست میں ایک بلند رتبہ دلواتا ہے۔ گورکی کے افسانوں میں اس کے کردار ہمیشہ اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس زمانہ میں جب وہ ایک جہاں گرد کی حیثیت سے تھا اُسے اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

گورکی کی شوکتِ تحریر، ندرتِ بیان اور زورِ قلم کا اندازہ "ماں" کے پہلے باب کے منظرِ افتتاحیہ سے ہو سکتا ہے جس میں وہ زشت و گرسنہ اور تھکے ہوئے مزدوروں کی کارخانے میں آمد کو ایسے پُراثر الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ان کی بیکسی کی ایک صاف تصویر کھنچ جاتی ہے۔

"ہر روز کارخانہ کی سیٹی مزدوروں کی غلیظ اور دھوئیں سے پُر فضا میں کانپتی ہوئی آواز میں چلاتی جس پر بھاپ کے غلام اپنے چھوٹے اور بدنما گھروں سے نکلنا شروع ہو جاتے۔ غمگین چہروں کے ساتھ وہ خوفزدہ وحشیوں کی طرح تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلتے۔ ان کے اعضا ناکافی نیند کی وجہ سے اکڑے ہوئے ہوتے۔ صبح کی دھندلی روشنی میں وہ تنگ گلیوں اور کچی سڑکوں سے گزرتے ہوئے اس سنگین پنجرہ کی طرف بڑھتے جو اُن کے استقبال کا منتظر ہوتا — جس کی بیسیوں زرد

بھدّی اور چوکور آنکھیں کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک کو روشن کر رہی ہوتیں۔ کیچڑ کے چھینٹے اُن کے پیروں پر اس طرح گر رہے ہوتے گویا ان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ فضا بھدّی خواب زدہ آوازوں اور گالیوں سے معمور ہوتی، ان کے استقبال کے لئے مشینوں کی بھاری گڑگڑاہٹ اور بھاپ کی غیر مطمئن چیخ پکار ہوا میں تیر رہی ہوتی۔

یہ مزدوروں کی کارخانے کی طرف روانہ ہونے کی تصویر ہے ان کی واپسی کا حال گورکی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"شام کے وقت جب سورج غروب ہو رہا ہوتا اور سرخ کرنیں گھروں کی کھڑکیوں پر چمک رہی ہوتیں۔ کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کی مانند باہر پھینک دیتا۔ اب وہ پھرانی بازوؤں سے اپنے دھوئیں میں لپٹے ہوئے چہرے اور گرسنہ دانتوں کی چمک کی نمائش کرتے اور مشین کے تیل کی غلیظ بو کو پھیلاتے ہوئے گزرتے مگر اب ان کی آوازوں میں خوشی کی جھلک پائی جاتی ——— مشقت کی سزا اس دن کے لئے ختم ہو چکی تھی۔ آرام کی چند گھڑیاں اور روکھا سوکھا کھانا گھر پر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ دن کارخانہ نگل گیا اور مشین نے اُن انسانوں کے اعضا سے حسب ضرورت طاقت چوس لی۔ اس طرح ایک مکمل دن زندگی سے جذب کر لیا گیا جس کا کوئی نشان باقی نہ رہا ———"

"کارخانہ اپنے مزدوروں کو جلی ہوئی راکھ کی مانند باہر پھینک دیتا" لکھتے وقت گورکی کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ وہ چند الفاظ میں ہی اُن مزدوروں کی قابلِ رحم حالت بیان کر جائے جو دن بھر کی مشقت کی وجہ سے چور چور ہو رہے تھے۔

گورکی کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مرصّع اور پر اثر الفاظ کی جستجو میں رہتا جو لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے ہوئے دماغ پر منقش ہو جائیں۔

کسی بوٹ پر کیچڑ یا برف کے نشان، پیانو کے چھیڑے ہوئے پردے، دہقانوں کی بھدی گفتگو، سنتری کی آنکھوں میں حیوانی جھلک اور اسی قسم کے حقیر حادثات گورکی کے قلم سے اس پر اثر انداز میں بیان کئے جاتے ہیں کہ ہمیں اُن گہرائیوں تک لے جاتے ہیں جہاں رومانی افسانوں کی پہنچ نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیں حقیقی زندگی سے روشناس کراتا ہے خواہ ہمیں اُس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو۔ جو اُس کے افسانوں سے تعلق ہوتی ہے۔

اُس کی تصانیف نے ہماری آنکھوں کے سامنے روسی زندگی کی ایک قلمی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے جس سے عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

"ماتا" کا تبصرہ بجائے خود ایک طویل مضمون کا محتاج ہے اگر وقت نے اجازت دی تو فرصتِ آئندہ میں اس کے

متعلق کچھ اور بیان کرنے کی سعی کروں گا۔

"چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" (ہمایوں کے افسانہ نمبر میں یہ افسانہ شائع ہو چکا ہے) میں جو بلاشک وشبہ گورکی کے مختصر افسانوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ گورکی مظلوم انسانوں کی نفسیات قلمبند کرنے کی خاطر بسکٹ بنانے والے مزدوروں کی پرازالم زندگی بیان کرتا ہے جو صبح سے لے کر شام تک ایک تنگ و تار کوٹھڑی میں کام کرتے ہیں جس بھٹی کے سامنے یہ چھبیس مزدور دن بھر کام کرتے اُسے گورکی نے ان پُراثر الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

"صبح سے لے کر شام تک بھٹی جہنم کی طرح دہکتی رہتی اور اس کی سرخ شعاعوں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا گویا ہم بدنصیبوں کو دیکھ کر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا۔

وہ بھٹی کسی دیو کے بدوضع سر کے مشابہ تھی جو اپنے بڑے حلق سے آگ اُگل رہا ہو یا ہمارے سامنے جہنم کی آگ کی طرح جھلسا دینے والے گرم سانس لے رہا ہو اور ہمارے غیر مختتم کام کا اپنی پیشانی کے دو سیاہ و تاریک سوراخوں سے مطالعہ کر رہا ہو — یہ دو عمیق سوراخ آنکھوں کے مشابہ تھے — آنکھیں جو کسی دیو کی آنکھوں کی طرح ہمدردی اور رحم کے جذبہ سے عاری ہوں"۔

اس افسانے میں چھبیس زشت رو غلیظ مزدوروں کی ایک حکایت بیان کی گئی ہے جو ایک حسین دوشیزہ تینا کی محبت میں گرفتار تھے۔ وہ محبت کیسی تھی اور کیوں پیدا ہوئی؟ — اس کے جواب کے لئے گورکی کے اپنے الفاظ موجود ہیں:-

"ہر حسین چیز انسان کے دل میں اپنی وقعت اور عزت پیدا کر دیتی ہے۔ خواہ وہ انسان غیر تربیت یافتہ ہی کیوں نہ ہو"۔

اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی :-

"گوزندان ایسی مشقت نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا مگر پھر بھی ہم انسان تھے — اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی بغیر کسی کی پرستش کئے زندہ نہیں رہ سکتے تھے"۔

اسی افسانے میں کسی دوسری جگہ گورکی مزدوروں کی زبان سے یہ کہلواتا ہے :-

"ہم چاہتے تھے کہ کسی شے سے محبت کریں اور اب چونکہ ہمیں وہ چیز جسے ہم ڈھونڈتے تھے مل گئی تھی اس لئے اس سے الفت کرتے"۔

گورکی کی فن کاری کے نمونہ کے لئے اسی کہانی کی چند اور سطور پیش کرتا ہوں :-

"ہم تعداد میں چھبیس تھے — چھبیس متحرک مشینیں ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید جہاں ہم صبح سے لے کر شام تک کلوں کو

کے لئے میدہ تیار کرتے :
"چھبیس متحرک مشینیں" لکھتے وقت گورکی کے پیش نظر یہ چیز تھی کہ وہ اُن چھبیس مزدوروں کی نفسیات کو جو صبح سے لے کر شام تک آہنی مشینوں کی طرح کام کرتے صرف تین الفاظ ہی میں بیان کر جائے۔ "چھبیس متحرک مشینیں" پڑھتے وقت ان مزدوروں کی لاانتہا محنت و مشقت اور بے بسی کی ایک تصویر کھچ جاتی ہے۔

گورکی زندہ ہے اور گو ان دنوں وہ اکثر بیمار رہتا ہے مگر پھر بھی اس نے اپنا قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ گورکی کی تقریباً تمام تصانیف انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں ان میں سے چند گجراتی اور مرہٹی کا لباس بھی پہن چکی ہیں۔ مگر مقام تاسف ہے کہ اردو زبان میں ابھی تک اس مایۂ ناز ادیب کی کوئی تصنیف منتقل نہیں ہوئی۔ لاہور کے ایک جریدہ میں "مدر" کا ترجمہ قسطوں میں شائع ہو رہا ہے۔ جو ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ اس میں گورکی کے اندازِ بیان کی لطافت اور خوبی یکسر مفقود ہے۔

سعادت حسن

غزل

اک حال پر اب اپنا دلِ زار نہیں ہے
جو حال ہے وہ قابلِ اظہار نہیں ہے

درکار ہے اک شغل تقاضائے جنوں کو
اور میرے گریباں میں کوئی تار نہیں ہے

اے دل نہ ہو مایوس کبھی راہِ وفا میں
یاں کوششِ ناکام بھی بیکار نہیں ہے

دل میں ہے ترے حسنِ تصور کی تجلی
اب میری شبِ تار شبِ تار نہیں ہے

کس درجہ جنوں خیز ہے ہنگامۂ ہستی
افکار ہیں اور حاصلِ افکار نہیں ہے

اے کاظمی کیا چیز یہ دردِ محبت،
کیا کہیئے کوئی محرمِ اسرار نہیں ہے

عبدالحی صدیقی کاظمی

عالمِ جمال

آغاز

ساقی سے ہے ابتدائے میکش — عشرت ہے انتہائے میکش

خودی میں فنا ہے موج مے کی — ہستی ہی نہیں ہے اور شے کی

صہبائے جمال چھا رہی ہے — خوشبوئے وصال آ رہی ہے

بے پردہ جمال میکدہ ہے — جلووں کے جلو میں آ رہا ہے

ساقی کے سوا نہیں ہے کوئی — باقی کے سوا نہیں ہے کوئی

آنکھوں سے عیاں ہے مے پرستی — اپنا ہے جمال اپنی ہستی

آئینہ ہے سامنے نظر کے — خورشید ہے روبرو قمر کے

ہے اپنی نظر میں آپ ساقی — یا اپنی سحر میں آپ ساقی

پنہاں ہے بہار، رنگ و بو میں — مفہوم نہاں ہے گفتگو میں

یہ کچھ بھی نہیں، شہود ہی ہے — کچھ اور نہیں، نمود ہی ہے

جلوے ہیں نقاب کو اٹھائے — نظارے حجاب کو اٹھائے

تخلیقِ بہار ہو رہی ہے — مخلوق نثار ہو رہی ہے

جس سمت نظر اٹھا کے دیکھا — منظر وہ تمام میکدہ تھا

اٹھنے لگیں حسن کی گھٹائیں — چلنے لگیں خلد کی ہوائیں

ہونے لگی بارشِ تجلی — عالم ہے، نگارشِ تجلی

اک کیف ہے، مستیٔ دو عالم — شیرازۂ ہستی دو عالم

میخانہ بدوش ہر نظر ہے — ساقی کے جمال کا اثر ہے

ہر جلوہ کدہ ہے ایک پرتو — ہے رنگ برنگ ایک ہی ضو

گلزار و بہار و ابر و مہتاب — مستی و سرور و بادۂ ناب

میخانہ ہی اک، ہزار راہیں — راہیں ہیں، جدھر پڑیں نگاہیں

تاروں میں چمک ہے، روشنی ہے — ذروں میں جھلک ہے، روشنی ہے

ہر سمت ہے نور کا مرقع — کھینچے کوئی طور کا مرقع

ایک ایک نظر، ہزار جلوے — میخانہ، طرب، بہار، جلوے

تحمید

اے محفلِ صد جمال ساقی! — تمثیل تری محال ساقی

پانچ آئینے یہ حواسِ خمسہ — منہ دیکھ رہے ہیں اپنا اپنا

ہر مرحلہ حواس گم ہے — منزل میں، رہِ قیاس گم ہے

ہے آئنہ بے حسی کی صورت — خود بھول گیا ہے اپنی صورت

اللہ اللہ ذات تیری — کرتے ہیں طلب صفات تیری

جلووں کا ترے پتا نہیں ہے — حسن آزاد آشنا نہیں ہے

دیکھے نہ تجھے جمال تیرا — ہے جلوہ فگن! کمال تیرا

معلوم ہوا، نہیں رسائی — خود اپنی نظر، نظر نہ آئی

تلاش

بے پردہ تجھے اگر نہ پائیں — پھر سے نگاہیں ڈھونڈ لائیں

رستے کا پتا ہے کہکشاں کیا — وادیٔ طلب ہے آسماں کیا

کہتی ہیں یہ جنتیں شفق کی — فردوس ہیں منزلیں افق کی

کرتے ہیں رہبری ستارے — سالک اگر ہمتیں نہ ہارے

تاروں میں بڑھا چلا ہی جائے — منزل نہ ملا، چلا ہی جائے

تاحشر رہیں یہی نظارے   دیتی رہیں حشر میں سہارے
ڈھونڈے تجھے جنتوں میں جا کر   رحمت کی فضاؤں میں سما کر

مفہوم کائنات

اے کاش کوئی بتا دے مجھ کو   اے کاش کوئی بتائے مجھ کو
مکتوبِ جہاں میں کیا لکھا ہے   اس نامۂ جاں میں کیا لکھا ہے
بیٹھا ہوں لئے کتابِ فطرت   روشن ہیں مظاہرِ حقیقت
موتی، پانی حباب، شبنم   اشکالِ نمودِ بحرِ عالم
مینائے بہار لالہ و گل   صہبائے نگارِ ساغرِ دل
اس بزمِ جہاں کا ذرہ ذرہ   اس کون و مکاں کا ذرہ ذرہ
ایک ایک ورق ہے معرفت کا   ایک ایک سبق ہے معرفت کا
عرفاں کیلئے کھلا ہو سینہ   عالم ہے بہر نظر سفینہ

عالمِ شوق

پیغام و سلام ہو رہے ہیں   عشاق کے کام ہو رہے ہیں
ہر سمت چمک رہی ہے بجلی   نظروں میں ہے عالمِ تجلی
بندہ کہ حضور میں فنا ہے   باقی ہی نہیں ہے کھو گیا ہے
سجدہ ہے یہی کہ یا الٰہی!   نظروں میں ہے تیری ہی خدائی
جانے مری کیوں رواں ہیں آنسو   امیدوں کا کارواں ہیں آنسو
تاروں سے ہیں شب کے اس کی باتیں   ہوتی ہیں یہ کب سے اس کی باتیں
پیغامِ وصال، ہر سحر ہے   اک جامِ جمال، ہر سحر ہے
اللہ! کرم غریب دل پر   انسان کے اس عجیب دل پر
دیوانہ کہیں بھٹک نہ جائے   مستانہ کہیں بہک نہ جائے
دنیا کو نہ یہ سمجھ لے منزل   بہکے نہ کہیں سمجھ کے منزل

ہماری غفلت

مدہوش! تجھے خبر نہیں ہے   غافل! ہے ادھر نظر نہیں ہے

صورت یہ ہوئی ہے مسخ تیری   فطرت یہ ہوئی ہے مسخ تیری
کرتی ہے جو غیر کی پرستش   کعبے اور دیر کی پرستش
اخلاق میں، گندگی غرض کی   عادات ہیں، بندگی غرض کی
انسان میں کہاں غرض پرستی   جوہر میں کہاں غرض پرستی
للہ انسان! آدمی بن   ظلمت کو چھوڑ، روشنی بن

فضیلتِ انسانیت

مسجودِ ملک ہے جو ذات تیری   انسان! بڑی ہے بات تیری
عالم ہے ترے لئے مسخر   ماہ و خورشید و نجم و اختر
کہتے ہیں جسے نظامِ عالم   واللہ یہ انتظامِ عالم
سب تیرے لئے ہیں ابنِ آدم!   کس درجہ کرم ہیں اے مکرّم!
تو اس کے لئے ہے، سب ہے جس کا   عالم میں تو منتخب ہے جس کا
تو عبدِ خدا، خدائی تیری   عالم میں ہے بادشاہی تیری

انسانِ کامل

تو اپنے کمال پر نظر کر   بے مثل، مثال پر نظر کر
روشن ہے جس سے بزمِ دوراں   وہ جلوۂ بے نقابِ عرفاں
تصویرِ کمالِ آدمیت   بے مثل، مثالِ آدمیت
وہ شمعِ حریمِ راز و اسرار   وہ پیکرِ صد ضیا و انوار
تابندۂ محفلِ نبوت   زیبندۂ منزلِ نبوت
رحمت ہے خدا کی نام جس کا   کوثر ہے فیضِ عام جس کا
رحمت سے بھری ہوئی نگاہیں   جنت کی دکھا رہی ہیں راہیں
جاں بخشِ جہاں اشارہ جس کا   سوز ندگی! اک نظارہ جس کا
قرآن لئے ہوئے، تکلم   عرفان لئے ہوئے، تبسم
کیا بات لئے ہوئے خموشی   وہ ذات لئے ہوئے خموشی
ہمارا ہی کو کر دیا منوّر   [illegible]

اخلاق ہیں یا کرم سراپا　　اوصاف ہیں یا ارم سراپا
آئینہ، جمالِ مصطفےٰ کا　　واللہ، کمال ہے خدا کا
جس گل کی بہار انبیا ہوں　　پھر اس کے لئے قیاس کیا ہوں
اے دل! یہ مثالِ آدمیّت　　ظاہر ہے کمالِ آدمیّت
محبوبِ خدا ہی، کامل انساں　　مطلوبِ خدا ہی کامل انساں
مسرور ہے، انتہا ہماری　　پُر نور ہے، انتہا ہماری
لازم ہے ہمیں کریں ترقی　　عاقل کو ہے اک اشارہ کافی
منصب اپنا نہ چھوڑ بیٹھیں　　قسمت اپنی نہ پھوڑ بیٹھیں
ہر چند کہ ختم ہے نبوت　　مسدود نہیں ورِ وراثت
منزل ہی نظر میں دور کیا ہے　　ہمت ہو بلند، طور کیا ہے
فطرت ہی ہماری رہنما ہے　　مذہب ہی ہمارا اک خدا

اپنی طرف نظر

اب اپنی طرف بھی کچھ نظر ہو　　شرمندہ حیات خود نگر ہو
صد حیف کہ تو کہیں ہی انساں　　لاریب کہ تو نہیں ہی انساں
مقصود ترا، خدا پرستی　　تو لوچ رہا ہی، اپنی ہستی
بندہ ہی وہی، جو پاک خو ہو　　سجدہ ہی وہی، جو باوضو ہو
آئینہ نہیں، جو ہو مکدر،　　وہ سینہ نہیں، جو ہو مکدر
وہ پھول نہیں، نہ جس میں بو ہو　　مقبول نہیں، جو زشت خو ہو
نعلوں میں مثالِ مصطفےٰ ہے　　تو اپنے طرف تو دیکھ کیا ہے
تجھ میں بھی کوئی پاک خو ہے　　آئینہ وہ دیکھ رو برو ہے
اے شمع! نہ کر ہوا پرستی　　فطرت ہے، تری خدا پرستی
اے شعلۂ عشقِ مشتعل! جا　　جا اپنی حقیقتوں سے مل جا
اے جان! تجھے ہے نور ہونا　　اک عکسِ جمالِ طور ہونا

محتاج زمانہ وہ صمد ہے　　کثرت کی زبان پر احد ہے
خلقت ہی نثار، ایک ہی پر　　لاکھوں کا مدار، ایک ہی پر
اے دل! تو اسیرِ غیر کیوں ہے　　اے کعبہ! خرابِ دیر کیوں ہے
اے نیست فنائے ہست ہو جا　　باطل ہی ہیں! حق پرست ہو جا
اے مست الست! مست ہو جا　　بالائے بلند و پست ہو جا
کرنا ہی تجھے تو کام کر جا　　اسلاف کا اپنے نام کر جا
ہونا ہے تجھے بلند فطرت　　کمیاب ہے ارجمند فطرت

اللہ تجھے کامیاب کر دے
گویا کی زبان میں اثر دے

گویا وہ کوئی غزل سنا دے　　دنیا کے غموں کو جو بھلا دے

غزل

اونچا ہے نظر کا آشیانہ　　کیا خوفِ حوادثِ زمانہ
میخانے میں آ کے گھر بنا لے　　معدوم حوادثِ زمانہ
ہر رنج و خوشی کا ایک حاصل　　ہر ساز میں ایک ہی ترانہ
ارباب کمال کا مربی　　آغوشِ حوادثِ زمانہ
جتنا ہو بلند ذوقِ سجدہ　　اتنا ہے بلند آستانہ
ہر صوت و صدا کو ایک کر لے　　وحدت کا سنائے پھر ترانہ
رخصت اے عقل و ہوش بار رخصت　　آتا ہے کسی کا آستانہ
ساقی کی طرف نظر ہی سب کی　　ہے دور میں ساغرِ زمانہ

سن تنگ نظر کی کچھ نہ گویا
رحمت کا بڑا ہے شامیانہ

گویا جہاں آبادی

مخلص دوست

ایک دن صبح ہی صبح بوڑھے پن چوہے نے اپنے بل سے سر نکالا۔ اُس کی چمکدار آنکھیں موتیوں کی سی تھیں اور مونچھیں بھورے رنگ کی اور سخت سخت اور دُم ایسی جیسے کالے ربڑ کا لمبا سا ٹکڑا ہو بطخوں کے چھوٹے چھوٹے بچے جھیل میں اِدھر اُدھر تیر رہے تھے اور دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جزائر کیزی کی گانے والی سنہری چڑیوں کا کوئی جھنڈ ہے سفید سفید پروں اور سرخ سرخ ٹانگوں والی ماں انہیں پانی میں سر کے بل کھڑے ہونے کی مشق کرا رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار سبق دیتی اور ساتھ ساتھ یہ فقرہ دہرائے جاتی" یاد رکھو، جب تک پانی میں سر کے بل کھڑے ہونا سیکھو نہ لوگے تمہارا شمار اعلیٰ طبقے میں کبھی نہیں ہو سکے گا"۔ لیکن بچے کوئی توجہ نہ دیتے۔ وہ بہت ہی چھوٹے تھے کسی طرح یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آتی اور وہ سوچتے کہ بھلا اعلےٰ طبقے میں شمار ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

بوڑھا پن چوہا گرج کر کہنے لگا" کیسے سرکش بچے ہیں! ڈبو دو انہیں! یہ اسی قابل ہیں!!"

بطخ سہم کر کہنے لگی۔" ہائے! ایسا نہ کہو۔ شروع میں ہر ایک سے یہی ہوتا ہے۔ تم کیا جانو۔ ماں باپ کے صبر کی کوئی انتہا بھی ہوتی ہے"؟

پن چوہا بولا" آہ۔ بھلا میں ماں باپ کے احساسات کیا جانوں۔ میں گرہستی آدمی ہی نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تو کبھی پہلے ہی میری شادی ہوئی ہے اور نہ اب ہی اس کا ارادہ ہے۔ محبت! . . . محبت کافی اچھی چیز ہے، لیکن اپنی جگہ۔ پر دوستی!؟ دوستی کا رتبہ بلند تر ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ دنیا میں ایک مخلص دوست سے زیادہ کمیاب اور عجیب تر کوئی چیز نہیں"۔

ایک سبز چڑیا نے جو قریب ہی بید مجنوں پر بیٹھی تھی کہیں یہ باتیں سن لیں اور کہنے لگی" براہ مہربانی یہ تو بتایئے کہ وہ مخلص دوستوں پر فرائض کیا کیا عاید ہوتے ہیں"؟

بطخ بول اٹھی" ہاں ہاں میں بھی یہ جاننا چاہتی تھی"۔ . . . . اور پھر تیرتی ہوئی جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ کر اپنے بچوں کو مثال کے ذریعے اچھی طرح سمجھانے کے لئے خود پانی میں سر کے بل کھڑی ہو گئی۔

پن چوہا چلا کر کہنے لگا" کیسا فضول سوال کرتی ہو! . . . . . "؟ اور تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولا" بیشک مجھے اپنے مخلص دوست سے یہی توقع ہو گی کہ وہ میرا وفادار رہے اور کیا!؟

ننھی چڑیا ایک نرم سی شاخ پر جھولا جھولتے ہوئے اپنے چھوٹے چھوٹے نازک پر پھیلا کر کہنے لگی۔ "پر اس کے بدلے تم ! کیا کرو گے ؟ تم !!"

پن چوہا کہنے لگا "میں نے نہیں سمجھا !"

"اچھا تمہیں اس موضوع پر ایک افسانہ سناتی ہوں"۔

"کیا افسانہ میرے متعلق ہے ؟ اگر ہے تو سن لوں گا کیونکہ مجھے افسانوں سے بہت دلچسپی ہے"۔

چڑیا کہنے لگی "ہاں یہ تمہیں پر صادق آئے گا" اور وہ درخت سے نیچے اتر آئی اور کنارے پر بیٹھ کر اس نے مخلص دوست کی کہانی شروع کی۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دنیا میں ایک آدمی رہا کرتا تھا، نہایت ہی دیانتدار رفیق اور چھوٹا سا ہنس نامی"۔

پن چوہا بات کاٹ کر کہنے لگا "کیا اس کی ہر بات نرالی ہوتی تھی ؟"

چڑیا کہنے لگی "نہیں وہ صرف اسی بات میں نرالا تھا کہ اس کے گول گول چہرے سے ظرافت ٹپکتی تھی اور وہ بڑا رحمدل اور نیک تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بالکل تنہا رہا کرتا، اور ہر روز اپنے باغ میں کام کیا کرتا تھا اور گرد کی تمام بستیوں میں کوئی باغ اتنا خوش نما نہیں تھا جتنا کہ ننھے ہنس کا۔ اس کے باغ میں جا بجا دمشق کا گلاب کھلا تھا کہیں نرگس تھی کہیں یاسمین اور کہیں گل داؤدی۔ گل صد برگ نے تمام باغ کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور گیندے کے زرد زرد پھولوں نے تو تمام زمین زرد ہی کر رکھی تھی۔ موتیا کے پودوں میں اس قدر پھول آرہے تھے کہ پتہ تو کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ سورج مکھی کے پھول کی سمت گردش آفتاب کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتی اور وہاں اس قسم کے ہزاروں پھول تھے۔ جب ایک قسم کے پھولوں کا موسم ختم ہو جاتا تو دوسرے پھولوں کی بہار آجاتی اور جوں جوں مہینے گزرتے باغ میں رنگ رنگ کے پھول آنے لگتے۔ غرضیکہ وہاں ہر طرف آنکھ کے لئے حسن اور دماغ کے لئے بھینی بھینی خوشبوئیں موجود تھیں۔

یوں تو ننھے ہنس کے اور بھی کئی دوست تھے لیکن سب سے زیادہ مخلص دوست ایک چوڑا چکلا اور گرانڈیل لُہار تھا۔ اس کا نام ہوگ تھا اور وہ بڑا امیر تھا اور ہنس کا اتنا عزیز دوست تھا کہ اس کے باغ کی دیوار پر سے جھک کر بڑا سا گلدستہ یا کوئی میٹھی بوٹی یا اگر پھل کا موسم ہوتا تو آلوچوں یا شاہدانوں سے اپنی جیبیں بھرے بغیر کبھی نہ جاتا۔

ہوگ کہا کرتا "مخلص دوستوں کی ہر چیز مشترک ہوا کرتی ہے" اور ننھا ہنس جواب میں سر ہلا کر مسکرا دیتا اور یہ سوچ کر دل ہی دل میں نازاں ہوتا کہ میں نے کیا ہی اچھا دوست بنایا ہے جس کے خیالات اس قدر شریفانہ ہیں۔

بعض اوقات پڑوسی یہ دیکھ کر ضرور حیران ہوا کرتے کہ امیر پسنہارا بدلے میں ہنس کو کیوں کوئی چیز نہیں دیتا، حالانکہ اس نے اپنی چکی کے کمرے میں آٹے کی سو بوریاں جمع کر رکھی ہیں اس کے علاوہ اس کے پاس چھ دودھیل گائیں اور اونی بھیڑوں کا ایک بڑا سا گلہ بھی ہے۔ لیکن ہنس نے کبھی ایسی فضول باتیں سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ اسی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات تھی ہی کیا کہ وہ ان تمام عجیب غریب باتوں کو نہایت توجہ سے سنا کرے جو پسنہارا سچی اور بے غرض دوستی کے متعلق اُسے سنایا کرتا۔

ننھے ہنس نے اپنے باغ میں کام شروع کر دیا تھا۔ موسم گرما اور بہار و خزاں کا زمانہ تو خوشی خوشی گزر گیا، لیکن جب موسم سرما آگیا اور اس کے پاس منڈی کو لے جانے کے لئے نہ کوئی پھول رہا نہ پھل تو سردی اور بھوک دونوں نے مل کر اُسے بہت ستایا اکثر وہ شام کا کھانا کھائے بغیر ہی صرف دو تین سوکھی ہوئی انجیریں یا کوئی اور خشک میوہ کھا کر سو رہتا۔ یہ بات تو ایک طرف رہی سردیوں میں وہ بالکل تنہا بھی رہ جاتا کیونکہ پسنہارا پھر کبھی اس سے ملنے نہ آتا۔

وہ اپنی بیوی سے کہا کرتا "برفبار موسم میں ننھے ہنس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب کوئی تکلیف میں ہو تو اُسے سب کچھ اکیلے ہی چپ چاپ برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے روز روز مہمان بن کر جانا اور ناحق کسی کو تنگ کرنا! فائدہ کیا؟ دوستی کے متعلق کم از کم میرا نظریہ تو یہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہے بھی بالکل درست۔ لہٰذا بہار سے پہلے تو میں وہاں کسی طرح جانے کے لئے تیار نہیں۔ بہار آلینے دو۔ تب جاؤں گا۔ اس وقت وہ بیچارہ مجھے ایک بڑی سی بسنتی پھولوں کی ٹوکری دے کر ذرا خوش ہو جائے گا۔ میں تو اس کی خوشی چاہتا ہوں"۔

اس کی بیوی اپنی آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے، صنوبر کی خشک شاخوں کی آگ تاپتے ہوئے جواب دیتی۔ "اُف اتنی بے غرض محبت!؟ دوستی کے متعلق تم نے کیسے اچھے اصول بنا رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خود پادری بھی ایسی اچھی باتیں جیسی تمہاری ہیں کبھی نہ کر سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُسے تو رہنے کے لئے تین منزلوں کا مکان میسر ہے اور ہمیں نہیں۔ وہ چھنگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنتا ہے اور تمہاری کوئی بھی نہیں"۔

پسنہارے کا چھوٹا لڑکا کہنے لگا۔ "آہا! ایک بہت اچھی بات سوجی ہے . . . . کیا ہم ننھے ہنس کو یہاں نہیں بلا سکتے اگر اس بیچارے کو مصیبتیں پڑی ہیں تو اُسے یہیں بلا لو۔ میں اپنی آدھی روٹی اُسے دیدیا کروں گا اور اُسے اپنے سفید سفید خرگوش دکھایا کروں گا۔ اچھی اماں! تم بہت اچھی ہو! اُسے ضرور بلا لو میرا دل اس کے لئے بہت اداس ہو رہا ہے"۔

پسنہارا غصے سے گرج کر کہنے لگا۔ "تو! اُتو تو ہے ہی بڑا نادان! معلوم نہیں تجھے سکول بھیج بھیج کر ہمیں کیا فائدہ ہوا تو! اس نے وہاں سے کچھ نہ سیکھا . . . . . فرض کرو خدانخواستہ ننھے ہنس کو یہاں بلا بھی لیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ

اگر ہمارا سب کچھ دیکھ لے گا۔ وہ ضرور دل میں سوچے گا۔ دیکھو یہ تو آگ بھی تاپ رہے ہیں کھانا بھی اچھا کھاتے ہیں۔ سرخ شراب کا بڑا سا مٹکا بھی موجود ہے۔ غرضکہ وہ ہم سے حسد کرنے لگ جائیگا اور حسد! ؟ جانتے ہو کیسی چیز ہے؟ وہ چیز ہے جو فطرت کا ستیاناس کر ڈالے۔ میں کبھی ننھے منس کی فطرت خراب نہ ہونے دوں گا کیونکہ میں اس کا بہترین دوست ہوں میں ہمیشہ خیال رکھوں گا کہ کہیں وہ طمع اور حرص کے جال میں نہ پھنس جائے۔ بالفرض وہ یہاں آ بھی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ آٹا ادھار مانگے، اور ادھار کے تو میں پاس نہ پھٹکوں۔ دوست اور چیز ہے اور آٹا اور چیز انہیں خلط ملط نہیں ہونا۔ لفظوں ہی کی مثال لے لو ہر لفظ کے علیحدہ علیحدہ معنی ہوتے ہیں بس اس مختصر سی مثال سے آگے سب اندازہ لگالو اور یہ تو عام باتیں ہیں ہر کوئی انہیں جانتا ہے"۔

پنہارے کی بیوی جو کی شراب کا ایک بڑا سا گلاس غٹا غٹ چڑھاتے ہوئے بولی" بخدا کیسی اچھی باتیں کرتے ہو۔ لطف آجاتا ہے۔ میں تو بیچ بیچ اونگھ ہی گئی تھی۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گرجے میں بیٹھ کر وعظ سن رہی ہوں"۔

پنہارا کہنے لگا" بات دراصل یہ ہے کہ کام تو ہر ایک آدمی بُرا بھلا کر ہی سکتا ہے لیکن ایسے آدمی دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں جو گفتگو بھی اچھی جانیں ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں گفتگو بہت زیادہ مشکل چیز ہے" اور غالباً ان الفاظ کے خاتمہ پر اس کی درشت نگاہیں میز کی دوسری طرف اپنی چھوٹے بیٹے پر جم گئیں جس نے شرم کے مارے گردن جھکالی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جب اس سے کچھ اور بن نہ آیا تو وہ "جانے دو، جانے بھی دو" ہی پکارنے لگا۔ خیر اس کا کیا ہے وہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ اس پر کوئی گلہ نہیں کیا جا سکتا"۔

جب کہانی یہاں تک پہنچی تو پن چوہا کہنے لگا" بس کہانی ختم؟"

سبز چڑیا کہنے لگی" نہیں ہرگز نہیں ابھی تو شروع ہی ہے"۔

پن چوہا کہنے لگا" اچھا پھر سن لو کہ تم زمانے سے بہت پیچھے رہ گئی ہو۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ آج کل کا ہر اچھا افسانہ گو پہلے کہانی کا انجام بتاتا ہے۔ پھر آغاز کی طرف آتا ہے اور سب سے آخر اس کا درمیانی حصہ بیان کرتا ہے۔ یہ نیا فیشن ہے یہ سب باتیں کل میں نے ایک نقاد کی زبانی سنی تھیں جو جھیل کے گرد ایک نوجوان کے ساتھ چکر لگا رہا تھا وہ بہت دیر تک اسی موضوع پر بحث کرتا رہا اور مجھے اس کی باتیں بالکل درست معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اس نے ایک نیلی عینک لگا رکھی تھی اور کثرت مطالعہ سے اس کے سر کے بال تک اڑ چکے تھے اور جب بھی نوجوان کوئی بات کہتا تو وہ پکار اٹھتا" اونہہ! اونہہ!! . . . . اچھا مہربانی کر کے تم اپنی کہانی شروع کرو۔ مجھے وہ پنہارا بہت ہی پسند ہے۔ خود مجھ میں بھی تمام لطیف حسیات موجود ہیں۔ لہذا ہم دونوں میں گہری ہمدردی ہونا قدرتی بات ہے"۔

چڑیا پہلے ایک ٹانگ پر اور پھر دوسری پر پھدک کر کہنے لگی "اچھا سنو۔ جب جاڑا ختم ہوا اور زرد گلاب نے کھل کھل کر ستاروں کی شکل اختیار کرنی شروع کی تو ایک دن اپنی بیوی سے کہنے لگا۔" لو میں ننھے ہنس سے ملنے چلا ہوں"۔

بیوی کہنے لگی "ہیں؟ چلے ہو؟ بڑے رحمدل ہوا ہمیشہ اوروں کا ہی خیال رکھتے ہو۔ وہاں ساتھ پھولوں کے لئے بڑی ٹوکری لیتے جانا۔ بھولنا مت"۔

پس پنہارے نے لوہے کی ایک بڑی مضبوط زنجیر سے پن چکی کے بادبان اکٹھے کر کے باندھ دیئے اور اپنے بازو میں ٹوکری لٹکائے پہاڑ سے نیچے اترا اور ہنس کے پاس جا کر کہنے لگا "ہنس جی سلام! اچھے تو ہو؟" ہنس بیلچہ ہاتھ میں لئے سر جھکائے کام میں مصروف تھا اُسے دیکھتے ہی باغ باغ ہو گیا اور مسکرا کر کہنے لگا "آئیے! آئیے! آئیے!!!"

"کہو ہنس جاڑے کا موسم کیسے گزرا؟"

"خوب گذرا۔ . . . تم بہت اچھے ہو جو میرا حال پوچھتے ہو۔ مجھ پر بڑا سخت وقت آیا تھا۔ خیر گذر گیا۔ اب تو بہار آگئی ہے اور میں بہت خوش ہوں۔ میرے پھول بھی خوش ہیں"۔

پنہارا کہنے لگا "ہنس جی ہم موسم سرما میں اکثر تمہاری ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہم حیران ہوا کرتے کہ معلوم نہیں تمہارا کیا حال ہو گا"۔

ہنس نے جواب دیا "تمہاری مہربانی۔ مجھے تو کچھ کچھ شک ہو چلا تھا کہ کہیں تم مجھے بھول تو نہیں گئے"۔

پنہارا کہنے لگا "ہنس تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو" "دوستی" اور "بھول" دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہی تو "دوستی" کی عجیب و غریب خاصیت ہے۔ شاید تم زندگی کی شاعرانہ باتوں سے واقف نہیں ہو اور ہاں بھئی ذرا سنا دیکھو تو تمہارے گلاب کے پھول کس قدر دلفریب نظر آ رہے ہیں!"

ہنس کہنے لگا "ہاں واقعی بہت خوبصورت ہیں اور میرے لئے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات تو یہ ہے کہ یہ ہیں بھی کافی۔ اب انہیں منڈی میں لے جا کر مجسٹریٹ کی لڑکی کے پاس فروخت کر دوں گا اور پھر اُن روپوں کی ایک پہیئے کی ہاتھ گاڑی پھر سے خرید لوں گا"۔

ہوگ کہنے لگا "پھر سے خرید لوں گا؟ کیا مطلب؟ کیا تم نے پہلی ہاتھ گاڑی کو بیچ ڈالا تھا؟ بڑی بیوقوفی کی"۔

نہیں بات دراصل یوں تھی کہ اسے بیچ ڈالنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ جانتے ہو نا کہ موسم سرما میرے لئے بڑا سخت وقت تھا۔ یقین مانتا میرے پاس روٹی خریدنے کے لئے بالکل کوئی پیسہ نہیں رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اتوار کو پہننے والے کوٹ

کے نقرئی بٹن اتار کر بیچ ڈالے پھر چاندی کی زنجیر پھر اپنا حقہ اور آخر کار ہاتھ گاڑی بھی بک گئی لیکن اب تو میں ان سب کو واپس خریدنے ہی والا ہوں"۔

پنہارا کہنے لگا " ہنس میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالوں گا۔ اس کی کچھ بہت زیادہ مرمت نہ ہوگی۔ ایک طرف تو یقیناً ناکارہ ہو چکی ہے اور پہیئے کے آرے کچھ ہی خراب ہیں۔ بحر بھی میں تمہیں وہ دے دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بڑی فیاضی سے کام لے رہا ہوں اور بہت سے لوگ مجھے بیوقوف بھی سمجھیں گے کہ میں نے کیوں یہ خواہ مخواہ تمہیں دے دی لیکن میں دنیا کے اور لوگوں کی طرح نہیں ہوں۔ میرے خیال میں " فیاضی " ہی دوستی کی روح ہے۔ علاوہ ازیں میرے پاس ایک نئی ہاتھ گاڑی بھی موجود ہے۔ مطمئن رہو کہ میں تمہیں اپنی گاڑی دے دوں گا"۔

ہنس کا گول گول مسرور چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا اور وہ کہنے لگا " اچھا؟ واقعی تم بہت فیاضی سے کام لے رہے ہو میں بڑی آسانی سے اس کی مرمت کرا سکوں گا۔ گھر ہی میں لکڑی کا ایک تختہ پڑا ہے"۔

پنہارا کہنے لگا " لکڑی کا تختہ؟ مجھے اپنے مکان کی چھت کی مرمت کے لئے اسی کی ضرورت تھی۔ چھت میں بڑا سا سوراخ ہو گیا ہے۔ اگر میں نے ابھی سے اسے بند نہ کر لیا تو تمام غلے کو نم آجائے گا۔ خوب موقع پر تم نے اس کا ذکر کر دیا! کیسی عجیب بات ہے کہ ایک اچھا کام کرنے سے دوسرا اچھا کام بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ہاتھ گاڑی دی اور اب تم مجھے اپنا لکڑی کا تختہ دے رہے ہو۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ گاڑی کی قیمت تختے کی قیمت سے بہت ہی زیادہ ہے۔ خیر چلو اس ذکر کو جانے دو سچے دوست ایسے حساب نہیں کیا کرتے۔ مہربانی کر کے تختہ ذرا جلدی لے آؤ تاکہ آج ہی میں اپنا کام شروع کر دوں"۔

ہنس کہنے لگا " ضرور۔ ضرور"۔ اور دوڑ کر ایک تختہ گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔

پنہارا اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا " بڑا چھوٹا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ چھت کی مرمت کے بعد تمہاری گاڑی کے لئے کوئی لکڑی نہیں بچے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں اور ہاں اب چونکہ میں نے تمہیں ہاتھ گاڑی دے دی ہے تم مجھے اس کے بدلے کچھ پھول دو۔ یہ لو ٹوکری۔ دیکھو اسے اوپر تک بھرنا"۔

ہنس نے ذرا افسوس سے پوچھا " بالکل اوپر تک"؟ کیونکہ یہ ٹوکری فی الحقیقت بہت ہی بڑی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے یہ پوری کی پوری بھر دی تو پھر منڈی کے لئے کوئی پھول نہیں بچے گا۔ اس کا بہت ہی جی چاہتا تھا کہ وہ اپنے نقرئی بٹن واپس خریدے۔

پنہارا کہنے لگا " ہاں پوری ہی بھر دو۔ میں نے تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی ہے اب میں نہیں جانتا کہ تم سے کچھ پھول مانگنا کوئی بڑی بات ہے۔ ممکن ہے کہ میرا خیال غلط ہو لیکن دوستی اور پھر سچی دوستی میں اس قسم کی خود غرضی کا دخل

نہیں ہونا چاہیئے "۔

ہنس نے چلا کر جواب دیا "میرے پیارے دوست! میرے بہترین دوست! تم میرے باغ کے تمام پھول لے لو۔ کوئی دن ایسا نہیں آئیگا جب مجھے تمہاری خوشنودی حاصل کرنے سے پہلے نقرئی بٹن درکار ہوں"۔ . . . . . اس کے بعد ہنس دوڑ کر چلا گیا۔ اپنے زرد گلاب کے تمام خوبصورت اور نفیس پھول توڑ کر پنہارے کی ٹوکری بھر دیا۔

"ننھے ہنس خدا حافظ" کہ کر پنہارے نے تختہ اپنے کاندھے پر رکھا اور پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لے کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔

ننھا ہنس بھی جواب میں "خدا حافظ" کہہ کر نلائی کرنے لگا۔ گاڑی ملنے کے خیال سے اُسے بہت مسرت حاصل ہو رہی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنی ڈیوڑھی کی دیوار پر بیلیں چڑھانے کے لئے میخیں جڑ رہا تھا کہ اُسے سڑک پر سے پنہارے کی آوازیں سنائی دیں۔۔۔ اس نے سیڑھی پر سے ایک چھلانگ لگائی اور دوڑ کر باغ کی دیوار پر سے نیچے جھانکنے لگا۔

پنہارا آٹے کی ایک بڑی سی بوری اپنی پیٹھ پر اٹھائے کھڑا تھا۔ کہنے لگا "پیارے ہنس اور ننھے ہنس! میری بجائے تم آٹے کی بوری منڈی کو لے چلو گے"؟

ہنس کہنے لگا "اے ہے افسوس سچ مانیو آج تو میں بڑا مصروف ہوں۔ مجھے آج اپنی تمام بیلیں چڑھانی ہیں۔ سب پھولوں کو پانی دینا ہے اور گھاس کے تختوں پر لوڑھی (ROLLER) پھیرنی ہے۔"

پنہارا کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہوگے پر ذرا سوچو تو سہی کہ میں تو تمہیں اپنی گاڑی دے دینے والا ہوں اور تم ہو کہ میری بات تک ماننے سے انکار کر رہے ہو۔ ہوگی یہ بڑی بے مروتی۔ آگے تم جانو۔

ہنس چلا کر کہنے لگا "ایسے الفاظ زبان پر نہ لاؤ۔ میں تمہارے ساتھ بے مروتی کیوں کروں گا۔ چاہے کوئی تمام دنیا ہی نہ میرے ہاتھ میں دے دے"۔ . . . . اور پھر دوڑ کر ٹوپی لینے اندر چلا گیا اور بڑی سی بوجھل بوری کاندھوں پہ اٹھا کر لڑکھڑاتا ہوا چل دیا۔

اس دن سخت گرمی تھی اور سڑک پر غضب کی گرد بھی اُڑ رہی تھی۔ ابھی وہ میل کے چھٹے پتھر تک بھی نہ پہنچا تھا کہ اسے اس قدر تکان محسوس ہونے لگی کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر دم لینے لگا۔ بہر حال اس نے بڑی مستعدی سے اپنا سفر جاری رکھا۔

آخر کار منڈی آ گئی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد بوری بہت اچھی قیمت پر بک گئی اور وہ فوراً اس خیال سے گھر لوٹ آیا۔ کہ کہیں زیادہ دیر ہوگئی تو راستے میں ڈاکو حملہ نہ کردیں۔

جب رات کو ہنس سونے لگا۔ تو اس نے کہا " آج کا دن بہت محنت و مشقت میں گزرا پر خیر اچھا ہوا میں نے اس کی بات تو مان لی۔ دراصل ہے بھی وہی میرا عزیز ترین دوست اس کے علاوہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی بھی تو دینے والا ہے"۔

دوسرے دن بوگ سویرے ہی سویرے اپنی بوری کی قیمت لینے آ پہنچا لیکن ننھا سا ہنس کل کی طویل اور کٹھن مسافت سے اس قدر چور چور ہو چکا تھا کہ ابھی تک اس کی آنکھ نہ کھلی تھی۔

پسنہارا آ کر زور سے کہنے لگا " مجھ سے پوچھتے ہو تو تم جیسا سست بھی کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سوچ لیتے کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں اور اس خیال سے تم زیادہ محنت کر سکتے تھے لیکن تم ہو کہ ابھی تک سو رہے ہو۔ سستی گناہ کبیرہ ہے اور کم از کم مجھ سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکتی کہ میرا کوئی دوست بھی کاہل ہو ۔ برا نہ ماننا تمہیں بے تکلفی سے سب کچھ صاف صاف کہہ لیا ہے اگر میں تمہارا دوست نہ ہوتا تو یہ فقرے میرے خواب و خیال میں بھی نہ آتے لیکن دوستی کا کیا فائدہ اگر کوئی کسی سے دل کی بات بھی نہ کہہ سکے۔ یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لئے ریاکاری سے ان کی خوشامد کرے اور طرح طرح کے سبز باغ دکھائے لیکن سچا دوست ہمیشہ کڑوی ہی باتیں کہے گا۔ اُسے پروا نہیں ہوتی کہ میرے دوست کو یہ بات بُری معلوم ہوگی یا بھلی اور اگر وہ سچا دوست ہے تو یقیناً وہ کھری کھری کہہ سنانے کو ترجیح دے گا کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل دوست کی بھلائی اسی میں ہے"۔

ننھا ہنس آنکھیں ملتا ہوا بستر سے اُٹھ بیٹھا اور شب خوابی کی ٹوپی پرے پھینکتے ہوئے کہنے لگا " ہاں۔ ہاں اب مجھے بھی بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ میں بہت تھک گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر اور آرام کر لوں۔ پرندوں کے چہچہانے کی خوب آوازیں آ رہی تھیں۔ تمہیں یہ پتا نہیں پرندوں کے گیت سننے کے بعد مجھ میں کام کرنے کی زیادہ طاقت آ جاتی ہے"۔

پسنہارا ننھے ہنس کی پیٹھ پر ایک تھپکی دے کر کہنے لگا " اچھا؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے جتنی جلدی ہو سکے اب کپڑے پہن لو میرے ساتھ پون چکی کو چلو چل کر چھت کی مرمت کرتے ہیں"۔

غریب ہنس باغ کا کام کرنے کے لیے پہلے ہی بڑا مضطرب تھا۔ کیونکہ دو دن سے اس کے پھولوں کو پانی نہیں ملا تھا لیکن وہ پسنہارے کی بات ماننے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کا بڑا ہی خیرخواہ اور مخلص دوست تھا۔

وہ نہایت ہی محجوب اور خائف سے لہجے میں ذرا ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا " اگر میں کہوں کہ میں سخت مصروف ہوں تو تم مجھے بے مروت تو نہیں سمجھو گے؟"

پسنہارا کہنے لگا " یہ سوچ لو کہ میں اپنی ہاتھ گاڑی تمہیں دے رہا ہوں۔ اس کے بدلے اگر تم میرا چھوٹا سا کام کر دو گے

تو پھر میں خود ہی کر لوں گا۔"

ہنس چلا کر کہنے لگا "نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" یہ کہ کر وہ بستر پر سے زقند بھر کر اتر آیا اور کپڑے پہن کر پنہارے کے ساتھ چل دیا۔

وہ دن بھر وہاں کام کرتا رہا یہاں تک کہ سورج کے غروب ہونے کا وقت بھی آپہنچا۔ اتنے میں پنہارا بھی یہ دیکھنے کے لئے کہ کام کیسا ہو رہا ہے وہاں آن موجود ہوا اور نہایت خوش مزاجی سے کہنے لگا "ننھے ہنس اب تک چھت کی مرمت ہوئی ہے یا نہیں ؟"

ہنس نے سیڑھی پر سے اترتے ہوئے جواب دیا "ہاں بالکل ہوگئی"۔

پنہارا کہنے لگا "عجیب بات ہے آدمی کو اپنے کام کی بہ نسبت دوسروں کا کام کرنا زیادہ خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔"

ننھا ہنس نیچے بیٹھ گیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہنے لگا "تمہاری گفتگو سننا ہی دنیا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے بہت ہی بڑی۔ مجھے افسوس ہے تو یہ ہے کہ معلوم نہیں ایسے روشن اور خوبصورت خیال جیسے تمہارے ہیں کبھی میرے بھی ہو سکیں گے۔"

پنہارا کہنے لگا "کچھ مضائقہ نہیں۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤ گے لیکن تمہیں ذرا زیادہ تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ ابھی تو تمہیں دوستی قائم رکھنے کی مشق ہی ہوئی ہے۔ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ اصول تمہاری عقل میں بھی آجائے گا۔"

ہنس پکار اٹھا۔ "ہیں سچ مچ ؟ تمہارا میری نسبت یہ خیال ہے!؟ ہائے کبھی میں بھی ایسا ہو جاؤں نا!"

پنہارا کہنے لگا "مجھے تو اس میں شک نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں چونکہ اس وقت چھت کی مرمت کر کے تم تھک گئے ہو بہتر یہی ہے کہ اب گھر چلے جاؤ اور آرام کرو۔ کل تمہیں پہاڑ پر میری بھیڑیں چرانی ہیں۔"

ننھے ہنس کو جواب میں چون و چرا کرتے ڈر لگتا تھا۔ ناچار چپ ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے ہی سویرے پنہارا اس کی جھونپڑی تک اپنی بھیڑیں ہانک لایا اور ہنس انہیں پہاڑ پر چرانے لے گیا۔ تمام دن بھیڑیں چراتے چراتے ضائع ہو گیا اور جب وہ واپس آیا تو تکان سے اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر گر کر اس طرح سویا کہ دوسرے دن سورج چڑھے ہی اس کی آنکھ کھلی۔

"آج باغ میں کام کے لئے کیسا سہانا وقت ہے"۔ کہ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔

لیکن کسی صورت بھی وہ اپنے پھولوں کی خبر نہ لے سکا کیونکہ اس کا دوست پنہارا ہمیشہ آجاتا اور اسے دور دور اپنے کاموں پر بھیج دیتا یا اس سے پون چکی پر کام لیا کرتا۔

اکثر ننھا ہنس اپنے آپ کو بڑا ہی دکھی محسوس کرتا کیونکہ اس کے دل کو ایک یہ بھی غم تھا کہ کہیں اس کے پھول یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ میں نے انہیں بھلا دیا ہے اور ان کا دل ٹوٹ جائے لیکن پھر دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو یہ تسلی دے کر بہلا لیا کرتا کہ آخر دنیا میں ایک مخلص تو ہے ہی نا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچتا کہ وہ مجھے اپنی ہاتھ گاڑی دینے والا ہے یہ اس کی کچھ کم مخلصانہ فیاضی ہے۔

پس ننھا ہنس پنہارے کے کاموں میں لگا رہتا اور پنہارا اُسے دہقی کے متعلق طرح طرح کے سبز باغ دکھایا کرتا اور یہی باتیں ہنس اپنی نوٹ بک میں لکھ کر رات کو یاد کیا کرتا۔ کیونکہ اُسے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔

اب یوں ہوا کہ ایک شام جب ہنس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا یکایک کسی نے دروازے کو مٹھیوں سے خوب پیٹا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات نہایت وحشتناک تھی اور آندھی کے تیز جھونکے جھپٹے چلے آتے تھے۔ دراں سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے شیر غرا رہے ہوں۔ آندھی اس قدر غضبناک تھی کہ پہلے تو اس نے یہی جانا کہ طوفان ہی آگیا ہے لیکن جب دروازے کو پیٹنے کی آوازیں متواتر آنے لگیں تو ننھا ہنس یہ کہ کر دروازے کی طرف بڑھا "شاید کوئی بیچارا مسافر ہے"۔

سامنے پنہارا اپنے ایک ہاتھ میں لال ٹین اور دوسرے میں ایک چھڑی لئے کھڑا تھا۔

کہنے لگا "ننھے اور پیارے ہنس مجھ پر سخت مصیبت آن پڑی۔ میرا چھوٹا لڑکا سیڑھی پر سے گر پڑا ہے اور اُسے بہت چوٹ آئی ہے۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں عجیب مصیبت ہے وہ بہت ہی دور رہتا ہے اور رات بھی سخت اندھیری ہے۔ یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ میری بجائے تم بھی تو جا سکتے ہو۔ یہ بہتر رہے گا تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تمہیں اپنی ہاتھ گاڑی دے رہا ہوں مناسب یہی ہے کہ تم بھی اس کے بدلے میرے لئے کچھ کام کرو"۔

ہنس چلا کر کہنے لگا "یقیناً یقیناً تمہارا یہاں آنا میرے لئے باعث فخر ہے میں فوراً چل دیتا ہوں لیکن تم ذرا اپنی لال ٹین مجھے دے دو۔ دیکھئے ہو رات کس قدر تیرہ و تار ہو رہی ہے کہیں میں کسی کھڈ میں نہ گر جاؤں"۔

پنہارا کہنے لگا "افسوس افسوس یہ تو میری بالکل نئی لال ٹین ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا ہو تو میرا بڑا نقصان ہوگا"۔

ننھا ہنس کہنے لگا "اچھا جانے دو میں اس کے بغیر ہی چلا جاؤں گا"۔ چنانچہ اس نے اپنا کھال کا بڑا کوٹ کاندھے پر سنبھالا اور اپنی سرخ رنگ کی گرم ٹوپی اور گلے پر مفلر لپیٹ کر چل دیا۔

اُف کس قدر ڈراؤنا اور بھیانک طوفان تھا اور رات اس قدر اندھیری کہ ننھے ہنس کو بہ مشکل ہی راستہ نظر آتا۔ آندھی فراٹے بھر بھر کر چل رہی تھی اور ننھے ہنس کے قدم اپنی جگہ سے اکھڑ اکھڑ جاتے تھے لیکن وہ بڑا باہمت تھا تین گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ آخر ڈاکٹر کے مکان پر آپہنچا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

ڈاکٹر نے شب خوابی کے کمرے کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا "کون ہے اس وقت۔"

"ڈاکٹر! میں ہوں — ننھا ہنس —"

پنہارے کا لڑکا سیڑھیوں پر سے گر گیا ہے اور اُسے بہت چوٹ آئی ہے پنہارے نے مجھ سے کہا ہے کہ ڈاکٹر کو جلدی بلا لاؤ۔"

ڈاکٹر کہنے لگا "بہت اچھا!" اور پھر اس نے اپنے نوکروں سے اپنا فل بوٹ گھوڑا اور لالٹین لانے کے لئے کہا اور نیچے اتر کر پنہارے کے مکان کی طرف چل دیا اور ننھا اس کے پیچھے لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔

طوفان بڑھتا ہی گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اتنے طوفان میں وہ گھوڑے کے ساتھ بھی نہ رہ سکا۔ اب اسے کچھ سوجھ نہ پڑتا کہ وہ کدھر جائے آخر وہ راستے سے بھٹک گیا اور اندھا دھند پھرتا پھرتا کہیں دلدلوں کی طرف جا نکلا۔ یہ ایک نہایت خطرناک جگہ تھی۔ جہاں جا بجا عمیق کھڈ تھے۔ بیچارا ننھا ہنس یہیں ڈوب گیا۔ دوسرے دن اس کی لاش گڈریوں نے ایک بڑے سے تالاب میں تیرتی ہوئی دیکھی وہ اُسے اٹھا کر اس کی جھونپڑی کو لے گئے۔

سب آدمی ننھے ہنس کے جنازے میں شریک تھے کیونکہ وہ بڑا ہی ہر دلعزیز تھا۔ ان سب میں پنہارا سب سے بڑا سوگی بنا بیٹھا تھا۔

وہ کہنے لگا "چونکہ میں اس کا عزیز ترین دوست تھا اس لئے جلوس میں سب سے آگے مجھے جگہ ملنی چاہیئے۔ پس وہ ایک لمبا سا کالا چغا پہن کر ماتمی جلوس کے آگے آگے چلنے لگا اور بار بار اپنی آنکھیں ایک بڑے سے رومال سے پونچھتا۔

جب تجہیز و تکفین کی رسم ہو چکی تو لوہار کہنے لگا۔ "ننھے ہنس کی موت سے یقیناً ہم سب کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور پھر وہ سب سرائے میں آرام سے بیٹھ کر مصالحہ دار شراب اور میٹھے کیک کھانے لگے۔

پنہارے نے جواب دیا۔ "کچھ ہی ہو اصل نقصان تو مجھے پہنچا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ میں نے اُسے اپنی ہاتھ گاڑی دے ڈالی تھی اور اب فی الواقع میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا کروں میرے لئے اس کا وجود مصیبت ہو چلا ہے اور مرمت اس کی اس قدر ہوگی کہ اگر میں اسے بیچنا چاہوں تو مجھے کوئی اس کا ایک آنہ بھی نہ دے۔ میں ضرور اس بات کا خیال رکھوں گا کہ آئندہ کبھی کوئی چیز کسی کو نہ دوں۔ سخی ہونا بھی ایک عذاب ٹھیرا۔

ایک لمبے توقف کے بعد پن چوہا کہنے لگا "اچھا تو پھر ہوا کیا؟"

چڑیا کہنے لگی: "بس یہاں کہانی ختم ہوتی ہے۔"

پن چوہا کہنے لگا "لیکن پن ہارے کا کیا ہوا؟"

چڑیا نے جواب دیا "میں کیا جانوں کیا ہوا نہ کچھ مجھے اس کی پروا ہے"

پن چوہا کہنے لگا "تو ظاہر ہے کہ تمہاری فطرت میں کوئی ہمدردی موجود نہیں"۔

چڑیا کہنے لگی "شاید تم کہانی کے نتیجے پر غور کر نہیں کر رہے"؟

پن چوہا کہنے لگا "کس! پر غور نہیں کر رہا"؟

"نتیجے پر"۔

"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اس کہانی سے کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے"۔

"یقیناً"۔

پن چوہا نہایت غصے سے کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات تمہیں مجھے کہانی شروع کرنے سے پیشتر ہی بتا دینی چاہیے تھی" اگر تم ایسا کرتیں تو میں ہرگز تمہاری کہانی نہ سنتا اور اس نقاد کی طرح "اونہہ! لغو!" کہہ دیتا۔ تو اب بھی یہ کہہ کر اس نے اتنی اونچی آواز سے جتنی اس سے ممکن تھی گلا پھاڑ کر کہا "اونہہ!! لغو !!!" اور اپنی دم کو جھٹپٹا دے کر اپنے بل میں واپس چلا گیا۔

اور بطخ کچھ دیر بعد تیرتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "پن چوہے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس میں کئی خوبیاں ہیں اور میری کیا پوچھتے ہو۔ میرے احساسات تو ایک ماں کے سے ہیں اور جب میں کسی ایسے فرد کو دیکھتی ہوں جسے ہمیشہ نا کتخدا ہی رہنا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔

چڑیا کہنے لگی "کہانی سنا کر شاید میں نے اُسے خواہ مخواہ رنج ہی کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اُسے ایک ایسی کہانی سنا بیٹھی جس کا کوئی نتیجہ بھی نکلتا تھا۔

بطخ کہنے لگی "آہ ایسی باتیں کرنا ہمیشہ بڑی خطرناک غلطی ہوتی ہے"۔

اور مجھے بھی اس سے بالکل اتفاق ہے

(آسکر وائیلڈ)

مہدی علی خاں کرم آباد

غزل

رہے صدیوں سے تیرا میخانہ ساقی
خدارا اک مجھے پیمانہ ساقی

وہ اٹھی ہے گھٹا، مہکیں وہ کلیاں
اٹھالے جھوم کر پیمانہ ساقی

ہوا میں عود کی ہے آج خوشبو
ہر اک ذرہ ہے اک میخانہ ساقی

نشہ سا ہے زمیں سے آسماں تک
دو عالم بن گئے مے خانہ ساقی

عبادت میں ہے شامل آج کی شب
گناہ و لغزشِ رندانہ ساقی

فضا میں ہیں جوانی کی امنگیں
شفق میں سرخئ پیمانہ ساقی

چھلکتے جام ہم سے کہہ رہے ہیں
حدیثِ عشوہ جانانہ ساقی

وہ ہلکا سا ترنم ہے ہوا میں
ہوا جاتا ہے دل دیوانہ ساقی

کہاں کی خلد، کیسی نارِ دوزخ
کہ ہے فرسودہ یہ افسانہ ساقی

وہی آزاد ہے دنیا میں جو ہو
اسیرِ تلخئ پیمانہ ساقی

ابلتی ہے پیالوں سے مئے سرخ
خدارا! نعرۂ مستانہ ساقی

جلالؔ اک رند ہے، درویش صورت
جھجکتا کیا ہے اک پیمانہ ساقی

—— جلالؔ ملیح آبادی

افسانہ کی کہانی

خود اُسی کی زبانی

مکرمی حامد صاحب کا تقاضا ہے کہ افسانے کے متعلق کچھ لکھوں۔ لیکن مضمون ایسا دلچسپ ہو کہ بجائے خود ایک افسانہ بن جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کوئی ٹھوس علمی مضمون اتنا دلچسپ کیسے ہو سکتا ہے۔ موضوع سمجھ میں آ گیا۔ اُسے لکھنے بیٹھا لیکن ایک صفحہ لکھنے کے بعد پڑھا تو شروع سے آخر تک میری طرح خشک۔ کاٹ دیا۔ اور سوچا کہ اب آخر کیا علاج کیا جائے۔ اُسی دن رات کو کچھ احباب بیٹھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین کا ذکر ہونے لگا اُن کا مضمون مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی۔ ذہن میں آیا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ افسانہ کی کہانی خود اُسی کی زبانی بیان کروں۔ میری زبان میں اتنا رس نہیں لیکن افسانہ بذات خود ایک ایسی دلچسپ چیز ہے جس سے بچے اور بوڑھے کو برابر کی محبت ہے۔ اس لئے اُس کی زبان سے اُس کا افسانہ زیادہ شیریں معلوم ہوگا۔ خیالات اور اُن کی ترتیب میری ہے اور زبان "افسانہ" کی۔ اگر ناظرین محظوظ نہ ہوں تو اس کی ذمہ داری مجھ پر کم ہے۔ اور اگر مضمون صرف دلچسپ ہے اور خشک فلسفیوں کے لئے اُس میں ٹھوس علمی معلومات کا ذخیرہ نہیں تو اس کے ذمہ دار حامد صاحب ہیں اس لئے کہ میں نے یہ طریقہ کم و بیش انہیں کی ترغیب سے اختیار کیا ہے۔ وقار

لوگوں کو میرے نام سے دلچسپی ہے ——— ہر شخص میرے نام پر جان فدا کرتا ہے لیکن یہ کسی کو خبر نہیں کہ میں کہاں پیدا ہوا۔ کس ماں کا دودھ پیا اور کن گودوں پروان چڑھ کر آج اتنا بڑا ہوا کہ چھوٹا اور بڑا ہر کوئی میرے نام کا دم بھرتا ہے۔ چونکہ مجھے معلوم ہے کہ جن لوگوں کو مجھ سے دلچسپی ہے وہ میری رام کہانی کو بھی مزے لے لے کر سنیں گے اس لئے حرف بہ حرف آپ بیتی کہے دیتا ہوں۔ سنئے۔ آپ کا جی چاہے اُس سے عبرت حاصل کیجئے۔ چاہے اُسے ہنس کر ٹال دیجئے۔

دنیا کے سارے علموں اور فنوں کی طرح میری پیدائش بھی یونان میں ہوئی۔ میرے ظاہری حُسن کو دیکھ بڑے بڑے فلسفی ریجھے اور مجھے محبت اور شفقت کے ہاتھوں نے پالا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اُن کی طبیعتیں رنگینی سے بیگانہ تھیں۔ خشک فلسفہ اُن کی طبیعتوں پر چھایا ہوا تھا۔ تھوڑے دن تک تو خوب لاڈ چاؤ چلے رہے مگر پھر دودھ کی مکھی کی طرح مجھے

یوں نکال کر پھینکا کہ قوم نے میرا نام تک بھلا دیا۔ میں اس آوارگی میں ہر طرف پھرا۔ پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں تھی مگر دل میں بچپن کی ترنگیں تھیں۔ پاؤں تھکے۔ دل نہیں تھکا۔ خدا خدا کر کے ایک ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے لوگ حُسن کے دیوانے اور رنگینیوں کے متوالے تھے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ پر اُن کی جان جاتی تھی خدا اِن مصریوں کا بھلا کرے۔ انہوں نے مجھے بھی دیکھا اور قدر دانی کی مسند پر جگہ دی۔ ایمان کی بات ہے کہ میں نے اپنی طفلی کا ابتدائی زمانہ جس مزے سے یہاں کاٹا پھر کبھی نصیب نہ ہُوا۔ قدر دانوں کے دلوں میں محبت کی مسند پر میری جگہ تھی۔ دلچسپی اور لطف میری پرورش کے لئے مقرر ہوئیں میں نے بھی خوب آرام سے ان کی گودوں میں پرورش پائی۔ رخساروں کی سرخی دن دونی رات چوگنی بڑھتی گئی۔ اندرونی حُسن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب کیا تھا ہر کس و ناکس کی نظریں پڑنے لگیں۔ فرانس والے ہمیشہ سے ایسی چیزوں پر جان دیا کئے ہیں۔ اُن کی نظریں پڑنے لگیں۔ میرا جی بھی ایک جگہ رہتے رہتے ایسا گھبرا گیا تھا کہ مصر کو چھوڑ کر فرانس پہنچا۔ فرانس والوں نے میرے وہ بناؤ کئے کہ دولہا بنا دیا۔ مجھے خود بھی اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ شباب کا زمانہ شروع ہو گیا شباب نے نیرنگیوں میں اور اضافہ کیا۔ انگلستان، جرمنی اور روس سے قدردان آئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی طرف کھینچا۔ کچھ اس محبت سے بلایا کہ میں بھی ریجھ گیا۔ ایک ہی قدم میں انگلستان، جرمنی اور روس کی سیر کرنی شروع کی ہر جگہ نیا جامہ پہنا۔ ہر جگہ نیا سنگار کیا اور ہر جگہ ایک نئی پھبن اختیار کی۔ اب میری یہ حالت تھی کہ دن رات بھیس بدلنے سے کام۔ کبھی فرانسیسی جامہ اور کبھی انگلیسی کبھی جرمنی اور کبھی روسی۔ میری زندگی بڑے مزے سے کٹ رہی تھی۔

یہی زمانہ تھا کہ امریکہ والے دنیا کے گوشہ گوشہ کو چھانتے پھر رہے تھے۔ ہر شخص کے گلے میں ایک تھیلی کبھی یورپ کی سیر کی کبھی ہندوستان گئے کبھی ایران کے آتش خانوں کی آگ سے دل روشن کئے اور کبھی چینیوں کی تصویروں کو دل پر نقش کیا۔ جہاں گئے وہاں سے آبدار سے آبدار موتی چُنے اور اپنی تھیلیوں کو بھرا۔ اپنے خزانوں کو اتنا مالا مال کیا کہ دنیا کی ہر قوم اُن کے سامنے ماند نظر آنے لگی۔ یہی زمانہ تھا کہ ان سیاحوں کی نظر مجھ پر پڑی۔ بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر واہ ری قوم مجھے سے جا کر ایسی اونچی جگہ بٹھایا کہ میں زندگی بھر کی قدردانیاں بھول گیا۔ فرانس اور روس کی محفلوں کی سرگرمیاں سرد نظر آنے لگیں۔ بچے اور بوڑھے ہر شخص نے مجھے آنکھوں پر بٹھایا۔ دل میں جگہ دی۔ مجھے بھی اس سرزمین سے ایسی محبت ہوئی کہ میں یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یورپ والوں نے میری اس شکل کی تصویریں کھینچیں اور انہیں اپنے ادبی نگار خانوں کی زینت بنایا۔ دنیا کے ہر حصہ میں میرا ڈنکا بجنے لگا۔ اب سنئے کہ اس شہرت کا کیا نتیجہ ہُوا۔ اُن قوموں کے دلوں میں بھی میری محبت پیدا ہوئی جنہیں اب تک میری لطافتوں کا احساس تک نہیں

تھا۔ ایرانیوں نے ترکوں نے۔ ہندوستانیوں نے جھانک جھانک کر میرے جلوے دیکھنے شروع کئے۔ مگر میری بارگاہ تک آنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ مجھے ان کے خلوص کا احساس ہوا۔ میرا دل خود ان کی طرف کھینچنے لگا۔ مغرب کی محبت مشرق کی الفت سے بدل گئی۔ ایران۔ ترکستان اور ہندوستان کی سیریں شروع ہو گئیں مغرب کی داستان کچھ اتنی زیادہ دلچسپ نہیں۔ اس لئے میں نے اُس کی تفصیلوں کا ذکر نہیں کیا لیکن میری مشرق کی داستان اس قدر دلکش ہے کہ اُس کا لفظ لفظ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے خصوصاً ہندوستان کا قصہ کچھ ایسا ہے کہ اُس میں اُلجھ کر پھر کہیں اور جانا مشکل ہے۔ دلچسپی بھی اس میں اتنی ہے کہ اُسے چھوڑنا داستان کو بدمزہ بنانا ہے اب ذرا کان لگا کر سنئے۔

جب میں نے ہندوستان میں پہلے پہل قدم رکھا تو یہاں اُردو زبان کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مغرب کی جو چیز آتی تھی وہ اُس میں سمائی چلی جاتی تھی۔ شاعری اور اس کی روح پر مغرب کا اثر پڑ چکا تھا۔ تاریخ اور تنقید نے مغربی جامہ پہن لیا۔ ڈرامہ اور ناول پر مغربیت چھائی چلی جا رہی تھی۔ میں بھی جب پہلے پہل داخل ہوا تو وہی مغربی کپڑے پہنے ہوئے۔ اُردو والے تو اس وقت مغرب کے فدائی بن ہی رہے تھے۔ میرا خیر مقدم نہایت خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ لیکن اب اسے میری بدنصیبی کہیئے یا خوش قسمتی سمجھئے کہ جس زمانہ میں اُردو ادب پر مغرب اور مغربیت اپنا گہرا اثر کر رہی تھی۔ قوم نے مغرب کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اسلاف کے کارنامے۔ اُن کی صداقت۔ جوانمردی اور بہادری کے مرقع دھندلے ہونے چلے جا رہے تھے اور ہندوستانی ہر قدم پر۔ ہر بات میں۔ ہر کام میں۔ کھانے میں۔ پینے میں۔ چلنے میں۔ اٹھنے میں اور بیٹھنے میں مغرب کی تقلید پر آمادہ تھے۔ اپنی تہذیب کی اچھائیوں کو بالکل بھلا دیا تھا۔ سچی بات ہے کہ ادب پر مغرب کا جو اثر پڑ رہا تھا وہ تو ہر حیثیت سے مفید تھا لیکن سوسائٹی کے دلوں پر اُس کا اتنا گہرا قبضہ نہ دیکھنے والوں کو اچھا لگ سکتا تھا اور نہ خود سوسائٹی کے لئے مفید ہو سکتا تھا اس لئے ملک کے ہر گوشہ سے اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ادیبوں نے شاعروں نے ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں نے جو کچھ لکھا وہ اسی مقصد سے کہ قوم کی اصلاح کریں۔ چونکہ یہ زمانہ ایسا تھا کہ میں نے دلوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میری ہر ادا لوگوں کو بھاتی تھی۔ میری صورت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ گدڑی میں بھی لوگ اُسے پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ افسانہ نگاروں نے مجھے بھی یہی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ میرے نازک اور قیمتی کپڑے میرے تن پر سے اتار کر پھینکے جانے لگے۔ ریشم اور سرج کے تانگ اور خوش وضع کپڑوں کو بھاری اور بد قطع کپڑوں سے بدل دیا گیا۔ میرا بدن نزاکتوں کا عادی تھا۔ اُس سے بھلا یہ مصیبتیں کیسے اُٹھائی جاتیں۔ میرا جی

گھبرانے لگا۔ قدم قدم پہ مغرب کی لطافتیں اور اُن کی یاد دل کو ستاتی تھی۔ مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ مدتوں
اس مصیبت کو بھرا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ نہ وہ رنگ نہ روپ نہ وہ حُسن نہ وہ لطافت۔ جسم اور روح میں تازگی اور شگفتگی
کا نام نہیں۔ کسی نے مجھے پردہ اور اس کے مقاصد کے بیان کرنے کا آلہ بنایا۔ کسی نے میری زبان سے تعلیم کے
فائدے بتائے۔ کسی نے فیشن کو برا بھلا کہا تو میری زبان سے مغربی وضع قطع اور اس کے ظاہری حُسن کو طعنے دیئے
تو میرے لفظوں میں۔ میں سب کا تھا، نہ خود مجھے اپنی زندگی پسند۔ نہ لوگوں کو میری صورت سے دلچسپی۔ انہیں مجھ سے
نفرت اور مجھے اُن سے۔ غرض میری زندگی کا یہ زمانہ بڑا اُجڑا گذرا۔ اگر اس زمانہ کی میری ظاہری اور باطنی تصویریں
دیکھنی ہوں تو سلطان حیدر جوش اور راشد الخیری کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ لو۔ جب مجھے وہ بھلی نہیں لگتیں تو
کوئی دوسرا انہیں کیا پسند کرے گا۔ یہ تصویریں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا صرف ایسی ہیں جن میں مجھے ایسے کپڑوں
میں ملبوس کیا گیا ہے۔ جن سے مغرب اور اس کی تہذیب کے بُرے خدوخال جھلکتے نظر آئیں۔

جب ذرا زمانے نے اور ترقی کی تو اس اصلاحی مقصد کی تصویروں پہ بھی اور رنگ و روغن چڑھایا جانے
لگا۔ اور روح میں ذرا تازگی کے آثار پیدا ہوئے۔ آپ پوچھیں گے کہ آخر وہ کون سی تصویریں تھیں۔ خدا
بھلا کرے پریم چند کا کہ انہوں نے اصلاحی مقصد کو اپنے سامنے رکھا لیکن اس اصلاحی مقصد میں صرف مغرب
کے لئے دشمنی نہیں تھی۔ بلکہ اُن کا صحیح جذبہ خود اُن کی قومی محبت تھی۔ اسی قومی محبت کے اثر سے متاثر ہو کر
انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی اپنے بزرگوں کی عظمتوں کو بالکل بُھلا بیٹھے ہیں۔ اسی کمی کو دور کرنے کے
لئے بھی انہوں نے میری مدد لی۔ مجھے اصلاحی مقصد کا جامہ پہنایا لیکن اس جامہ کی تراش۔ کانٹ۔ چھانٹ
ہر چیز میں سلیقہ سے کام لیا۔ لباس کو ہر طرح خوبصورت بنانے کی کوشش کی اور اُسے اس طرح میرے
بدن پہ پہنایا کہ وہ بدن پر چست ہو۔ بدن کا حُسن بھی نمایاں رہے اور جامہ کی زیبائش کا بھی اثر دل پر پڑے۔ ان
جاموں کو قدیم یادگاروں اور عظمتوں کے رنگوں سے رنگا اور اس طرح رنگا کہ بالکل اجنبیت باقی نہ رہے۔ پریم چند
کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اس کے ہاتھوں میں آ کر میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ہندوستان میں رہ کر بھی کچھ آرام
مل سکتا ہے۔

ہاں! چونکہ اس وقت پریم چند کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس لئے ایک بات اور بتانی ضروری معلوم ہوتی ہے
اور وہ یہ کہ جہاں پریم چند نے اس اصلاحی مقصد میں ادبی لطافتوں کا حسن شامل کر کے ان جاموں کو میرے بدن
کے لئے موزوں سے موزوں بنایا وہاں ایک دوسری بات انہوں نے ایسی کی جو تعریف سے باہر ہے۔

مگر اس بات کے سننے سے پہلے میں اپنی ایک بات کہہ لوں۔ اور وہ یہ ہے کہ جب میں نے پہلے پہل امریکہ چھوڑا تو سب سے خوش آیند چیز میرے سامنے یہ تھی کہ اب دوسرے ملکوں کی سیر کر کے وہاں کی مقامی خصوصیتوں سے لطف اٹھاؤں گا روح اور دل کو فرحت نصیب ہوگی۔ یہاں آکر یہ آرزو خاک میں مل گئی۔ نہ امریکہ کی باتیں باقی رہیں اور ہندوستان کی باتوں کا لطف آیا۔ میرا دل مُردہ ہو گیا تھا کہ اب یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ مگر میری خوش نصیبی کہ پریم چندر نے میری بے کسی پر ترس کھایا۔ مجھے ایسی ایسی جگہوں کی سیر کرائی کہ میں اُس کا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔ دیہات کی زندگی۔ وہاں کے مرقعے لہلہاتے ہوئے سبزے کی بہاریں۔ بہتے ہوئے دریاؤں کی روانی۔ معصوم کسانوں کی زندگی۔ اُن کی زبان۔ اُن کے جذبات اُن کی سادگیاں۔ اُن کی مصیبتیں۔ میں نے ہر چیز کو اچھی طرح دیکھا۔ کتنی بڑی بات ہے کہ اب میں اگر ہندوستان سے کسی دوسرے ملک میں جاؤں تو آسانی سے لوگ ہندوستان کی خصوصیتوں کا پتا مجھے دیکھ کر چلا لیں گے۔ مجھ میں وہ سب باتیں ہیں جو ایک سیاح اور مؤرخ کسی دوسرے ملک میں جا کر دیکھنا چاہتا ہے۔ میں اسے اپنے لئے حُسنِ مجسم سمجھتا ہوں اس نے میری رعنائیوں میں دوبارہ تازگی پیدا کر دی۔ مجھ میں پھر وہی حُسن پیدا ہو گیا جسے میں کبھی اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ لیکن جو لوگ اصطلاحوں کی دھن میں دیوانے ہیں۔ ہر چیز کے لئے ایک خاص نام کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اسے مقامی رنگ کہتے ہیں۔ داستان کا یہ حصہ ذرا دلچسپ ہے میرا دل نہیں چاہتا کہ اسے ادھورا چھوڑ دوں۔ ذرا غور سے سنئے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی لطف آئے گا۔ پریم چندر نے میری اصطلاح میں جس حُسن کی تصویریں کھینچیں یعنی دوسروں کے نزدیک جس مقامی رنگ کو سراہا۔ اُس کی تقلید بعض اور افسانہ نگاروں نے بھی کی۔ ان میں خاص طور پر سدرشن۔ اعظم کریوی اور علی عباس حسینی سے مجھے اس خاص حیثیت سے زیادہ لگاؤ ہے انہوں نے اس خاص طرز میں پریم چند کے رنگ کو نہایت کامیابی کے ساتھ نباہا ان کے یہاں بھی دیکھئے تو میں دیہاتی زندگی کے چوپے میں ڈوبا ہوا دکھائی دوں گا۔ خیر یہ بات تو کچھ ایسی نہیں اب ذرا ایک اور دلچسپ بات سنئے۔ میرے بعض دوسرے شیدائیوں نے جو یہ دیکھا کہ مقامی رنگ کا یہ جوڑا مجھے بہت پسند ہے۔ اس نے میری پرانی رعنائیوں میں اضافہ کر دیا ہے تو یہ محبت کے دیوانے اِسی چیز کی دوسری شکلیں ڈھونڈنے لگے اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی یہ کوششیں ایسی پھلیں پھولیں کہ دیکھنے والوں کے لئے سرمایہ سرور بن گئیں۔

راشد الخیری اور سدرشن نے اس حیثیت سے یہ بات کی کہ مجھے لے کر ہندوستان کے گھر گھر میں پھرے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ میں نے اُن کی زینتیں دیکھیں۔ اُن میں رہنے والوں کی باتیں سنیں۔ اُن کے مذاق۔ اُن کی لڑائیوں۔ اُن کی شادیوں اور اُن کے غموں میں حصہ لیا اور اب مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے گھروں کی کیا حالت ہے۔ بڑی ہٹ دھرمی ہے اگر اس حیثیت سے ان کا احسان نہ مانوں۔ اس لئے کہ مقامی رنگ کی یہ جھلک پریم چندر کے مقامی

رنگ سے کچھ کم دلچسپ نہیں۔

خیر۔اسے تو یہیں چھوڑیئے۔اب ذرا دیکھئے کہ اس کے علاوہ دوسرے افسانہ نگاروں نے اسی حیثیت سے میرے محسن میں اور کونسا اضافہ کیا۔

ایسی تصویروں کے دو اور مصور جن کی میری نظروں میں بہت قدر ہے نیاز اور مجنوں ہیں۔انہوں نے مقامی رنگ کی تصویروں میں ایک اور دلچسپ رنگ آمیزی کی۔بجائے کسی مخصوص سوسائٹی یا گھر کی باتوں کا ذکر کرنے کے ہندوستان کی پوری سوسائٹی،اس کی عادتوں۔اس کے طریقوں اور اس کے ماحول کے مرقعے میرے دامن سے وابستہ کردیئے۔ اور اب میری روح اور دل دونوں پر ہندوستان اور یہاں کے مقامی رنگ کی بے حد مکمل تصویریں نقش ہوگئیں۔مجھ میں دیہات کی زندگی کی سادگیاں بھی ہیں مجھ میں ہندوستانی گھروں کی دلچسپی سے بھری باتیں بھی ہیں اور میرے دل پر ہندوستان کی عام فطرت کے گہرے نقش بھی۔

اب تک میں نے جو کچھ بیان کیا اس سے سننے والوں کو اس لئے لطف آرہا ہوگا کہ جو کچھ ہوا وہ میرے بھلے کیلئے ہوا مگر میرا ہی دل جانتا ہے کہ جہاں ہندوستان کی مخصوص فضاؤں کی سیر نے میرے دل اور روح کے لئے سامان مسرت جمع کیا وہاں میرے حق میں کیا کیا کانٹے بوئے۔

یہ میں کہنا بھول گیا تھا کہ مجھ میں اور تقلید میں اور خاص طور پر اندھی تقلید میں جنم کا بیر ہے۔جس دن سے میں پیدا ہوا اس نے میرے لئے ایسے ایسے کانٹے بوئے کہ میرا دل ہی جانتا ہے۔کوئی قوم ایسی نہیں جس پر اس کا داؤں چلا ہو۔یونان میں مصر میں چین میں۔جاپان۔فرانس اور انگلستان جہاں جہاں میں گیا اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ہر جگہ طرح طرح سے میری صورت بگاڑنے کی کوشش کی ہندوستان میں بھی اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔یہاں کے فسانہ نگار بھی اس کا شکار ہوئے میں آپ کو کس طرح سناؤں کہ ان غریب افسانہ نگاروں پر اس ظالم تقلید نے کیا کیا سحر طرازیاں کیں۔افسانہ لکھا اس میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے اپنے نزدیک بڑی مہمان نوازی کی اور یہاں میری حالت یہ کہ روز بروز صورت مسخ ہوتی چلی جارہی ہے اب اگر بہت دن تک یہی حالت رہی اور ایسے کرمفرماؤں کی تعداد بڑھتی گئی تو میرا خدا حافظ ہے۔ہندوستان کو با حسرت و یاس خیرباد کہنا پڑے گا۔آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا ہوگا کہ آخر یہ ہیں کون بزرگ؟ مگر میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا ایک نہیں پچاسوں ہیں جو میری محبت کا دم بھرتے ہیں اور مجھے الٹی چھری سے ذبح کر رہے ہیں۔

خیر۔اسے یہیں چھوڑیئے اس مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے میرے دل میں آبلے پڑتے ہیں۔آنکھوں میں خون اترتا

ہے۔ اس لئے اس تجربے ذکر کو یہیں چھوڑ دیئے۔ اب ذرا میرے تھوڑے سے محسنوں کے نام اور سن لیجئے۔

پریم چندر کا ذکر تو میں نے کئی دفعہ کیا۔ اُن کے میرے اوپر جہاں اور احسان ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ میری رگ رگ میں اُس لطیف احساس کی لہریں دوڑا دیں جسے لوگ عرف عام میں نفسیات کہتے ہیں۔ باتیں سب کرتے ہیں۔ قصے سب لکھتے ہیں۔ اُن میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش بھی سب کرتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف دلچسپی ہی کوئی چیز نہیں۔ دلچسپی میں اُس وقت تک کوئی کیف نہیں جب تک وہ فطرت سے دست بدست ہو کر نہ چلے۔ فطرت کا مطالعہ اور اُسے افسانوں میں شامل کرنے کا دوسرا نام نفسیات ہے۔ پریم چندر نے اور باتوں کے علاوہ اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھا اور اپنے ہر قصہ کو نفسیات میں ڈبو کر ایک دلکش رنگ میں رنگا۔ پریم چند کے علاوہ حامد اللہ افسر بھی میرے ایسے پرستار ہیں جنہوں نے مجھ میں اور نفسیات میں محبت کے تعلقات قائم کئے۔ ہمارے رشتوں کو اتنا مضبوط بنایا کہ وہ جہاں میرے ساتھ چلتے ہیں۔ نفسیات کا ہاتھ میرے گلے میں ہوتا ہے۔ مجھ میں اور میری اس نئی مونس میں اتنی محبت ہے کہ ایک منٹ کو بھی ساتھ نہیں چھوٹتا۔ یوں تو قیسی رامپوری کا نام بھی اس سلسلہ میں لینا ضروری ہے۔ مگر پریم چند اور افسر نے مجھے اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا کہ کسی دوسرے کا نام لینے کو جی نہیں چاہتا۔ اور سچ پوچھئے کہ نام گنوانے پر آجاؤں تو اس سلسلے میں میرے ایسے نادان دوست بہت سے نظر آئیں گے جو نفسیات کی شکل وصورت سے بھی واقف نہیں اور لطف یہ کہ مجھے اور اُسے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زبان سے ان کے لئے کیا بتاؤں کہ کیا نکلتا ہے۔ بس خدا انہیں اس بات کی توفیق دے کہ میری نزاکتوں کا احساس کرنے لگیں۔

اب تک جو داستان آپ نے سنی وہ شاید سب کے لئے دلچسپ نہ ہو۔ مگر میری داستان کا یہ ٹکڑا اتنا دلکش ہے کہ میں خود بھی اس پر فریفتہ ہوں۔

یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ محبت کی حکومت دُنیا کے ہر ذرہ پر ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جو اس لطیف کیفیت سے بیگانہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی پر اس نشہ کا کم اثر ہے کسی پر زیادہ۔ کوئی اسے ایک نظر سے دیکھتا ہے کوئی دوسری سے۔ اُردو میں بھی یہی حالت ہے۔ اُس کے سارے ادب کی طرح شروع کے افسانوں میں بھی وہی اثر تھا۔ عشق ومحبت کی داستانیں تو ضرور تھیں مگر ان میں اکثر کا تعلق بوالہوسی سے تھا۔ محبت کے لوگوں نے صرف ایک معنی سمجھے تھے اور وہ یہ کہ مرد اور عورت میں محبت ہو اور آگے چل کر شادی ہونے کے بعد اس جذبہ کی تکمیل ہو جائے۔ جب شروع شروع میں مجھے ہندوستان کی اس محبت کا سامنا کرنا پڑا تو ایمان کی بات ہے مجھے امریکہ بہت یاد آیا۔ جہاں محبت نے اتنی مختلف شکلیں اختیار کر رکھی تھیں کہ وہاں سے آنے کے بعد بہت دن تک میرے دل پر ان کی یاد تازہ رہی۔ شروع کے دس برسوں تک مجھے

محبت کے اُسی دام میں گرفتار رہنا پڑا جو مشرق کے لئے مخصوص ہے مگر اب کوئی ۵-۶ برس سے محبت نے مختلف شکلیں اختیار کرلی ہیں۔ علی عباس حسینی اور مجنوں گورکھپوری نے محبت کو فلسفیانہ نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ اُن کے خیال کے مطابق اس کی حکومت کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ علی عباس حسینی محبت کو دنیا کے ہر رشتے کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی کو بھائی اور بہن سے۔ دوست کو دوست سے۔ ماں کو بیٹے سے۔ آقا کو خادم اور خادم کو آقا سے جس جس قسم کی مختلف محبت ہوتی ہے اُس کا احساس اُن کے افسانے پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔

مجنوں کی محبت کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ اُن کی محبت پر قدیم محبت کا اثر ہے لیکن اس میں انہوں نے بہت وسعت پیدا کردی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ محبت کے مشتعل جذبات اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ وہ آگ کس طرف لگ رہی ہے۔ شباب کا جوش اور اُس کی نیرنگیاں رشتوں کی قید میں رہ کر اپنا جلوہ نہیں دکھاتیں۔ اُس پر صرف ایک لفظ کی حکومت ہے جس کا نام محبت ہے۔ وہ کسی بارگاہ میں ہو کسی دل پر ہو اُس کے اثر یکساں ہیں۔

یہی محبت ہے کہ جس نے عورت کی فطرت کو میرے ساتھ اس اس طرح وابستہ کیا ہے کہ اُن کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ میرے دل پر عورتوں کی جتنی مختلف تصویریں میرے شیدائیوں نے نقش کر رکھی ہیں اُن کے خاکے ملاحظہ کیجئے۔ افسانہ نگاروں کا ایک گروہ عورت کی اصل فطرت کو اُس کا حُسن سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ اُس کے ظاہری خط وخال پر فریفتہ ہے تیسرا گروہ اُس کی روحانی لطافتوں کا شیدائی ہے۔ بعض افسانہ نگار عورت کو صرف بُرائیوں کا مرکز سمجھتے ہیں۔ غرض خدا جانے کیا کیا ہے۔ عورت ایک ہے اور اُس کی شکلیں اتنی مختلف اور لطف یہ کہ ایک سے زیادہ ایک دلکش۔

اس کے بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جب عورت اور اُس کی فطرت کے حُسن لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرلیتے ہیں تو یہ اثر شاعرانہ لطافتوں کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ عورت کی فطرت نے افسانہ نگاروں کے دلوں کو شاعرانہ خیالات کا مرکز بنایا تو انہوں نے میرے بدن کے ہر حصے کو ان نزاکتوں کا جامہ پہنانا شروع کیا۔ کبھی میرا تن لیا اور اُس میں روح کسی شاعرانہ خیال کی پھونکی کبھی ڈھانچا کسی شاعرانہ خیال کا لیا اور اُس میں روح میری فطرت کی داخل کی۔ بات بات میں شاعرانہ تخیل کا اثر۔ مجھے بھی اس رنگ میں بہت لطف آیا اور میں نے اپنے ایسے پرستاروں کے دلوں پر گہرا قبضہ جمالیا۔ اس وقت قصیدہ خوانی کا تو موقعہ نہیں کہ میں ہر شخص کا نام الگ لے کر اُس کی مخصوص شاعرانہ نزاکتوں کا ذکر کروں۔ البتہ اپنے چند محسنوں کا نام لکھے دیتا ہوں سنئے۔ اس طرز خاص کے موجد تو میرے سرتاج پریم چند ہی ہیں۔ پریم چند کے رنگ میں نئی لطافتیں پیدا کر کے اُس میں نئے رنگ بھرنے کا سہرا نیاز۔ مجنوں۔ اور امتیاز علی تاج کے سر ہے جی میں آتا ہے ایسے لوگوں کے بھی نام لے ڈالوں جنہوں نے شاعرانہ نزاکتوں سے ناتا جوڑا اور میرے سر پر ان کا بوجھ اس طرح لادا کہ یہ نزاکتیں تو دور خود میری

لطافتیں بھی غائب ہوگئیں۔ لیکن بس یہی خیال ہے کہ نکتہ چینیوں سے لوگ میری فطرت کی شگفتگی اور لطافت پر نہ شبہ کرنے لگیں۔ اس لئے ایسے لوگوں کے لئے دعائے خیر کیجئے اور آگے بڑھئے۔ اب میرا دل بھی گھبرانے لگا۔ جی چاہتا ہے کہ اس افسانے کو یہیں چھوڑ دوں مگر جو کچھ اب میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کا تعلق میری گذشتہ زندگی سے ہے۔ دل میں درد ہے اور آنکھوں میں آنسو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہندوستان کی زندگی سے عاجز ہوں۔ اس لئے اپنے پُرانے قصّوں کو یاد کرکے دل بھر آیا۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ ہر شخص کی گذشتہ زندگی میں کچھ نہ کچھ باتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں جن کی یاد آئندہ زمانہ میں دل کو تڑپا دیتی ہے۔

یہ تو میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ جب میں پہلے پہل ہندوستان آیا تو میری طبیعت بہت گھبرائی۔ ہر وقت پرانی باتوں کی یاد دل کو ستاتی رہتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہندوستان کی محبت ایسی بڑھی کہ میں اپنے پرانے عیش و آرام بھول گیا لیکن اب کوئی چھ سات برس سے میرے شیدائیوں نے ایک نئی روش اختیار کی۔ اب تک مغرب کا صرف ظاہری اثر تھا۔ اب مغرب کی روح بھی افسانوں میں داخل ہوگئی۔ چخوف اور اسی طرح کے دوسرے علمبرداروں نے ہندوستانیوں کے دلوں پر اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنی فطرتوں کو بھول گئے۔ میری وہ تصویریں جو انہوں نے اپنے خیال کے مطابق کھینچی تھیں۔ ایک ایک کرکے لانی شروع کیں اور اپنے نگارخانوں کو اُن سے سجایا۔ صرف تورا رنگ آمیزی کردی باقی ساز کا سارا وہی۔ میں اسے بھی محبت کا تقاضا سمجھتا ہوں لیکن اصطلاحوں کے دیوانے اس اثر کو ترجمے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ غرض ان ترجموں کا یہ اثر ہوا کہ مغربی افسانوں کی لطافتیں اُردو کے قالب میں اس طرح آگئیں کہ اور تو اور مجھے بھی پہچاننا دشوار ہوگیا۔ روس۔ فرانس۔ انگلستان اور امریکہ کے علاوہ ایران اور ترکی کے حسین سے حسین مرقعے اُردو کے نگارخانوں میں داخل ہوگئے۔ آپ سب سے پہلے ان مصوّروں کے نام پوچھیں گے۔ لیجئے میں آپ کو ناموں کے ساتھ اُن کے پتے بھی بتائے دیتا ہوں۔ سنئے اگر آپ کو ان مغربی مرقعوں کی تلاش ہے تو امتیاز علی تاج۔ عبدالمجید سالک۔ جلیل قدوائی۔ منصور احمد۔ اور خواجہ منظور کے کھینچے ہوئے مرقعے دیکھئے تصویریں سب مغربی ہیں۔ جو کھٹے انہوں نے اپنے چڑھائے ہیں۔ اب میرے دل کی یہ حالت ہے کہ کبھی مغرب کے رنگ میں سرشار ہوں اور کبھی مشرق کی سادگی اور شاعرانہ لطافتوں پر۔ کبھی بادۂ مغربی کے جوش میں سرشار اور کبھی مینائے مشرق کا فریفتہ کبھی شاہد فرنگ کی شوخیوں کا متوالا اور کبھی محبوبۂ مشرق کی سادگیوں کا دیوانہ۔ میری فطرت بالکل بدل گئی ہے۔ نہ مشرقی جامہ۔ نہ مغربی۔ نہ مشرقی حسن نہ مغربی شوخی۔ اور لطف یہ کہ یہ کچھ نہیں بھی ہے اور سب کچھ ہے بھی غرض عجیب لطف کی زندگی ہے۔ ایران اور ترکستان کی سیر بھی میں نے اکثر سجاد حیدر کے ساتھ بڑے مزے میں کی ہے۔ اسی یکایک تبدیلی کا اثر ہے کہ میری فطرت میں یکسانیت باقی نہیں رہی۔ کبھی انتہائی مسرور ہوں اور کبھی انتہائی مغموم کبھی مسرت و شادمانی چھائی ہوتی ہے اور کبھی حزن و یاس چھایا ہوا ہے۔ اور ایمان؛

کی بات ہے کہ مجھے اپنی شکل اسی وقت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب مجھ پر حزن و یاس چھایا ہوا ہو اور اسی لئے مجھ پر جان دینے والے عموماً مجھے اب ماتمی یا سوگ کا لباس پہنا کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ جنہیں فن کا خیال ہے جنہیں اثر کی تلاش ہے۔ جنہیں لطافتیں پیدا کرنے کی خواہش ہے۔ انہوں نے سوگ سے ناتا جوڑا ہے۔ اور میرے خیال میں لوگ بھی اسی کے عادی ہو گئے۔ اُن کے دلوں پر وہی تصویریں عرصہ تک نقش رہتی ہیں جن میں میں ماتمی لباس پہنے ہوئے ہوں .....

اُف مجھ میں اب طاقت نہیں کہ اس قصہ کو آگے بیان کرسکوں۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ خوشیوں کی جگہ غموں نے لے لی چاہتا ہوں کہ اس قصہ کو ختم کردوں مگر طاقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اپنی زندگی کا وہ حصہ بیان کرنا ہے جو آج کے بعد آنے والا ہے۔ لیکن اس کے لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے۔ اور یہاں دل قابو میں نہیں۔ ہاں دلوں کی خلش مٹانے کے لئے صرف اتنا اشارہ بتائے دیتا ہوں کہ اُردو کے ہاتھوں میرا انجام بہت اچھا ہونے والا ہے۔ اُردو کے افسانہ نگاروں نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کئے۔ میری زندگی کو بے حد خوش گوار بنایا اور اُس کے لئے میرے بدن کا تار تار اُن کے لئے دستِ بدعا ہے .... اچھا رخصت

یار زندہ صحبت باقی

سید وقار عظیم۔ ایم۔ اے

کشش

(سی۔ آر۔ داس)

جس طرح شعر کہنے میں محو شاعر اپنے اشعار بار بار اٹھاتا ہے۔ ان کو پڑھتا ہے اور پھر رکھ دیتا ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اے میرے محبوب! میں تیرے حُسنِ بے مثال کو بار بار دیکھتا ہوں ——— اور چلا جاتا ہوں۔ اور پھر واپس آکر سے تیرے سامنے تیرے عشق کے گیت گاتا ہوں ———

شاعری شاعر کی روح ہے ——— اسی میں شاعر کے لئے کشش ہے ——— وہی اس کو اپنی طرف مائل کرسکتی ہے، مگر تو مجھے کس کشش سے اپنی طرف کھینچتا ہے؟ اے محبوب! کس کو معلوم ہے ——— کون جانتا ہے کہ تو بھی کسی زبردست کشش کا مالک ہے۔

مترجمہ
ایم۔ حبیب احمد بنگالی

پودے کا روگ

پردیس میں پاگل ہوں تنہا — بتلاؤں کسے میں اپنی بپتا

دن رات وہیں پہ ہوں جہاں میں — پھیلا نہ بڑھا، پھلا نہ پھولا

بس ایک ہی رُت ہی مجھ پہ طاری — اُترا نہ جو رخت میں نے اوڑھا

اس دھوپ سے زنگ برگ سے ہوں — بیمار، نزار، زرد، روکھا

لہرائے کہیں جو اس فضا پر — تو لاگ سے سُوکھ جائے جھالا

پتوں کو مرے پتہ نہیں کچھ — کیسا ہے خنک ہوا کا پنکھا

اِک بوند بھی کی طلب جو میں نے — تو آنچ سے باغباں نے سینچا!

نس نس میں اِک آگ سی بھری ہے — ہر پور پہ ہے اُسی کا لاشا

نورس ہیں ہر اک چمن کے ریشے — ناسور ہے میرے دل سے رِستا

اوروں کے مسام تک بھی شاداب — کونپل بھی مری بغل میں کانٹا

رسیائی ہوئی ہیں اُن کی کلیاں — مرجھائی ہوئی ہے میری کایا

بیلوں میں وہاں لہک ہے جیسے — اے کاش! یونہی میں لہلہاتا

مہکی ہیں فضائیں جیسے اُن کی — یہ کُنج بھی اُس طرح مہکتا

دُور، آڑ میں، اُس لکیر کے پار — سُنتا ہوں کہیں اُدھر ہے برکھا

ایسا نہ ہُوا کہ اس طرف بھی — لے آئے صبا اُڑ کے چھینٹا

افسوس! کہ میری ڈالیوں پر — چہکا نہ کبھی کوئی پپیہا

پچنے کو ترس گئیں یہ شاخیں — بھُولے سے نہ آئی کوئی شاما

اس پر یہ ستم کہ خستگی میں — حسرت کا سماں ہے جبکہ چھایا

خواہاں ہے یہ خوشہ چیں کہ از خود — ہو جاؤں ہرا بھرا میں پیاسا!

یوں اپنے تئیں شگفتہ کرلوں — انبار ہوں برگ و بر کے پیدا

ٹپکاؤں میں جھولیوں میں اُس کی — جگ بھر کے پھل اور پھُول اکیلا!

پودے ہیں کئی طرح کے یُوں تو — بھاری ہے کوئی تو کوئی ہلکا

قلمی ہے کوئی تو کوئی بے رُت — کڑوا ہے کوئی، کوئی رسیلا

گُلدان سے ہے کسی کو گر لاگ — تو راس نہیں کسی کو گملا

نچا ہے کوئی، تو کوئی گنجان — روگی ہے کوئی، کوئی توانا

ہاں! یہ تو کہو کہ مجھ سے پہلے — ایسا بھی سُنا ہے کوئی پودا؟

حسن لطیفی

افسردہ خاطر

صبح صادق کے وقت ایک نوجوان مرد اور ایک جواں سال دوشیزہ واشنگٹن پارک کے مغربی کونے پر آ کر رُکے۔ وہ چلتے چلتے رُک گئے کیونکہ لڑکی فضا میں بہار کے آثار محسوس کر کے یکایک حیرت سے اُچھل پڑی۔ اُفقِ مشرق پر مکانوں اور دریا سے پرے ایک ہلکا سنہری رنگ چمک رہا تھا۔ اُن کے آگے پیچھے اور اوپر رات کی تاریکی مدھم پڑ رہی تھی لیکن زمین آسمان سے زیادہ تاریک معلوم ہو رہی تھی۔ درختوں کے درمیان لیمپ ابھی تک جل رہے تھے۔ اور ان کے غیر متناسب سائے زمین پر ادھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ ارد گرد کے مکانات کی دیواریں بھی ہنوز سوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

پارک کے وسط میں جہاں فوارہ کا پانی کھیل رہا تھا۔ کوئلے کی بھٹیوں کی ایک قطار تھی۔ جن میں سے ہلکے سیاہ رنگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اور ان کا نیلا دھواں حلقوں کی شکل میں اوپر کو اُٹھ رہا تھا۔ آگ کے سامنے مزدوروں کے چہرے سیاہ معلوم ہو رہے تھے۔ زندگی ایک کامل گہرے سکوت میں غرق تھی۔ اگرچہ دو چار سحر خیز پرندے راگ الاپنے لگے تھے اور مشرق و مغرب میں ایک ہلکی۔ دھیمی سی گونج شہر کی بیداری کی خبر دے رہی تھی۔

آج سحر میں اک شان تھی۔ اک سنہری کیفیت۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے کا سارا شہر بیدار ہونے کو ہے کہ تازہ نکلتے ہوئے سورج کو خوش آمدید کا گیت سنانے کے لئے مکانوں کی چھتوں پر جمع ہو جائے!

"تم۔ کیا تم خوش نہیں ہو سے ہم نے کوئی تانگا کرایہ پر نہیں لیا؟" لوگ نے ایک کانپتی۔ رقصاں نرم نغمہ ساز آواز میں پوچھا اور فضا کے سکوت میں حرکت پیدا ہو گئی۔

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ ہم اس پر سے یہ سہانا منظر کبھی نہ دیکھ سکتے تھے۔"

"اچھا!" اُس نے ایک جماہی کو روکتے ہوئے کہا۔ لیکن لڑکی نے بے چینی سے چیخ کر کہا۔

"ادھر دیکھو۔ کس طرح یکے بعد دیگرے۔ شاخوں میں روشنی کے نکتے غائب ہو رہے ہیں اور فضا میں ایک عجیب خلا سا چھوڑ رہے ہیں۔ شاید روشنی جلانے والا روشنی بند کر رہا ہے"! تم نے کچھ جواب نہ دیا اور دونوں خاموش کھڑے رہے لیکن جلد ہی لڑکی نے سلسلۂ کلام کو دوبارہ چھیڑتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ اس قدر تازہ اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا دُنیا آج صبح ہی پیدا کی گئی ہے"! دفعتہً بُلم نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت ایک خوبصورت ساحرہ معلوم ہوتی تھی۔ عریاں سر پر رات کی طرح سیاہ بال، سیاہ آنکھیں جن میں سے چمکدار نورانی کرنیں نکل رہی تھیں، اونچی پیشانی نیم عریاں ہونٹ سُرخ قدرتی رنگ کے۔ سفید مرمریں چہرہ۔ کھلے ہوئے ہونٹ غیر معمولی طور پر خوبصورت۔ چمکتے ہوئے اور تیز کاٹ نے والے دانتوں کو ظاہر کر رہے تھے۔ اور آنکھوں کے تیر نشتر جیسے تیز تھے اور اُس کے ڈھلواں کندھوں پر چیتے جیسے داغوں والا ایک خوبصورت کوٹ پڑا ہوا تھا! ـــــــ الغرض وہ پرستش کی حد تک محبت کئے جانے کے لئے بنی تھی اور اب جب کہ وہ خواب و خیال کی دنیا میں محو وہاں کھڑی تھی۔ اس کی کوئی حرکت اُس کے اعضا کی کوئی معمولی سی جنبش بھی اندازِ حُسن سے خالی نہ تھی۔ بلکہ اپنے اندر خاص معنویت اور شعریت رکھتی تھی!

چنانچہ بُلم بالکل بھول گیا کہ وہ تھکا ماندہ بھی تھا!

"تمہاری کیا عمر ہے رُوک؟" اُس نے پوچھا

"گویا تمہیں خود معلوم ہی نہیں! واہ!"

"نہیں۔ پھر بھی ایک دفعہ اور بتا دو۔ ضرور، رُوک"

"۲۲ برس"

اُس نے اپنی نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور بے ربط طور سے کہنے لگا۔

"مَیں نے کبھی اس سے بڑھ کر خوبصورت سحر نہیں دیکھی!"

"اور نہ میں نے!" رُوک نے مشرق کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی تاریک رات، جس کے عین نیچے" سورج طلوع ہو رہے ہیں!"

"دو سورج؟" اُس نے حیرانی سے مُڑ کر پوچھا۔

"ہاں دو سورج!" اُس نے کامل سنجیدگی سے کہا۔

"تم سمجھتے ہو گے کہ تم بہت چالاک ہو؟"

"مَیں سمجھتا ہوں کہ تم سحر ساز ہو!"

"اگر تم نے اور چھیڑ چھاڑ کی ـــــــ"

"تو؟"

"ہم گھر چلے جائیں گے!"

"بس ٹھیک ہے! آؤ چلیں رات بھر گرم روشنی میں دیوانوں کی طرح ناچتے رہنے کے بعد اب ہمارے لئے گھر جانا ہی بہتر ہے!"

"آہ! نہیں ہم ———— اُس نے ایک نرم و شفاف قہقہہ لگا کر کہا ———— آؤ یہاں بیٹھ کر طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھیں۔ سچ جانو میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ دیکھو فضا کیسی خوشگوار ہے۔ شفاف آسمان! اور ناچ کے بعد یہ کامل سکوت! ہم۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ!"

کچھ بڑبڑانے کے بعد آخر وہ بیٹھنے پر رضامند ہو گیا۔ دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور خاموشی سے بےحس و حرکت بیٹھے رہے! ———— غیرمرئی و غیرمحسوس طور پر ہوا لطیف ہونے لگی۔ ایک تازہ حرکت اُن کے اردگرد تھرتھراتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اور اُفقِ مشرق پر گلابی رنگ جھلکنے لگا۔ یکایک اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ہوا کی معطر خوشبوئیں اُس لطیف خوشبو سے مل کر جسے وِک استعمال کرتی تھی۔ اُس کے حواس پر چھا گئیں۔ اُس نے پھر اُس کی طرف غور سے دیکھا تو اُس کا چہرہ ملول و افسردہ تھا۔ اور اس کی آنکھیں رُکے ہوئے آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھیں!

"کیوں وِک یہ کس لئے؟"

"آہ! ہم میں بہت افسردہ خاطر ہوں!" اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"پیارا۔ ننھا نازک ہاتھ!" اُس نے آہستگی سے اسے چومتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا!

"آخر بات کیا ہے؟ کیا کوئی مالی معاملہ ہے؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگرچہ میرے پاس دولت کی کمی بھی ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ میں نے اس ہفتہ میں تین دن کام کیا اور اب جب کہ تصویر ختم ہو چکی ہے ہفتہ دو ہفتہ تک شائد اور کوئی ممکن نہ ہو سکے۔ آہ! یہ متحرک تصاویر!"

"تم گھر پر تو بہت خوش و خرم ہو گی۔ میری ننھی منھی بلبل!"

"خوش و خرم! ہرگز نہیں والد یہ لڑاتی رہتی ہوں شہر کی ملکۂ حسن مشہور اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بیتاب و بیقرار اور خوبصورت بننے اور حسین دکھائی دینے کا جنون ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔"

"ہیں۔ تو کیا تم کبھی خوبصورت اور حسین بھی تھیں؟"

"لوگوں کا تو یہی خیال تھا!"

"ہم مذاق۔ کور ذوق۔ ظاہر بیں لوگ! لیکن یہاں ایک ظالم اور بڑے شہر میں گم شدہ حقیر بیکس اور تنہا!؟"

"یہ شہر تو میرا اپنا شہر ہے۔ مجھے یہاں کے ایک ایک پتھر سے اور اس کے تمام لوگوں سے محبت ہے!" اُس نے فخریہ انداز سے کہا۔

"تب تو میرے لئے بھی کچھ اُمید باقی ہے۔ میں بھی انہیں میں سے ایک شخص ہوں!"

"تم؟ تم حیوان ہو حیوانوں میں سے ایک حیوان۔ اور تم مغرور ہو ——— اور حسین!"

وہ واقعی حسین تھا۔ اس کی نیلی سرد آنکھیں تھیں۔ گلابی رخسار اور سیاہ بال تھے۔

"لیکن میں اپنے شہر میں ملکۂ حسن بننے کی بجائے ——— لڑکی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ——— یہاں ایک مفلس ایکٹرس بننا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ کیونکہ اگر میں وہاں ہوتی تو ایک قلاش آرٹسٹ کے ساتھ واشنگٹن پارک میں طلوعِ سحر کا منظر ہرگز نہ دیکھ سکتی!"

"اور اگر تم اپنے شہر میں ہوتیں تو میں خوابِ راحت میں سویا پڑا ہوتا۔ اور ایک رذیل شب آوارہ کی طرح نہ پھرتا!"

"اُس نے بھڑک کر کہا "کیا پروا ہے بھلا تمہیں! تم تو اُس بھورے بالوں والی لڑکی کو ہی حسین سمجھتے ہو!"

"کون بھورے بالوں والی لڑکی؟" اُس نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"کون بھورے بالوں والی لڑکی! تو تم اُس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"مجھ میں اتنی طاقت کہاں!"

"لیکن اُس کے پاس تو کافی روپیہ ہے!"

"اچھا!"

"اگر مرد میں مجھے کوئی بری بات لگتی ہے تو یہ اس کا غرور ہے!"

"تو کیا میں مغرور ہوں۔ خوبصورت پھول؟"

"بیشک لیکن میں اسی غرور کو پسند بھی کرتی ہوں ——— تمہارے اندر!" اُس نے پُر از مسرت قہقہہ لگا کر اور اس کے ہاتھ کو دبا کر کہا۔

"کتنا اچھا طریقہ ہے میرے علاج کا!" اُس نے زیرِ لب کہا ———

"وہ کس بات کے منتظر ہیں؟ لڑکی نے پوچھا۔

"کون؟"

"لوگ جو سورج کو راہ دکھاتے ہیں تو وہ طلوع ہوتا ہے۔ یہ سست ترین طلوعِ خورشید ہے۔ جو آج تک میں نے دیکھا ہو!"

"جس کیتلی کو ہم نگاہ میں رکھیں وہ نہیں اُبلتی!"

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سر نیچے جھکا کر غمگین آواز میں کہا۔

"آہ! ٹم میں بہت افسردہ خاطر ہوں۔ میں عمر بھر کبھی اتنی پژمردہ نہیں ہوئی!!"

"بیشک۔ مگر یہ معنی نہیں! وک دیکھو۔ ضرور تم کو مجھے بتانا ہو گا! کیا تم مجھے ہر ایک بات نہیں بتاتی ہو؟"

"ہاں ہر ایک بات! دنیا میں کوئی اور ذی روح نہیں جس سے میں اپنا دلی راز کہتی ہوں لیکن میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم جو مجھ پر ہنستے ہو۔ میرا مذاق اڑاتے ہو مجھ میں عیب نکالتے ہو اور مجھے اُن پر ملامت کرتے ہو۔ تم! وحشی۔ جاؤ نہیں بتاتی!"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اور اس کے قریب سرک گیا——

"لیکن وک۔ بہرحال یہ ذرا سی بات تو بتاؤ۔ بس یہی ایک!"

وہ اُس کی طرف دیکھ کر جواباً مسکرانے لگی——

"اچھا! اپنا ہاتھ دکھاؤ مجھے!" اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فی الفور اُس کی شہادت کی انگلی کو دانتوں میں لیکر اس زور سے کاٹا کہ وہ تلملا اٹھا۔ دانت واقعی کاٹنے میں خوب تھے!

"یا اللہ! او میری ننھی سی چڑیل!" اُس نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھا۔ اب تو اخلاق سے پیش آؤ گے نہ؟"

"اوہو۔ اب میں سمجھا تم مجھے ٹم کیوں کہتی ہو۔" اُس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ"

"وک۔ ٹم!(بمعنی صید شکار)

وہ مبہوت اور حیرت زدہ تھی۔ اور اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے!——

"لیکن کیا تم نے یہ ابھی ابھی حل کیا ہے؟"

"ابھی ابھی! اگر کیا تم نے کسی خاص مقصد سے ایسا کیا ہے؟" اُس نے حیرت سے تکتے ہوئے کہا۔ اس پر لڑکی انتہائی ہنسی سے کانپنے لگی——

واہ خوب! کیا خوب! اور میں تمہیں اپنے سے چالاک اور ہشیار سمجھتی رہی ہوں! خوب۔ بہت خوب۔ تو کیا میں یونہی مغالطے میں رہی؟ اتنے کند ذہن کو پورے ایک مہینے میں یہ بات معلوم ہوئی! یا اللہ! اس بیچارے کند ذہن تیلاش آرٹسٹ پر رحم کر! توبہ! توبہ! مجھے کس قدر مغالطہ ہوا! الٰہی اس پر رحم کر!

اس کا سر ندامت اور احساسِ شکست سے نیچے جھک گیا۔ اور کچھ عرصے بعد اُس نے تحت آواز میں کہا: اب غور فضول ہے کیونکہ غبارے میں سوراخ تو ہو ہی چکا!"

اُس کے چہرے پر پھر حزن و ملال کا رنگ چھا گیا۔ وہ تفکر میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف دیکھنے لگی اور ایک آہ بھر کر کہنے لگی:۔

"رحم آہ! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!"

"لیکن مجھے اس کی وجہ بتاؤ؟"

"اچھا تو سنو۔ یہ مسٹر ــــــــ اوکلے کی بابت ہے"! اُس نے شرم کے انداز میں ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کیا؟" ــــــــ اس کی آنکھوں میں آنسو پھر جمع ہو گئے ــــــــ

"رحم! کیا تمہارے خیال میں ــــــــ"

"میرے خیال میں کیا؟"

"مجھے مسٹر اوکلے سے شادی نہ کرنا چاہیئے!؟"

"اس سے تمہارا مطلب؟ شادی اور اُس بوڑھے کے ساتھ!؟ اُس نے حیرت اور غصے سے کہا۔

"لیکن وہ کچھ اتنا بوڑھا تو نہیں ہے"۔ اُس نے باصرار کہا۔

"وہ ۴۴ سال کا بوڑھا! تم بائیس سال کی دوشیزہ! تم سے دوگنا! اتنا بوڑھا کہ اس پر تمہارا باپ ہونے کا شبہ ہو! تاہم تمہارا اصلی مطلب کیا ہے؟

"میں چاہتی ہوں کہ مرد بوڑھے ہوں!"

"تاکہ تمام عمر تم بچی رہو۔ تمہاری نگرانی ہوتی رہے۔ اور بچوں کی طرح تمہیں تھپکیاں دے دے کر بہلایا جائے! کیا تم کبھی معمر نہ ہو گی؟ مسٹر اوکلے! توبہ! تو کیا وہ بوڑھا تمہیں پھر تنگ کرتا رہا ہے؟"

"تنگ؟ اس سے تمہارا مطلب؟

تمہارے ساتھ باتیں کرنا۔ گھٹنوں کے بل تمہارے سامنے جھکنا اور ایک احمق کا پارٹ ادا کرتا رہا ہے! مجھے یقین ہے اس ناچ میں ضرور کچھ ہوا ہوگا۔ آہ! میں بُری سے بُری بات بھی سننے کو تیار ہوں!

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ تم مجھے ملامت کرو گے"! اُس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"بتاؤ خدارا جلد بتاؤ۔ اُس نے تم سے کیا کچھ کہا؟"

"سمجھا۔ تم ایسی بیوقوف ہوں۔ لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ وہ ـــــ بیچارا رونے لگا تھا؟"

"بیچارا احمق! نہیں وہ اکیلا نہیں! شاید تم دونوں ہی! کیا تمہیں تو رونا نہ آیا تھا؟"

"یونہی تھوڑا سا!" اُس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا خوب! تم دونوں محفلِ رقص میں بیٹھے رویا کئے! بچوں کی طرح! خداوندا مجھے حیرت ہے کہ تم دونوں میں سے بڑا احمق کون ہے!" ـــــ اس نے کمال سنجیدگی سے اُس کے قریب ہو کر کہا ـــــ "لیکن سچ بتاؤ۔ تم نے اسے کوئی وعدہ بھی کیا تھا؟"

وہ کوئی خاص پختہ وعدہ تو نہ تھا! میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یوں ہونا چاہیئے تو ہونا چاہیئے!"

وہ کوئی خاص پختہ وعدہ تو نہ تھا۔ یوں ہونا چاہیئے تو ہونا چاہیئے۔" ـــــ وہ سراسیمہ و مضطرب تھا۔

میرے خیال میں اگر تم دونوں کو شادی کا لائسنس مل جائے اور اگر پادری تمہیں میاں بیوی کہکر پکارے تو تم محسوس کروگے کہ تم پورے طور پر میاں بیوی نہیں ہو! اچھا تو تمہاری نسبت ہنری اوکلے سے ہو چکی ہے؟"

اُس کے گلابی رخساروں کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اُس نے پھولی ہوئی سانس میں کہا "نہیں!"

"ضرور ہو چکی ہے! کیا اُس نے تمہارے نازک لبوں پر پیار نہیں کیا؟"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حواس قائم نہیں ـــــ "نہیں تو! اُس نے میرے لبوں کو نہیں چوما! اُس کی اتنی جُرأت نہ تھی!"

وہ ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگا پھر اپنا سر اٹھا کر بلند مسرور قہقہوں سے ہنسنے لگا۔

"اس کی اتنی جرأت نہ تھی! کتنی عجیب بات ہے! توبہ! توبہ! تو کیا یہ بغیر بوسوں کے ہونے والی شادی ہے؟"

"اُس نے تیزی سے جواب دیا ـــــ میرے خیال میں یہ کوئی ایسی قابل مذاق بات تو نہیں! اس میں ہنسنے کی کونسی ضرورت ہے؟"

قابلِ مذاق تو ہے ہی! بلکہ نہایت ہی دلچسپ! شادی اور بغیر بوسوں کے! تم نہیں جانتی کہ تم کیا کر رہی ہو! اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کر رہی ہو جس کی بیوی مر چکی ہے۔ اور اس کا ایک بچہ ہے! اور میرا خیال ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کے بچے کی نگہداشت کے قابل بھی سمجھتی ہو!؟"

وہ اب سچ مچ بہت عاجز اور بیکس معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے افسردگی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے اندوہگیں آواز میں کہا ـــــ "تم! میں جانتی تھی کہ تم مجھے ملامت کروگے!"

"تو پھر تم ایسی باتیں ہی کیوں کرتی ہو؟" اُس نے درشت لہجہ میں پوچھا۔

اس کا ہاتھ تھام کر اور اس کی طرف ملتجیانہ انداز سے دیکھ کر ——— "خدا کے لئے ! تم ! کیا تم سمجھنے کی کوشش کرو گی ؟
——— آنسوؤں کی کثرت سے وہ دیکھ نہ سکتی تھی ——— اس کا برتاؤ میرے ساتھ کتنا اچھا رہا ہے ! اُس نے میرے ساتھ اس شہر کے سب لوگوں سے بڑھکر عمدہ سلوک کیا ہے" !

"اور کوئی تمہارے ساتھ لطف سے پیش آیا ؟"

"مسٹر اوکلے کی طرح کوئی نہیں ، تم خود جانتے ہو کہ تم بھی نہیں ! اور سچ پوچھو تو تم نے میرے ساتھ کبھی عمدہ سلوک کیا ہی نہیں ، تم مجھے ملامت کرتے ہو مجھ پر ہنستے ہو ، میرا مذاق اُڑاتے ہو ۔ مجھے طرح طرح کے ناموں سے بلاتے ہو" ———

"اور یہ بیچارا بوڑھا ؟"

"اُس کی آواز میں لرزش تھی ——— " اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت عمدہ رہا ہے ۔ وہ مجھے کہیں باہر بھی لیگیا تو تنہا چھوڑ دیا ۔ اور میرے لئے چیزیں خرید کر لا یا ۔ اور جب میں غصہ کی حالت میں ہوں یا بیمار تو اس کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے ؛ وہ مجھے کبھی ناراض نہیں کرتا ———"

"کیا تم مرنے کے بغیر اس کے ساتھ صرف آدھ گھنٹہ بھی بات چیت کر سکتی ہو ؟"

"بالکل نہیں ، ابھی تو میں اُسے تھیئٹر جانے پر رضامند کر لیتی ہوں تاکہ اُس کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہ ملے" !
اُس نے نہایت سادگی سے جواب دیا ۔

"اور پھر تمہارا اس کے ساتھ شادی کا خیال ؟"

"میں اس کے ساتھ محض گفتگو کے لئے شادی نہیں کر رہی" !

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تم اُس سے اس لئے شادی کر رہی ہو کہ وہ تمہاری دیکھ بھال کر سکے ! وہ تمہیں تنہا چھوڑ دیتا ہے ۔ واہ وا ! کتنا اچھا آدمی ہے تمہارے لئے ! آدھا وقت تو وہ تمہارے ساتھ بچوں کا سا سلوک کرتا ہے اور آدھے وقت میں اس طرح کہ گویا تم ملکہ حسن ہو ! اور تم اسے پسند بھی کرتی ہو ! لیکن وہ تمہارے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہیں کرتا ۔ جو عورتوں کے لائق ہے" !

"کیا تمہیں اپنے انتخاب پر شرم محسوس نہیں ہوتی ؟"

"اُس نے مانتے ہوئے کہا ——— " ہاں تھوڑی سی ! لیکن تمہیں اس کے متعلق اس قدر رذیل رویہ اختیار نہ کرنا چاہیئے اور نہ میں اتنی بُری ہوں ۔ جتنا تمہارا خیال ہے" !

"نہیں بلکہ بدترین تمہارا دل ریشم کی طرح نرم ہے مگر میرے لئے نہیں ! میرا خیال ہے کہ اگر میں بھی ایک کمزور ۔ کانپتا ۔

رزتا ہوا بوڑھا ہوتا۔ اتنا بوڑھا کہ گوشت کھانے سے بھی لاچار ہوتا۔ تو تم مجھ پر بھی رحم کھالیتیں اور میرے ساتھ محض میری التجائے سوال کی بنا پر شادی کر لیتیں!"

"نہیں۔ تمہارے ساتھ تو کبھی نہیں! کیونکہ میں تمہیں بخوبی جانتی ہوں! اور نیز ۴۴ برس کا انسان کچھ اتنا کانپتا ہوا بوڑھا بھی نہیں ہو سکتا!"

"اُس کی حالت پر اس قدر رحم دلی کا اظہار مت کرو!"

"اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری تھے ——— "آہ! کروں کیوں نہیں! بیچارہ! تم کیا جانو کہ وہ کس قدر تنہا ہے! اور اُداس! کیونکہ کوئی اُس سے محبت کرنے والا نہیں! اور اُس کے بچے کا محافظ! جب وہ یہ ذکر کرتا ہے تو میرا دل بھر آتا ہے۔

"تمہاری شادی کے بعد تو اس کا بچہ اتنا بھولا بسرا نہ رہے گا! بخدا! میں اب بھی تمہیں بچے کی نگہداشت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں!"

"تو ہم ایک ملازمہ رکھ سکتے ہیں!" اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"اوہو! ہم! اگر تم جانتی نہیں ہو کہ وہ خود غرض شخص ہے!"

"خود غرض! نہیں ہرگز نہیں! میں بخوبی جانتی ہوں!"

"وہ ہے! وہ چاہتا ہے کہ کوئی اُس سے محبت کرے۔ وہ ایک دوشیزہ کی حیات کو تباہ کرنا چاہتا ہے! تاکہ وہ آرام اور چین دیکھ سکے! لیکن تمہیں اس شادی سے کیا حاصل ہوگا؟"

اُس نے عاجزانہ انداز سے کہا ———"میں پہلے ہی جانتی تھی"

"تم کیا جانتی تھیں؟"

"کہ تم مجھے ملامت کرو گے!"

وہ بے بس اور لاچار ہو کر پیچھے کو جھک گیا۔ اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"وک رُستو۔ ——— اُس نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے دبایا ——— اب سچ مچ تم سے میں ایک بات پوچھوں گا اور پھر تمہیں کبھی تنگ نہ کروں گا!"

"تنگ نہ کرو گے؟ تو اور تم کیا کرو گے؟" اُس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"گھر جا کر آرام کروں گا!"

"اور تم مجھ سے آیندہ کبھی نہ ملو گے؟"

"کیا تم خود نہیں جانتیں کہ یہ ناممکن ہے!"

"نہیں میرے خیال میں ناممکن نہیں!"

"لیکن پھر تو تم اپنے دلی راز اُسے بھی بتا سکو گی؟"

"نہیں! میں ضرور نہیں ہی بتاؤں گی!"

"اپنی شادی کے بعد بھی؟"

"تو اور کیا نہیں!" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ———!

"وک! تم ——— تم ہو ——— بتا دوں کیا ہو تم؟ یا اللہ!"!؟

"تم! تمہارا یہ مطلب ہرگز نہیں! تمہیں اس طرح گفتگو نہ کرنی چاہیئے! میں اسے برداشت نہیں کر سکتی! اگر مجھے یقین ہو گیا تو تمہیں آیندہ کبھی نہ دیکھوں گی!"

"اچھا تو ہم یہ ذکر نہ کریں گے! مگر خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ کیا تمہیں اُس سے محبت ہے یا نہیں؟"

"نہیں مجھے اُس سے محبت نہیں!"

"اور پھر بھی تم اُس سے شادی کرو گی؟"

"لیکن تم! تمہیں معلوم ہے کہ میری فطرت بھی تم جیسی ہی ہے! میں محبت کر ہی نہیں سکتی! اس نے نہایت عمدگی سے جواب دیا!"

"وہ کیوں"

"ہم آرٹسٹ اصل میں محبت کر ہی نہیں سکتے! ہم محض تخیل کی مدد سے خوبصورت چیزیں پیدا کرتے ہیں اور اُن سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اُن چیزوں میں بقا اور اصلیت نہیں ہوتی!"

"کیا سچ مچ"

"کیونکہ ہم صرف اپنی ذات سے محبت کر سکتے ہیں!"

"ہاں! اس میں کچھ اصلیت ہے! ہم نرگس کی طرح ہیں!"

"وہ کون تھا؟"

"وہ ایک یونانی جوان تھا جس نے ندی کے پانی میں اپنا عکس دیکھا اور اس سے محبت کرنے لگا۔ اور بالآخر ندی ہی میں

گر پڑا۔ اس میں سے ایک پھول اُگا اور وہ پھول آرٹ تھا! ——— اچھا تو تم کبھی محبت کر ہی نہیں سکتیں"؟

"کتنی اچھی کہانی ہے! نہایت خوبصورت! پیارے نرگس!

"نہایت! محبوبہ نرگس!"

"کتنے کمینے ہو تم!" اُس نے نرم شیریں قہقہہ لگا کر کہا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے ———

"تو تمہارے خیال میں میں محبت نہیں کر سکتا؟" اس کی آواز میں لہریں نغمہ ریز تھیں۔

ہاں تم محبت کرنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ تم اپنے کام سے محبت رکھتے ہو اور بس ——— وہ معنی خیز انداز سے شرارت کے طور پر ہنسنے لگی ——— لیکن تم مجھے اپنا مدِمقابل پاؤ گے۔ میں بعینہٖ وہی ہوں جو تم ہو!"

"شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات اس قدر خوشگوار ہیں!"

"خوشگوار! ہم پانچ منٹ بھی گفتگو کریں تو ناممکن کہ آپس میں لڑ جھگڑ نہ لیں!"

"وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی روشنی چمک رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک چھیڑنے کا انداز رقصاں تھا!

"سچ کہا! تم سحر کار حسینہ ہو۔ خوبصورت جادوگرنی!" اس نے حیرت سے ملی ہوئی آہستہ آواز میں کہا وہ چونک پڑی اور قدرے سراسیمہ ہو گئی ——— "تم! کیا کل رات میں حسین معلوم نہ ہوتی تھی؟"

دفعتہً اُس نے اُس کی طرف مڑ کر دیکھا ——— حسین؟ اور تم؟ اس قدر غیر دلچسپ اور بے کیف چہرے کے ساتھ؟

"اونہہ۔ سچ سچ بتاؤ نا!"

"تم معلوم ہوتی ہو ——— کریہہ صورت!"

"اُس نے بسورتے ہوئے غمگین آواز میں پوچھا ——— "کیا مطلب ہے تمہارا اس سے؟"

"مطلب؟ یہی کہ اگر تم حسین ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھتا! مرد کسی حسین عورت سے خوش اخلاقی نہیں برت سکتا۔ وہ ہر وقت مغرور رہتی ہے اُس پر حکومت کرتی ہے اور اُسے غلام بنا لیتی ہے۔ لیکن معمولی شکل و صورت کی عورت ———"

"وہ کیا کرتی ہے؟"

اُسے اگر کسی مرد کا خیال ہو تو وہ اُس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے عمدہ سلوک روا رکھتی ہے۔ اور وہ اُس سے گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ جس طرح میں اب تمہارے ساتھ گفتگو کر رہا ہوں۔ بس اسی طرح وک!

کیا میں سچ مچ اتنی بدشکل صورت ہوں؟ بیشک میں اتنی خوبصورت نہیں ——"

"اور وہ عورت ہو بھی کیسے سکتی ہے جس کی ناک گولائی لئے ہوئے ابھری ہوئی ہو"

"گولائی لئے ابھری ہوئی؟" اس نے ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے غمزدہ آواز میں کہا۔

"تو اور کیا؟ اس کا سرا عین چینی کی شکل میں پھیلا ہوا ہو!"

اُس نے جلدی جلدی سانس لیتے ہوئے کہا —— "میں ہمیشہ سمجھتی رہی ہوں کہ میری ناک ٹھیک نہیں ہے لیکن اب تم نے یہ جتلا کر مجھے کامل طور پر افسردہ خاطر اور اندوہگین بنا دیا ہے! میرا دل بے طرح رونے کو چاہتا ہے! وحشی! درندے! —— اس کی آنکھوں میں واقعی آنسو اکٹھے ہو رہے تھے!

"لیکن تم اپنے آپ کو وہی کیوں نہیں سمجھتی ہو جو تم حقیقت میں ہو؟ تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ تم ایک ایسی چیز بن جاؤ جو تم دراصل نہیں ہو؟"

"لیکن متحرک تصاویر میں اور اپنے شہر میں ——"

"بیہودہ! تم ان لوگوں پر یقین رکھتی ہو! کور ذوق - بد مذاق اور بس!"

"تم!" وہ خاموش تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی - وہ اپنے ظالمانہ تبسم کو چھپانے کے لئے دوسری طرف دیکھنے لگا ——"بہر حال" —— اُس نے سرگوشی میں کہنا شروع کیا۔

"کیا؟"

"بہرحال۔ مسٹر ادکلے تو مجھے خوبصورت خیال کرتا ہے!" اُس نے ایک سسکی کو روکتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ادکلے! وہ لڑکھڑاتا ہوا بڈھا!" اور قہقہوں پر قہقہے لگانے لگا۔

"وہ اتنا لڑکھڑاتا تو نہیں!"

"وہ پژمردہ ہے مرجھایا ہوا!"

"نہیں وہ ایسا نہیں! تاہم وہ تمہاری طرح کسی کی توہین تو نہیں کرتا!"

"آہ! کیا میں نے تمہارے ننھے ننھے دل کو تکلیف پہنچائی ہے؟" —— اس نے ماں کے بچے کو چمکارنے اور پیار کرنے کے انداز میں کہا اور اس کے ہاتھ ننھے سے نازک ہاتھ پر پیار کرنے لگا ——

"کیا میں اتنا شریر تھا! کیا میں نے اس چھوٹی سی گڑیا کو بری باتیں کہہ دیں! اور آہ! کیا اس کا نازک شیشہ دل ٹوٹ گیا!"

"ٹھیک ٹوٹ گیا؟" اُس نے اداس لہجہ میں کہا۔

"کتنا بُرا شخص ہوں میں! آہ! چھوٹا سا، ننھا سا ٹوٹا ہوا دل! اور مسٹر اوکلے! وہ کتنا اچھا ہے! ننھی سی لڑکی کو کوئی بُری بات نہیں کہتا! اچھا مسٹر اوکلے!"

وک نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کاش اگر ——"

"کیا ہوتا؟"

"اس وقت کوئی شیشہ ہوتا تو میں دیکھتی کہ تم سچ کہتے ہو یا جھوٹ!"

"تو کیا تم بدصورت نہیں ہو؟"

"نہیں میں اپنے آپ کو ایسا بدصورت نہیں سمجھتی؟"

"نہیں بلکہ بہت بدصورت!"

"اب میں جانتی ہوں!"

"کیا جانتی ہو؟"

"کہ تمہارے خیال میں وہ بھورے بالوں والی لڑکی حسین ہے!"

"بیشک وہ حسین ہے! ہر کوئی دیکھ سکتا ہے! اس کا سفید بلورین جسم اور اس میں ہلکی ہلکی سرخی جھلکتی ہوئی ——"

"مصنوعی رنگوں کی سرخی! یہ تو ہر کوئی کر سکتا ہے!"

"قدرتی ہلکا سرخ رنگ! وہ گہری نیلی آنکھیں! صفائی اور نفاست سے چسپاں! شیشے کی طرح چمکدار! اور وہ خوبصورت سنہری بال ——"

"سنہری! سنہری؟ تم انہیں سنہری کہتے ہو؟ اور تم اپنے آپ کو آرٹسٹ سمجھتے ہو! حالانکہ وہ نہایت بدنما زرد رنگ کے ہیں!"

"پکی ہوئی فصل کی طرح سنہری"

"تب تو تم نے عمر بھر پکی ہوئی فصل ہی نہیں دیکھی!"

"لیکن میں نے اس کے بال دیکھے ہیں!"

"اچھا! اگر تمہارا یہی مذاق ہے تو مبارک ہو! حالانکہ میں ہمیشہ تمہیں اعلیٰ مذاق کا آدمی خیال کرتی رہی ہوں اور تمہیں ایک حقیقی آرٹسٹ!"

"اور میں ہمیشہ تمہیں اعلیٰ مذاق کی عورت خیال کرتا اور حقیقی معنوں میں عورت سمجھتا رہا ہوں!"

"ہاں! بدصورت عورت!"

"نہیں میں اب سنجیدہ بات کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک حقیقی عورت سمجھتا رہا ہوں! اور وہ نہیں جو تم ظاہر کرنا چاہتی ہو!"

"میں کیا ظاہر کرنا چاہتی ہوں؟"

"احمق!"

"اس لفظ کو واپس لے لو!"

"جب تم اپنی حماقت کو واپس لے لوگی!"

"نہیں نہیں۔ تمہیں اس لفظ کو ضرور واپس لینا ہوگا!"

"دیک۔ لو سنو! اگر تم مسٹر او کلے سے شادی کر لو تو یہ اس لئے ہوگا کہ وہ تمہاری دیکھ بھال کر سکے! اور صرف تمہاری ایک کمزوری کیلئے دلچسپی کا سامان مہیا کرے گا! یعنی تمہاری نفیس اور عمدہ چیزوں کی محبت کیلئے! آرام۔ لذیذ کھانے تعیش اور تھیٹر کی سیر زندگی کے لئے!"

"تو پھر کیا ہوا؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں اچھی ایکٹرس ہرگز نہ بن سکونگی! میں تو صرف اس شہر میں رہنے کیلئے ایسا کر رہی ہوں کیونکہ میں گھر جانا نہیں چاہتی! میرے لئے کوئی مفید راہ عمل نہیں! اور یہ بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں محبت کر ہی نہیں سکتی! کیونکہ دو دفعہ میری منگنی ہوئی اور دونوں دفعہ ٹوٹی بھی ضرور! اور اب میں مسٹر او کلے کو پسند کرتی ہوں ـــ بس اس معاملے میں اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں!"

"اچھا اگر یہ بات ہے تو جاؤ اس سے شادی کر لو! میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں!" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سجنا! اب یہ کس لئے؟"

"آہ انجم! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!"

"اور وہ کس لئے؟"

"میں جانتی تھی تم مجھے ملامت کروگے!"

"اور ملامت کیوں نہ کروں؟"

اس نے سر جھکا کر کہا ـــ "لیکن تمہیں بھی تو مجھے بدصورت نہ کہنا چاہیئے تھا اور نہ ـــ"

"کیا؟"

اُس بھورے بالوں والی لڑکی کو خوبصورت! اور نیز———"

"اور نیز کیا؟"

"آہ! کچھ بھی نہیں! آہ! میں بہت افسردہ خاطر ہوں!" اور وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی وہ پیچھے کو ہٹ کر بیٹھ گیا۔ اور بغور اسکی طرف دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ ہنسنے لگا آہستہ ہنسی نے قہقہوں کی شکل اختیار کرلی اور پھر اک گرج معلوم ہونے لگی——— وہ آنسوؤں کی چلمن میں سے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی۔

"آخر اس میں مذاق کا کونسا پہلو ہے؟ بس تو میں جاتی ہوں! مجھے جانے دو۔ اُس سے شادی کرنے دو۔ اور خبردار پھر میرا خیال مت کرنا!"

"تو کیا تم وہی احمق لڑکی ہو جسے محبت کرنا نہیں آتا؟"

"کیا کہا؟"

"احمق! بیوقوف! نادان! لڑکی!"

"ہٹم!"

"اب کیسے ہے احمق لڑکی؟ کیا تم نہیں جانتی؟" اُس نے اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں کیا نہیں جانتی؟"

"کہ تمہارا رُواں رُواں محبت کے گیت گا رہا ہے!"

"مسٹر اوکلے کی محبت کے؟"

"نہیں میری محبت کے ہٹم کی محبت کے!"——— وہ حیرت سے دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ متغیر تھا۔

"لیکن میرا خیال تھا کہ ہم محبت کر ہی نہیں سکتے! کیونکہ ہم آرٹسٹ ہیں! تم نے خود بھی یہی کہا تھا!"

"تو تب ہم آرٹسٹ نہیں ہیں!"

"مگر نہیں میں تو تمہارے ساتھ محبت نہیں کروں گی!"——— اُس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکامیاب کوشش کی——— دوسری بیوقوف عورتیں ایسا کرتی ہیں تو تم اُن پر ہنستے ہو!"

"ہاں اُن پر ہی لیکن مسٹر اوکلے پر نہیں ہنسوں گا۔ میں اُسے راستے میں پکڑ لوں گا اُسے زمین پر پٹخ دوں گا میں اُسے قتل کردوں گا!"

"آہ! ہٹم!"——— وہ نزدیک سرک گیا اور دونوں کی نگاہیں ایک ہوگئیں———

"آہ وِک!"

آہستہ آہستہ اس کے رخساروں میں پہلی سرخی جھلکنے لگی۔ اسکی آنکھیں وفورِ مسرت سے روشن ہو کر چمکنے لگیں! اور اس کی نوخیز کلی اس کے حسین چہرے پر گلاب کے نوشگفتہ پھول کی مانند کھل کر بہار دکھانے لگی!

"آہ! ہم بھی کتنے احمق ہیں"! لڑکی نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

اور پھر دونوں کے لب باہم پیوست ہو گئے!!!

سحر نغمہ ریز تھی! درختوں پر پرندے جمع ہو رہے تھے۔ روشنی ان کے ارد گرد کھیل رہی تھی! اور سچ مچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے کا سارا شہر بیدار ہو کر مکانوں کی چھتوں پر آگیا ہے۔ کہ تازہ نکلتے ہوئے سورج کو خوش آمدید کا گیت سنائے۔

لڑکی نے دنیا کی طرف خوشی سے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور مسکرانے لگی!

"ہم یہاں طلوعِ خورشید دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے اور دیکھو۔ دیکھو سورج آسمان پر کافی بلند ہو چکا ہے"!

اس نے اُسے اپنے پہلو میں کھینچ لیا!

"میں نے اگرچہ طلوعِ خورشید کو بھی دیکھا ہے لیکن میں تو تمہارے چہرے کو دیکھنے میں مصروف تھا"!

اُس نے محبت بھری لرزساز آواز میں کہا۔

اک جلد گذر جانے والا سایہ اک لمحہ کے لئے اس کے چہرہ پر سے گذرتا ہوا معلوم ہوا۔

"ایک بدصورت چہرہ ٹم!" اس نے خاموشی میں کہا۔

"نہیں ہیلن کے چہرے جیسا حسین"!

سایہ فی الفور گذر گیا۔ اُس کی روح کے گوشہ گوشہ میں بہار نغمہ زن تھی۔ اور لطیف تاثرات نے اس کے رخساروں کو رنگین بنا دیا۔ سورج اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ اور اس کے بہانے ترکو منور کر رہا تھا۔ اس نے ایک قابلِ محبت لطیف اشارہ سے اپنی دو انگلیاں اپنے مُنہ تک اٹھائیں۔ اور اپنا سر تھوڑا سا جھکا کر اُسے پیار کا پیغام دیا!

"اب اس کے بعد ——— اس کے بعد (ہکلاتے ہوئے) میں تمہیں وِکی کہا کروں گی!

"وہ کیوں بھولی لڑکی؟"

کیونکہ یہ وک (Vic) کے بعد ٹم (tim) سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے! یعنی (Victim) بمعنی فتح۔

ترجمہ (محمد نواز خان)

محفل ادب

خودکشی کرنے والے شاعر کی وصیت

ٹامس چیٹرٹن ۱۷۵۲ء میں انگلستان کے شہر برسٹل میں پیدا ہوا۔ وہ فطری شاعر تھا اور کم سنی ہی میں علوم و فن کے ساتھ شاعری میں کامل ہوگیا۔ علم و ادب کی خدمت کا زبردست جذبہ رکھتا تھا۔ اسی غرض سے لندن پہنچا مگر اس نئے زمانے نے قدر نہ کی اور فاقے کرنے لگا۔ آخر تنگ آکر ۱۷۷۰ء میں زہر کھا کر جان دیدی۔ مگر مرنے سے پہلے ایک نظم لکھ گیا جو نہایت مشہور ہوئی کیونکہ بہترین نمونہ ہے۔ اُس کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

تمہید

میں شہر برسٹل کا ٹامس چیٹرٹن ہوں یہ میری آخری وصیت ہے جسے اس حال میں لکھ رہا ہوں کہ میرا جسم تندرست اور عقل درست ہے میرے جسم کی تندرستی اُس ڈاکٹر کی غلطی کا نتیجہ ہے جس نے آخری بیماری میں میرا علاج کیا تھا۔ رہ گئی میری عقل تو اُس کا معاملہ میں خود عدالت کے سپرد کرتا ہوں مگر اتنا ظاہر کردینا ضروری ہے کہ برسٹل کے تمام بندگانِ دین اور اکابر ملت مجھے "بالکل مجنوں" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر میرے اس آخری عمل (خودکشی) کو بھی جنون قرار دے دیا گیا تو بزرگوں کے بخشے ہوئے خطاب کے عین مطابق ہوگا۔

(۱)

کل رات آٹھ بجے سے پہلے میں مرچکا ہوں گا۔ اگر عدالت کا فیصلہ یہ ٹھہرے کہ میں نے حالت جنون میں جان دی ہے تو برسٹل کے پادری صاحب کے نام میری وصیت یہ ہے کہ اپنے خرچ سے میری لاش برسٹل لیجائیں اور میرے خاندانی مقبرے میں مجھے دفن کریں میری قبر پکی بنائیں اور تعویذ پر یہ کتبہ لگائیں۔

"اے وہ جو اس قبر کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ذرا ٹھہر اور چیٹرٹن کے لئے دعا کرتا جا۔

اے لوگو چیٹرٹن کی روح کیلئے دعا مانگو اور مناجات کرو۔ خدا آسمان پر اُس سے وہ برتاؤ نہ کرے جو خدا کے بندوں نے زمین پر اس سے کیا!

"یہاں وہ سورہا ہے جس کے باپ نے شہر کا کلیسا بنایا تھا اور جس کے بزرگ ۱۱۴۰ء سے سنٹ میری کے کلیسا میں دفن ہوتے آئے ہیں!

"اور قبر کو دیکھنے والے اپنے فیصلہ میں جلدی نہ کر۔ اللہ کا فیصلہ تیرے فیصلے سے زیادہ منصفانہ ہے۔ قبر میں سونے والا اللہ کے سامنے حاضر ہے اور تیرے فیصلے سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

لیکن اگر میری توقع کے موجب برسٹل کے پادری صاحب اپنے آپ کو اخیس ثابت کریں اور میری لاش لے جانے سے انکار کریں تو کارِ خیر انجام دینے والی کوئی انجمن مجھے مذکورہ بالا قبرستان میں دفن کر کے اسی طرح کی قبر بنا دے اور اسی طرح کا کتبہ لگا دے۔

لیکن اگر میری توقع کے خلاف پادری صاحب میری وصیت پر عمل کریں تو میرے دوسرے درجہ کے اشعار کا دیوان مرتب کر کے انہیں ہدیہ کر دیا جائے اور دیوان کی جلد پر عبارت لکھی جائے "برسٹل کے محترم پادری صاحب کے حضور شاعر کا حقیر ہدیہ بہ کمال خشوع خضوع کے ساتھ!"

(۲)

میں اپنی جوانی کی تمام قوت و حرارت برسٹل کے مقدس آب لاٹ پادری صاحب کیلئے چھوڑتا ہوں کہ انہیں جوانی کی اس قوت و حرارت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

(۳)

اپنا تقویٰ و طہارت بھی مقدس آب لاٹ پادری صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں اور اپنی ثروت دنیا کا آدھا حصہ اپنی کتابوں کے پبلشر مسٹر بروتم کے لئے اور باقی نصف ہر اس خاتون کے لئے چھوڑتا ہوں جسے خدا نے اس نعمت سے محروم پیدا کیا ہے۔

(۴)

اپنے ایثار و قربانی کا وارث میں اپنے محبوب وطن شہر برسٹل کو قرار دیتا ہوں جس کے بازاروں میں ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ جنس گراں کبھی پہنچی ہی نہیں!

(۵)

میں اپنی ایمانداری کلیسا کے خزانچی صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اور اُنکے خدمتگار کو یہ حق بخشتا ہوں کہ جب جب وہ اونگھیں اُن کی مقدس کھوپڑی پر زور سے چپت رسید کر کے انہیں بیدار کر دیا کرے۔

(۶)

میں اپنی قوتِ گویائی کلیسا کے واعظ صاحب کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ جنت و دوزخ کے افسانے سنانے کے بجائے مومنوں کو مفید باتیں سنایا کریں!

(۷)

اور اپنی عقل و دانش کلیسا کے امام کے لئے چھوڑتا ہوں تاکہ وہ کتابِ مقدس کی جب تفسیر کریں تو مجھ سے کام لیا کریں اور کھوکھلی باتیں کہنے سے بچ جائیں! اے کاش اس بے مغز پادری کو معلوم ہو جائے کہ مجھے اُس سے کتنی نفرت ہے۔

(۸)

میں اپنی انصاف پسندی ملک کے حاکموں کیلئے چھوڑتا ہوں۔ اپنی سیر چشمی و بردباری شہر برسٹل کے کوتوال کیلئے اور اپنی قناعت و شرافت پولیس افسروں کے لئے کہ ان سب معزز حضرات کو ان تمام چیزوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

(۹)

شہر برسٹل کی تمام حسینوں کیلئے اپنے جملہ عشقیہ مضامین اور خطوط چھوڑے جاتا ہوں۔ وہ یقین کریں کہ ان مضامین اور خطوط

سے فائدہ اٹھانے کی صورت میں میری روح بھوت بن کر انہیں چمٹے گی نہیں کیونکہ میں نے انکی بیہودہ محبت میں جان نہیں دی ہے۔

(۱۰)

میں اپنا تمام قرض جو صرف ۵ پونڈ ہے کار خیر انجام دینے والی انجمنوں پر چھوڑے جاتا ہوں۔ ان کے ممبروں میں سے جو شخص بھی یہ قرض ادا کرنے کی مخالفت کرے گا۔ اُسے شہر کی خیرات جمع کرنے پر مقرر کر دیا جائے گا۔

(۱۱)

میں اپنی ماں اور بہن کو اپنے دوستوں کے ذمہ چھوڑے جاتا ہوں۔ اگر واقعی اس دنیا میں کہیں میرے دوست موجود ہوں۔

"بعد"

زندگی

کیا کیا فریب دے کے ستاتی ہے زندگی
ہر دم ہنسا ہنسا کے رلاتی ہے زندگی
بیزار کیسے کوئی بھلا اس سے ہو سکے
انسان کو سو طرح سے لُبھاتی ہے زندگی
روٹھے جو ایک دفعہ دل اس سے تو لاکھ بار
دے کر فریب اس کو مناتی ہے زندگی
آئے جو کوئی پاس تو کہتی ہے "دور ہو"
اور دور ہو تو پاس بلاتی ہے زندگی
ہنستا کسی کو پا کے رُلاتی ہے اشکِ خوں
روئے کوئی تو اس کو ہنساتی ہے زندگی
امیدوار دل ہو تو یہ توڑتی ہے آس
مایوس ہو تو آس بندھاتی ہے زندگی
کوئی ڈرائے اس کو تو ڈرتی ہے اس سے یہ
کوئی ڈرے تو اور ڈراتی ہے زندگی
حاوی اگر ہو کوئی تو رہتی ہے یہ دبی
اور جو دبے تو اس کو دباتی ہے زندگی
گرتا ہے خود ہی طائرِ دل آ کے سر کے بل
رنگین دام ایسا لگاتی ہے زندگی
گر کوئی ہوشیار نہ ہوتا ہو یوں شکار
حرص و ہوس کا جال بچھاتی ہے زندگی

اک عمر ڈھونڈنے پہ بھی جن کی ملے نہ چھاؤں
کچھ ایسے سبز باغ دکھاتی ہے زندگی
پھر کر کے غم سے جان کی بنیاد کھوکھلی
گھُن کی طرح سے جسم کو کھاتی ہے زندگی
جب تک ہے سانس جسم میں ہے چھوٹنا محال
پنجے میں اپنے ایسا دباتی ہے زندگی
پورے کسی کے کرتی ہے لاکھوں تو بیشمار
ارمان خاک میں بھی ملاتی ہے زندگی
بے بال و پر کو قوتِ پرواز بخش کر
رفعت پہ آسمان کی بٹھاتی ہے زندگی
جو خاک پر ہیں اُن کو تو دیتی ہے اوجِ عرش
جو عرش پر ہیں اُن کو گراتی ہے زندگی
اہلِ ہوس کو تختِ جواہر نگار پر
کچھ دن بٹھا کے عیش کراتی ہے زندگی
پھر ایک دن گھسیٹ کے اُن کو کشاں کشاں
فرشِ زمین پہ لا کے سلاتی ہے زندگی
لاکھوں ہی گھر مٹا کے بساتی ہے ایک گھر
سو جان لے کے ایک بچاتی ہے زندگی
کتنوں کا خون چوس کے ملتی ہے ایک جان
حیرت ہے زندگی کو کھاتی ہے زندگی

نیکی کسی کی ہو تو اُسے خاص طور پر
اک راز کی طرح سے چھپاتی ہے زندگی
اور ہو کہیں جو کوئی بُرائی تو دیکھئے
عالم میں ایک شور مچاتی ہے زندگی
ظالم ہے کس طرح سے سروں پر یہ آسماں
منظر تو رات دن یہ دکھاتی ہے زندگی

مجبور کو یہ ڈر ہے طبقۂ عالم الٹ نہ جائے
دنیا سے ذکر خیر مٹاتی ہے زندگی
مکار و حیلہ ساز سیہ کار و خود غرض
شیطان آدمی کو بناتی ہے زندگی
انسان عجیب ہے طفلک نادان جیسے طبل
جس راہ چاہتی ہے چلاتی ہے زندگی

"انور"

کیا تو جا رہی ہے؟

ابھی آئی ہے۔ ابھی جا رہی ہے؟
میں نہ مانوں گا۔ تیری جدائی مجھے مار ڈالے گی!
میں تیرے بغیر جی نہیں سکتا!
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کہہ دے نہیں!
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے جس نے تیرے لئے لمبی راتیں
آنکھوں میں کاٹی ہیں؟
کیا تو اُسے چھوڑے جاتی ہے جس نے تیری یاد میں
خون کے آنسو روئے ہیں؟

کیا تو اسے چھوڑے جاتی ہے جس نے اپنا دل تیرے قدموں
پر رکھ دیا ہے؟
کیا تو جا رہی ہے؟
خدا کے لئے کہہ دے نہیں!
کیا تیرے سینے میں دل نہیں پتھر ہے؟
کیا تیرا دل ترس کھانا نہیں چاہتا؟
کیا تیری آنکھوں میں مروت نہیں؟
کیا واقعی تو جا رہی ہے۔
ہاں ہاں، تو جا رہی ہے — خدا تجھے سمجھے۔

"ادبی دنیا"

میرا دل

میرا دل اس بھوکی چڑیا کی طرح بیقرار ہے جو دانہ ڈھونڈتی پھرتی ہے اور نہیں پاتی
میرا دل اس پرندے کی طرح ہے جو گھونسلا لوٹتا ہے اور اپنا
آشیانہ پانی میں ڈوبا ہوا پاتا ہے۔
میرا دل سیب کا درخت ہے۔ جسے پالا مار گیا۔
میرا دل سیپ ہے جس سے موتی نکال لیا گیا ہے۔
میرا دل سب سے جدا ہے۔

آسمان سے بھی اور عرش الٰہی سے بھی۔
مگر یہ آباد دنیا۔ آج اجاڑ ہے
اس کے کھنڈروں میں اُلّو بول رہے ہیں۔
کیونکہ وہ چلی گئی ہے۔
خدا اس سنگ دل کو سمجھے۔

[illegible]

طلسم زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن مدیر ہمایوں کی تازہ تصنیف کے متعلق اہل ملک کی رائیں

میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا صدر بلدیہ لاہور

طلسم زندگی کے ملتے ہی جلد اور چھپائی کی خوبصورتی کو دیکھ کر جب فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو دل نے چاہا کہ اس کتاب کو بغیر پڑھے اور ختم کئے چھوڑا جائے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کتاب کو اپنی میز پر رکھ لیا ہے۔ تاکہ وقتاً فوقتاً اس کے کسی نہ کسی مضمون کو دوبارہ سہ بارہ بلکہ متواتر پڑھا جائے۔ یہ ایک خوب صورت چھوٹے چھوٹے مگر قیمتی موتیوں کی لڑی ہے۔ آپ نے صرف زر کثیر سے اس کو مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اور حضرت ہمایوں مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ خدا آپ کو اس کا صلہ بخشے۔

میر سعادت حسین صاحب نجیب ہنکندہ حیدرآباد دکن

طلسم زندگی" آرائش ظاہری کے باعث بے حد نظر افروز اور حسن معنوی کی وجہ سے نہایت روح افزا ہے۔ کتاب کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور جی باغ باغ ہو گیا۔

چودھری محمد ضیاء الدین صاحب شمسی جرنلسٹ

میں مفصل ریویو تو ساری کتاب پڑھ کر ہی لکھوں گا لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرقع چغتائی کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جو اس شان کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اسے دیکھ کر میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک زندہ مصنف کی زندہ زبان میں زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔ کتابت طباعت۔ تصاویر۔ جلد ہر چیز نظر فریب اور دیدہ زیب ہے۔ اور آپ کے حسن مذاق کی شاہد۔

کاش آپ کا انداز تحریر میرے مقدر میں ہوتا۔

قیمت ——— پانچ روپے ——— علاوہ محصول ڈاک

پتہ: سید عبداللطیف۔ دفتر رسالہ ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور۔

دنیائے ادب میں ایک حسین اضافہ
رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور
کا
فسانہ نمبر
اس طرح کا حسن ہو ایسا جمال ہو
آج ہی اس کے لئے خط لکھئے

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمٹیڈ لاہور

ہندوستان کے مسلمانوں کی پستی کا راز یہ ہے کہ ان کے پاس منظم سرمائے کا کوئی انتظام نہیں ہے وہ تجارت نہیں کر سکتے۔ کاروبار میں صنعت و حرفت میں دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ نمائشی رسوم میں روپیہ برباد کر دیتے ہیں اور اپنے بال بچوں کو ناداری و افلاس کے حوالے کر دیتے ہیں ان مصیبتوں کو رفع کرنے کے لئے ایک خالص اسلامی بیمہ کمپنی قائم کی گئی ہے۔

بورڈ آف ڈائریکٹرز

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور (چیئرمین)

خان بہادر نواب محمد حیات قریشی سی آئی ای ایم ایل سی۔ سرگودھا

میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا۔ پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی لاہور

بیگم شاہ نواز صاحبہ راؤنڈ ٹیبلر۔ اقبال منزل لاہور

خان بہادر تاج محمد خان۔ او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ ایل۔ سی خان آف بدریشی نوشہرہ۔

سید امجد علی بی۔ اے۔ آنرز (میسرز اے۔ اینڈ۔ ایم وزیر علی اینڈ سنز۔ آشیانہ لاہور۔

شیخ محمد اسمٰعیل آف میسرز محمد اسمٰعیل اینڈ مولا بخش مل اونرز لائل پور

میاں عبدالحی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ لاہور۔

ڈاکٹر سید محمد شریف متقی ۲۲۔ مزنگ روڈ لاہور (مینیجنگ ڈائرکٹر)

سمجھدار۔ دیانت دار اور محنتی نوجوانوں کی ضرورت ہے

جن کو معقول کمیشن پر ایجنسی دی جائیگی

علاوہ ازیں تجربہ کار اور انشورنس کے کام میں ماہر اصحاب کو حسب لیاقت تنخواہ دار عہدہ بھی مل سکتا ہے

جملہ حالات معلوم کرنے کے لئے ہیڈ آفس لاہور سے خط و کتابت کریں

مسلم انڈیا انشورنس کمپنی لمٹیڈ ۲۲ مزنگ لاہور

کیونکہ

اس کے علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کو ملک بھر کے مستند اہل قلم نے ترتیب دیا ہے۔
اس کے افسانوں کو ہندوستان اور بیرون ہند کے معاشرت و تمدن اور مشرق و مغرب کی فطرت کے ماہروں نے لکھا ہے۔
اس کی نظموں کو اردو کے نغز گو شعراء نے خاص فکر اور کاوش سے کہا ہے۔ اور
اس کی تصویروں کو دنیا بھر کے حسن کاروں کے شاہ پاروں میں سے انتخاب کیا گیا ہے۔
ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایسا ضخیم، متنوع اور حسین مجموعہ اس سے پہلے آپ کی نظر سے نہ گزرا ہوگا۔

یہ پرچہ محدود تعداد میں چھپ رہا ہے اس لئے اپنی اور اپنے دوستوں کی درخواستیں درج رجسٹر کرا لیجئے
بڑے سائز کے ۲۵۰ صفحات ۲۰ درجن سہ رنگ و یک رنگ تصاویر شان دار ہفت رنگ سرورق قیمت صرف عہ

منیجر "ادبی دنیا" لاہور

عجیب و غریب چیزیں

کوی ونود وئید بھوشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وئید کی طبی واقفیت کا سارے ہندوستان میں شہرہ ہے آپ کی ایجاد "امرت دھارا" نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ آپ تین طبی اخباروں کے ایڈیٹر۔ اور تقریباً چھ درجن طبی کتب کے مصنف ہیں۔ امرت دھارا کے علاوہ باقی ہر قسم کی ادویات بھی تیار رہتی ہیں نیچے ہم پنڈت جی کی چند عجیب ایجادوں کا ذکر کرتے ہیں۔ سب دنیا کو حیرت میں ڈالنے والی ہیں مگر سب لفظ بہ لفظ ٹھیک ہیں!

ادویات متعلقہ خوبصورتی

مکھ رعنت (رجسٹرڈ) یعنی مونچھیں بڑھانے کا تیل۔ یہ تیل نہ صرف مونچھوں کو بلکہ ہر جگہ کے بالوں کو بھی بڑھاتا اور ان کی سیاہی کو قائم رکھتا ہے قیمت فی شیشی ۲ انس عہ نمونہ ۸ر

ابٹن (قیمت مونہی) (رجسٹرڈ) چہرے کے بدنما داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو کر چہرہ صاف ہو جاتا ہے اور جھریاں نہیں پڑتیں قیمت ایک روپیہ نمونہ ۴ر

دِل سندری (حسن افزا) یہ تیل ہے جو چہرے کو چمکاتا اور داغ کیل دور کرتا ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ نمونہ ۴ر

بال اڑانے کی بینظیر دوا اس دوا کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر سخت سے سخت اور نرم سے نرم جگہ کے بال صفائی سے اڑ جاتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۱ر نمونہ ۱ر

مصالحہ پان ایک چٹکی پان پر رکھ دیجئے۔ پان تیار ہے۔ ویسا ہی رنگ ویسا ہی مزا۔ اس کے علاوہ بدبوئے دہن کو دور کرے گا۔ قیمت ایک روپیہ نمونہ ۲ر

منجن دانتوں کے جملہ امراض کو دور کرتا اور بدبوئے دہن کو رفع کرتا ہے قیمت ۴ر نمونہ ۱ر

پران سکھ (رجسٹرڈ) چھاتیوں کو ڈھلکنے سے بچاتا اور ڈھلکے ہوئے ہوں تو ان کو بھی اصلی حالت پر لے آتا ہے قیمت سالم چار روپے (للعہ) نمونہ ایک روپیہ (عہ)

عورتوں بچوں کے واسطے

میٹھا پھل عجیب دوا۔ حمل کے ۲ ماہ بعد تیسرے ماہ کے شروع میں ایک دن دودھ سے کھلائی جاتی ہے بس لڑکا ہی پیدا ہوگا عجیب بات جان کر بعض لوگ شک کرتے ہیں اس لئے اقرار نامہ ساتھ ہے کہ لڑکی پیدا ہو تو قیمت واپس کر دی جائے گی قیمت صرف عہ ر

ابلا رام ایام کی زیادتی کی بیماری کسی قسم کی اور کسی درجے میں ہو اس سے آرام آجاتا ہے۔ قیمت دو روپے نمونہ ۴ر

پتالی کمی حیض کے واسطے خواہ کسی وجہ سے ہو اکسیر ہے۔ قیمت دو روپے نمونہ ۸ر

سوماوتی عورتوں کے مشہور مرض۔ اور رطوبت وغیرہ کے لئے اکسیر دوا ہے۔ قیمت دو روپے نمونہ ۱۲ر

گود بھری جن کے اولاد نہیں ہوتی ان کی دو یا تین ماہ کے اندر اندر گود ہری بھری ہو جاتی ہے قیمت پانچ روپے۔

پھولو پھلو یہ سوکھا بسان کی دوا ہے جب بچہ سوکھتا جاتا ہے۔ اس دوا کو کر پر ملا جاتا ہے تو باریک کیڑے نکلتے ہیں اور بچہ تر و تازہ ہو جاتا ہے قیمت امرائے سے سو روپے عوام سے پانچ روپے۔ غریبوں سے ایک روپیہ

بال سکھ بچوں کے امراض۔ بدہضمی۔ قبض۔ دست۔ کھانسی۔ بخار وغیرہ کے واسطے قیمت عہ نمونہ ۲ر

کالی دور کالی کھانسی کی دوا۔ ۱۶ گولی۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر)

خط و کتابت و تار کا پتہ:- **امرت دھارا ۱۳۸ لاہور**

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸- جواب طلب امُور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

Title Printed at the Halftone Press Lahore.